ماہنامہ
تجلّی
دیوبند
خدا سے ڈرو
سرے خوف سے نجات مل جائیگی
ایڈیٹر: حسن احمد
(فاضل دیوبند)
تاریکیوں میں ایک چراغ
2/50

تجلی دیوبند
۳
رجسٹرڈ
تجلی
27(2-3) 1975
27(1,4-12) تا ہیں

دستک

(مستقل)

مولانا عامر عثمانی

ایک پائیدار، سربفلک اور عالی شان عمارت اسی وقت بن سکتی ہے جب مہارت کاریگر دل سے اس میں استعمال کئے جانے والے تمام ساز و سامان پر پوری پوری توجہ دی ہو۔ لوہا، اینٹیں، مسالے بہتر مٹی سے بنائے گئے ہوں۔

اسی طرح معاشرے کو بھی ایک عمارت سمجھئے۔ چند افراد مل کر ایک گھرانہ بناتے ہیں اور چند گھرانوں کے مجموعہ سے خاندان بنتا ہے۔ پھر متعدد خاندانوں کا مجموعہ ایک گاؤں، ایک قصبہ یا شہر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور بہت سے شہر مل کر ملک کا نام پاتے ہیں۔ پورے معاشرے کے سدھار یا بگاڑ کا مدار اُن اکائیوں اور یونٹوں کے اوصاف و احوال پر ہے جن کے مجموعے سے یہ معاشرہ بنا ہے اگر ایک ہی خاندان کے افراد باہم دگر اخوت و مودت کے تعلقات نہیں رکھ سکتے اگر ایک ہی گھرانے کے افراد بجائے حسنِ سلوک کے آپس میں بدسلوکی اور کدورت و نفرت کی روش اختیار کرتے ہیں تو لازمی بات ہے کہ اُن بدگہر اور بدکردار افراد کے مجموعے سے جو معاشرہ بنے گا وہ فاسد و کاسد ہوگا لیکن یہی افراد اگر باہم دگر ہمدردی و غمگساری کے تعلقات رکھتے ہیں تو ان کے مجموعے سے ظہور پانے والے خاندان اور کنبے ایسا ہی معاشرہ تخلیق کریں گے جس میں امن و محبت اور اخوت و دوستداری کے اثرات غالب ہوں۔

تجلی۔ اپریل سنہ ۶۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ستائیسویں سال کا

دوسرا شمارہ

ماہنامہ تجلی دیوبند

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کینیڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا بذریعہ ہوائی ڈاک ... یا بذریعہ بحری ڈاک ... روپے

بحرین۔ ابوظہبی۔ سعودی عرب۔ قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ... روپے

دس شلنگ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ

سالانہ ــــ بیس روپے

فی کاپی

ڈھائی روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی۔ پی کی اجازت دیں آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی۔ پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا ــــ

منی آرڈر بھیجکر آپ وی۔ پی خرچ سے بچ جائیں گے

فہرست

ایڈیٹر:۔ حسن احمد صدیقی

نوحۂ طرب

گذشتہ ادوار میں عید کی خوشی اس لئے منائی جاتی تھی کہ حق تعالیٰ نے تمام رمضان نماز، روزے، زکوٰۃ وخیرات، ذکر وتلاوت، تسبیح وتہلیل، تراویح وشب بیداری اور دوسری بہت سی عبادات کی توفیق کا مرعطا فرمائی نیز گناہوں، سرکشیوں اور افعال بد سے محفوظ رکھا۔

عید کے دن نئے نئے کپڑے بدل کر مسلمان عیدگاہ کے کھلے میدان میں اپنے اس پروردگار کا شکر ادا کرتے تھے جس کے توفیق دیئے بغیر کوئی شخص رمضان کا روزہ نہیں رکھ سکتا۔ ایک سجدہ نہیں کر سکتا۔ کسی گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ وہ شکریہ ادا کرتے تھے اس بات کا کہ ان کے مالک نے کامل ایک مہینہ تک نفیس تقوی پرہیزگاری کے ساتھ زندگی گذارنے کی توفیق اور طاقت عطا فرمائی۔

مسلمان ایک دوسرے کو بھی مبارکباد پیش کرتے تھے اس لئے کہ نیکی کا ارتکاب باعث مبارکباد اور بدی کا صدور باعث پھٹکار ہوا کرتا ہے۔ وہ خوشی مناتے تھے کہ حق تعالیٰ کا کرم ہے اس نے ہم سے رمضان بھر اچھے اچھے اور قابل مبارکباد کام کرائے۔ گناہوں سے بچایا۔ الطاعت کی توفیق دی۔

لیکن ـــــ قابل افسوس بات یہ ہے کہ آج رمضان المبارک میں بھی ہم صرف عبادات سے ہی گریزاں نظر نہیں آتے بلکہ ہمہ وقت ان افعال کی طرف مائل اور راغب رہتے ہیں جن کی قباحت ظاہر دیا ہر ہے اور جو حق تعالیٰ کی خفگی اور ناراضگی کا موجب بنتے ہیں۔

جھوٹ، الزام تراشی، غیبت، فریب، عیاشی مکاری، فتنہ پروری، بغض وحسد، بددیانتی و بدمعاملگی آخر ایسا کونسا گناہ ہے کہ رمضان المبارک میں جس کا ہم سے صدور نہیں ہوتا۔

ان حالات میں عید کے دن خوشی منانا اور ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرنا چہ معنی دارد؟ ہمیں تو اپنی خدا بیزاری اور نفس پرستی پر باقاعدہ ماتم کرنا چاہئے۔ ایک دوسرے پر ملامت و پھٹکار بھیجنی چاہئے۔ اس لئے کہ ہمارے اعمال و افعال قابل تحسین و مبارکباد نہیں بلکہ قابلِ ملامت اور قابلِ پھٹکار رہیں۔

لیکن ـــــ ان تلخ حقائق اور لائق ماتم حالات کے باوجود دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو آنے والی عید مبارک ہو! ـ

احوالِ واقعی

جولائی و اگست کا شمارہ کافی تاخیر سے چھپا۔ ہر روز قارئین کے شکایت بھرے خطوط موصول ہوتے رہے۔ بعض قارئین نے تو یہ تک تحریر فرمایا کہ آیا آپ لوگ زندہ بھی ہیں یا فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ اس طرح کے جملے غیر معمولی قسم کی تلخی اور کڑواہٹ لئے ہوئے تھے۔ لیکن انھیں پڑھ کر ہمیں تکلیف نہیں پہنچی بلکہ ایک گونہ خوشی کا احساس ہوا۔

دراصل ہم جانتے ہیں کہ اس شکوہ و شکایت، غم و غصہ، جھلاہٹ اور زود رنجی کے پیچھے وہ چیز جلوہ گر ہے جسے مقبولیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

جی ہاں! ——— خدا کا فضل و کرم ہے کہ تجلی آج بھی مقبول و محبوب ہے۔ اس کا انتظار آج بھی اسی شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جس شدت کے ساتھ مولانا مرحوم کے زمانہ میں کیا جاتا تھا۔ جن کی تحریری خوبیوں کا عشرِ عشیر بھی ہمیں نصیب نہیں۔

قارئین کی لمبی چوڑی شکایتیں اور تیز و تند فقرے اس بات کی سند ہیں کہ وہ تجلی کا انتظار انتہائی شوق اور بیتابی کے ساتھ کرتے ہیں۔ جب تجلی انھیں وقت پر نہیں مل پاتا تو وہ انتظار کی شدت سے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں اور اس حالت اضطراب میں وہ ایڈیٹر تجلی کو جتنی بھی سلواتیں سنائیں کم ہی کم ہیں۔

جن قارئین نے ہماری مجبوریوں کو سمجھا اور شکوہ و شکایات کے بم نہیں برسائے ان کا دلی شکریہ۔ اور جن قارئین نے نہ ہماری مجبوریوں کا خیال کیا اور نہ ہی ضبط و تحمل سے کام لیا ان کا ڈبل شکریہ اس لئے کہ ان کے تلخ اور کڑوے الفاظ کی گہرائی میں وہ مٹھاس پنہاں تھا جو محبت اور مقبولیت کی قبر ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور انھیں پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ ہماری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ وہ مقبول ہیں اور باقاعدگی کے ساتھ ان کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اگر انھیں مقبولیت حاصل نہ ہوتی تو ان کا انتظار نہ ہوتا اور نہ انتظار کے بعد کو فت جنم لیتی۔ نہ قارئین غلط انداز میں لب کشائی کرنے پر مجبور ہوتے۔ اللہ تعالیٰ دونوں قسم کے قارئین کو دونوں جہان میں جزائے خیر عطا فرمائے۔

خواہش تھی کہ ستمبر کا شمارہ ستمبر کے وسط تک پوسٹ ہو جائے لیکن ان دنوں بجلی پوری ہما ہمی کے ساتھ جفاؤں کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ وہ کسی عارضی بہار کی طرح آتی ہے اور چند ساعتوں کے بعد کسی اکھڑ دماغ محبوب کی طرح تو دو گیارہ ہو جاتی ہے اور ہم حسرت و یاس کے ساتھ کفِ افسوس ملتے ہوئے یہ کہنے پر اکتفا کر لیتے ہیں:—

زندگی میں دو ہی گھڑیاں ہم پہ گذری ہیں کٹھن
اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

قارئین یقین کریں کہ ستمبر کا شمارہ اگست کے اواخر میں ہی مرتب ہو چکا تھا لیکن بجلی کی کرم فرمائیوں نے اسے لیٹ کردیا۔ اب دیکھئے یہ شمارہ کب تک ریلیز ہو سکے گا۔ اور اس عرصہ میں کتنے ہی ایسے شکایت بھرے مکتوب پڑھنے کو ملیں گے جن کا لفظ لفظ اپنے اندر اپنائیت و یگانگت کی خوشبو لئے ہوئے ہوگا۔

پچھلے شمارہ میں تفہیم الحدیث اور عامر عثمانیؒ نمبر کی جھلکیاں پیش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن صفحات کی قلت کی وجہ سے یہ دونوں چیزیں شاملِ اشاعت نہ کی جا سکیں۔ قارئین سے معافی کے طلب گار ہیں۔

اگلے شمارہ میں مولانا عامر عثمانیؒ کی غیر مطبوعہ تحریر بھی ملاحظہ فرمائیے ——— لیکن یہ واضح رہے کہ اگلا شمارہ صرف اکتوبر کا نہیں بلکہ اکتوبر و نومبر کا مشترکہ شمارہ ہوگا ——— خدا حافظ۔

حسن احمد صدیقی

ابھی حال ہی میں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے "انکشافِ حقیقت"۔

آج کی صحبت میں اسی پر گفتگو کرنے کو دل چاہتا ہے۔ دل کیا چاہتا ہے یہ سمجھیے کہ اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ضرورت محسوس نہ ہوتی تو یہ موضوع قطعاً اس قابل نہیں تھا کہ اس پر خامہ فرسائی کی جائے۔

اس پمفلٹ پر تنقید و تعریض کرنے کا ارادہ نہیں بلکہ اُن گوشوں کو اُجاگر کرنے کی خواہش ہے جو پمفلٹ نگار کی نگاہوں سے چوک گئے یا جنھیں دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا گیا ہے۔

یہ پمفلٹ دارالعُلوم دیوبند کے اہتمام کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ اس کی پیشانی پر کسی صاحبِ قلم کا نام موجود نہیں ہے لیکن یہ بات تو ظاہر و باہر ہے کہ اس کو مرتّب کرنے والا کوئی ابن آدم ہی ہے۔ اہتمام کے در و دیوار نے تو اسے قلم بند نہیں کیا ہوگا۔ اور ابن آدم کوئی بھی ہو، کسی بھی صوبہ و نسل سے متعلق ہو، کسی بھی ادارہ کی گود میں پرورش پا رہا ہو اس سے دونوں ہی قسم کی غلطیاں متوقع ہیں۔ وہ غلطیاں بھی جو سہواً سرزد ہو جایا کرتی ہیں اور وہ غلطیاں بھی جنھیں دانستہ اور باقاعدہ وجود بخشا جاتا ہے۔

پمفلٹ کی وجہ تخلیق جاننے کے لئے قارئین کو تھوڑی سی تفصیل گوش گذار کرنی پڑے گی۔

پچھلے دنوں طلبائے دارالعلوم اور باشندگانِ دیوبند کے مابین زبردست قسم کا افتراق و نزاع واقع ہو گیا تھا۔ تکرار اور لڑائی الفاظ کے پتھر پھینکنے تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ ہاتھا پائی۔ کھینچ تان اور مار پٹائی تک نوبت آئی۔ کئی بار رفع بدین ہوا۔ کئی بار مار دھاڑ کے مناظر ظہور میں آئے۔

یہ تکرار اور فساد وقتی طور پر ختم ہو گیا تھا لیکن ان کے اثرات اور مظاہر سلسلہ در سلسلہ چلتے ہی رہے۔ بعدہٗ کئی جھڑپیں دارالعلوم کے صحن میں بھی رونما ہوئیں جو پہلے ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ لیجئے اس جھگڑے کا پس منظر بھی ملاحظہ فرمالیجئے جو سب سے پہلے وقوع پذیر ہوا تھا اور جو مادرِ علمی کے چہرے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس جھگڑے میں شر پسند طلبا نے جن حرکات کا مظاہرہ کیا تھا

ان کی توقع کسی علیم اور سنجیدہ طبقہ سے نہیں کی جاسکتی۔

اولاد کے قبیح اور مذموم افعال کی بنا پر اگر بدنامی اور رسوائی کا کچھ نہ کچھ حصہ والدین کو بھی پہنچتا ہے تو طالب علموں کی نازیبا اور نامحمود حرکات اس ادارہ کے حق میں باعث رسوائی کیوں نہیں ثابت ہوں گی جو حقیقی نہ سہی لیکن بلاشبہ معنوی باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔

عوام تو کالانعام ہوتے ہیں ان کی کسی بھی حرکت اور روش پر کوئی واویلا اور افسوس نہیں۔ تکلیف ہمیں ان طلباء کی اچھل کود سے پہنچی تھی جو مادر علمی کی آغوش میں پرورش پارہے ہیں۔ قال اللہ اور قال الرسول کی فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں اور جو مستقبل میں رہنمائے ملت بننے کا جذبہ دل میں جمائے ہوئے ہیں۔

پمفلٹ نگار کے الفاظ میں جھگڑے کی ابتدائی نوعیت و کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

بہرحال واقعہ اس طرح پیش آیا کہ مولانا سعید صاحب پالن پوری کے رہائشی مکان میں بقول ان کے کچھ چیزیں چوری ہوگئیں۔ اس چوری کا شبہ مولانا موصوف کو محلہ کے ایک بچہ پر ہوا۔ اور مولانا نے از خود اس بچہ سے دریافت حقیقت کے لئے اقدام کیا اور بچہ کو اس بیدردی سے پیٹا گیا جسے دیکھ کر ہر دیکھنے والا حیران و ششدر رہ گیا۔ مولانا موصوف کو چاہئے تھا کہ اس معاملہ میں براہ راست اقدام کرنے کے بجائے دارالعلوم کو اطلاع دیتے یا شہری پولیس کو۔ لیکن مولانا نے اس معقول اور مناسب راہ کو چھوڑ کر معاملہ خود ہاتھ میں لے لیا۔ اس غلطی کا اعتراف خود مولانا موصوف کے بیان میں موجود ہے۔ غلطی کو تسلیم کرنا انابت کی بنا پر بھی ہوسکتا ہے اور کسی مصلحت وقت کی بنیاد پر بھی لیکن غلطی اپنے مہلک اثرات اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ مضروب بچہ کے اعزہ واقارب میں شدید ہیجان پیدا ہوا اور یہیں سے شہریوں اور طلباء کے تصادم کا آغاز ہوا۔

پمفلٹ پڑا صفحہ ۱۔

تھوڑی سی حاشیہ آرائی نہ کی جائے تو شاید بات آپ کے پلے نہیں پڑے گی۔ اس لئے کہ آپ یہ نہیں جانتے کہ یہ مولانا سعید پالنپوری کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ نیت اور باطن کا حال خدا جانے لیکن مولانا سعید صاحب ظاہری طور پر صرف مومن ہی نہیں بلکہ "مومن کامل" محسوس ہوتے ہیں۔ تشرع اور تقویٰ ان کے انگ انگ سے ٹپکتا ہے۔ انھیں سراپائے شریعت اور سراپائے تصوف بھی کہنا شاید مبالغہ آمیزی کے قبیل سے نہیں۔

چونکہ انسان کا ظاہر بسا اوقات اس کے باطن کی غمازی کرتا ہے۔ اس کی حرکات اس کے باطنی رجحان کو واشگاف کرتی ہیں۔ اسی لئے ہم انھیں نیک اور خداترس سمجھتے ہیں — یہ الگ بات ہے کہ وہ باطنی طور پر ہماری رائے اور قیاس کے برعکس ہی ہوں۔

مولانا سعید صاحب دارالعلوم کے اساتذہ میں سے ہیں چونکہ پالنپوری ہیں اس لئے گجراتی طلباء کا حلقہ ان سے زیادہ متأثر ہے اور انھیں اپنا مطاع تصور کرتا ہے۔

جھگڑے کی ابتدا کس طرح ہوئی تھی یہ آپ پمفلٹ نگار کی زبان سے سن ہی چکے بس یہ بات اور نوٹ کر لیجئے کہ وہ جھگڑا جو کسی بھی صورت آگے نہیں بڑھ سکتا تھا چند گجراتی طلبا کی شرمناک حرکتوں کی وجہ سے طول پکڑ گیا۔ یہ طلبا مولانا سعید پالنپوری کے گہرے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ مولانا سعید صاحب کا کسی بچہ نے اسٹوپ چرا لیا ہے تو یہ غصے سے پاگل ہوگئے انھوں نے یہ تحقیق تک نہیں کی کہ چور کو خود مولانا کافی سزا دے چکے ہیں۔ بس عقیدت اور محبت کے جنون میں آکر وہ اسٹوپ چرانے والے بچہ کے گھر میں جا گھسے اور وہاں جاکر ایسی ایسی دیوانگیوں کا مظاہرہ کیا جن کا احاطۂ تحریر میں لانا بھی کسی شریف آدمی کے لئے ممکن نہیں۔

بعدہٗ ان طلباء نے کچھ اور ایسی حرکتیں بھی کیں جو قطعاً ناقابل معافی تھیں۔ چنانچہ دارالعلوم جیسا صابر و متحمل ادارہ انھیں سزا دینے پر مجبور ہوگیا اور بطور سزا ان کو خارج کر دیا گیا۔

چونکہ ان طلباء کے لئے دارالعلوم چھوڑنا ناگزیر ہوگیا تھا لہٰذا وہ دیوبند کو خیرباد کر کے اپنے وطن چلے گئے۔ وطن جاکر انھوں نے ایک نازیبا حرکت اور کی جو سب سے زیادہ گھناؤنی اور شرمناک تھی وہ یہ کہ دارالعلوم کے خلاف اشتہار بازی شروع کردی

اور ان اشتہاروں میں اس مقدس ادارے پر بڑے ہی دل شکن اور دل خراش الزامات عائد کئے گئے۔ دارالعلوم کے لئے ضروری ہوگیا تھا کہ وہ بھی اظہار حقیقت کے طور پر کوئی اشتہار یا پمفلٹ جاری کرے تاکہ مسخ کردہ حقائق صحیح صورت میں سامنے آجائیں۔ چنانچہ انکشاف حقیقت کے عنوان سے ایک پمفلٹ مرتب کرکے گجرات اور اس کے گرد و نواح میں ارسال کردیا گیا۔

قارئین کو یہ بات سنکر یقیناً تعجب ہوگا کہ بعض نادان اور شیخ چلی قسم کے آدمی یہ شور مچا رہے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند نے گجراتی طلبا پر زبردست ظلم کیا ہے۔ دارالعلوم کو ان کا اخراج نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان دشمنانِ عقل کو کون سمجھائے کہ سزا اور ظلم کے مابین زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ پاداش جرم کو ظلم و ستم سے تعبیر کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے لغزشوں کی وجہ سے اپنی اولاد پر سختی کرنے والے باپ کو "ہلاکو خاں" کا خطاب دے دیا جائے اور اس کی تادیب کو ظلم کے خانہ میں فٹ کردیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر آدمی کی انگلی میں کوئی فاسد اور خراب مادہ پیدا ہوجائے اور پورے جسم کے اندر زہر پھیلنے کا اندیشہ ہو تو دانش مندی کا تقاضا یہ ہوگا کہ اس انگلی کو کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ انگلی کا نقصان مسلّم لیکن پورا جسم اور پورا بدن ہلاک ہونے سے بچ جائے گا۔ بڑے نقصان سے بچنے کے لئے معمولی درجہ کا نقصان اور خسارہ برداشت کرلینا کوئی خلافِ عقل بات نہیں۔

دارالعلوم کے تمام طلبا کی حیثیت ایک جسد کی سی ہے اور ان میں وہ طلبا جو شرّی اور فتین قسم کے ہوں، وہ اس عضو کے مانند ہیں جو گل سڑ گیا ہو۔ چونکہ یہ طلبا تمام طلبا کیلئے ہلاکت و بربادی کا باعث بن سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کا اخراج کردینا عین عقل و دانش کے مطابق ہے۔ اسے ظلم سے تعبیر کرنا معقولیت نہیں کہلائے گا۔

دارالعلوم نے ان طلبا کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ قابلِ مذمت نہیں قابلِ تعریف ہے۔ جو لوگ اسے ظلم و استبداد سے معنون کر رہے ہیں ان کے دماغ میں اس چیز کی کمی ہے جسے بھیجہ کہا جاتا ہے۔

دارالعلوم کے رویّہ سے ہمیں کامل اتفاق ہے لیکن پمفلٹ نگار کے رویہ سے ہم پوری طرح متفق نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پمفلٹ نگار انتہائی درجہ کا غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دار انسان ہے۔ اسے بات کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ اسے یہ تک معلوم نہیں کہ ادب و شائستگی کی حدیں کیا ہیں اور بدتمیزی اور بیہودگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

پمفلٹ نگار نے ایک جگہ مولانا سعید پالن پوری پران سنگین اور کرخت الفاظ میں حملہ کیا ہے۔ یہاں پمفلٹ نگار شدتِ طیش کی وجہ سے یہ تک بھول گیا ہے کہ مولانا سعید صاحب بھی تاحال دارالعلوم کے اساتذہ میں سے ہیں اور دارالعلوم کے کسی استاد کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار خیال کرنا دارالعلوم دیوبند کے منھ پر تھوکنے کے مرادف ہے۔

> "یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ مولانا سعید صاحب پالنپوری مغلوب الغضب اور مشتعل مزاج ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو بھی جب تنبیہ کرتے ہیں تو یہ تادیب تعذیب کے درجہ میں داخل ہوجاتی ہے۔ اس کے شاہد دارالعلوم کے وہ طلبا اور ذمہ دار موجود ہیں جو آئے دن اس گرمی ہنگامہ کو دیکھتے رہتے ہیں" ص۱۸

ہم مان لیتے ہیں کہ اس عبارت میں مولانا سعید صاحب کے جن عیوب کا ذکر کیا گیا ہے یہ من وعن حقیقت پر مبنی ہیں۔ مولانا سعید صاحب مغلوب الغضب سہی۔ مشتعل مزاج سہی لیکن یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے کسی استاد کی لغزشوں کو شائع کرکے دنیا میں پھیلایا جائے اور ان لغزشوں اور خامیوں کی اشاعت اس پمفلٹ کے ذریعہ کی جائے جو دارالعلوم کے ——— دفتر اہتمام میں بیٹھ کر مرتب کیا گیا ہو۔ اگر کوئی آپ سے یہ سوال کر بیٹھے کہ آپ نے ایسے ناکارہ قسم کے لوگوں کو دارالعلوم کے مسند تدریس پر کیوں بٹھا رکھا ہے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟۔

اسی پمفلٹ میں ایک جگہ یہ بھی فرمایا گیا ہے:۔

"وہ خطوط بھی گجرات ہی سے ہم کو موصول ہوئے

جن میں مولانا سعید کی فتنہ پردازی، فتنہ جوئی، طلب جاہ، طلب اقتدار کے لئے اس سمیت اور مہلک جراثیم کا انکشاف کیا گیا ہے جو مولانا کی پوری زندگی پر حاوی اور ان کے دل و دماغ میں موجود ہیں۔ ان خطوط میں ہمیں یہ یاد دلایا گیا ہے کہ مولوی سعید صاحب دارالعلوم میں زمانہ طالب علمی میں بھی اسٹرائک کرا چکے ہیں اور گجرات میں بھی بزمانہ ملازمت کسی مدرسہ کی انتظامیہ کو ان کی اس مزاجی ساخت کی تباہ کاریوں سے دوچار ہونا پڑا۔" ص ۳۱

یہاں بھی ہم یہی عرض کریں گے کہ دارالعلوم کے کسی بھی استاذ کے بارے میں دفتر اہتمام کا یہ ریمارک قابل تعریف نہیں ہے۔ اگر کسی استاذ کے اندر مذکورہ بالا عیوب موجود ہوں تو اسے دارالعلوم سے باہر نکالا جائے۔ کیا ضرورت ہے اسے دارالعلوم میں پناہ دینے کی جو دارالعلوم کی سلامتی کے لئے خطرہ کا باعث ہو۔ اور جس کا وجود کسی بھی وقت کوئی فتنہ کھڑا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر دارالعلوم ضبط اور تحمل سے کام لے رہا ہے۔ عفو و بخشش اور درگزر کرنے کی صفت اپنائے ہوئے ہے تو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی مسند تدریس پر جلوہ گر استاذ کے معائب دنیا میں پھیلانے سے گریز کرے۔

پمفلٹ نگار انتہائی درجہ کا سیاسی اور مہتمم صاحب کا بدخواہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ پمفلٹ میں بعض غلطیاں کچھ اس قسم کی ہیں جو یقینی طور پر دانستہ کی گئی ہیں اور جن سے دفتر اہتمام بدنام ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پمفلٹ نگار نے حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تعریف و توصیف میں انتہائی درجہ کے تحمل اور عیارانہ احتیاط کا ثبوت پیش کیا ہے۔ حالانکہ قبلہ مہتمم صاحب نے اس جھگڑے کو نمٹایا تھا جو پورے دارالعلوم اور پورے دیوبند کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا۔ پورے پمفلٹ میں کہیں بھی یہ بات موجود نہیں ہے کہ اس موقعہ پر حضرت قبلہ مہتمم کا کردار کیا رہا ہے؟۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محترم پمفلٹ نگار صاحب جمعیۃ العلماء سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت مجرمین کے کٹہرے میں صرف مولانا سعید پالن پوری اور چند طلبا کو کھڑا کر دیا ہے اور اس سیاسی جماعت کو ایک بار بھی تنبیہ کرنے کی جرأت نہیں کی جو ایک عرصہ سے دارالعلوم دیوبند کی چہار دیواری میں سیاست اور نفاق و افتراق کی غلاظت پھیلا رہی ہے۔

وہ سیاسی گروپ جس نے ماضی قریب میں بھی اسی مادر علمی کی عزت و ناموس کو اپنے سیاسی مفادات کی خاطر طلبۂ عزیز اور اہل دیوبند کے مابین ایک ہولناک قسم کا تصادم کرا کر دارالعلوم اور اس کے ذمہ داران کی آبرو ریزی پورے ملک میں کرائی تھی۔ اس تصادم میں بھی اسی طرح کے تخریبی ذہن رکھنے والے متشین حضرات نے سطحی قسم کا پروپیگنڈہ کر کے اہل دیوبند کے جذبات کو مجروح کیا تھا۔ یہ کچھ زیادہ پرانی بات نہیں۔ آئینہ وقت اٹھا کر دیکھئے ابھی اس میں وہ پرچھائیاں تھرکتی ہوئی ملیں گی۔ اور ان پرچھائیوں میں آپ کو وہ ہاتھ بھی ضرور نظر آئیں گے جو اپنے ہی اساتذہ کرام کے جیب و گریباں میں الجھے ہوئے ہیں۔

وہی ہاتھ! ہاں وہی ہاتھ آج آلات جارحہ سے لیس ہو کر مادر علمی کے سینہ پر دندنا رہے ہیں۔ جس مادر علمی نے اپنا لہو پلا کر انھیں پروان چڑھایا ہے۔

یہ حالات و واقعات اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ پھر کسی طوفان کی آمد آمد ہے۔ پھر کوئی نیا فتنہ سر ابھارنے والا ہے اور وقت پھر کسی بڑے امتحان کی آزمائش سے گذرنے کی خبر دے رہا ہے۔

حکیم وقت اور نبض شناس حضرات حالات کی نزاکت سے یقیناً پوری طرح باخبر ہوں گے اور بنظر غائر ملاحظہ فرماتے ہوں گے۔

ہم دیوبند ہی میں رہتے ہیں۔ جس وقت طلباء اور شہریوں کے درمیان تصادم ہوا تو ہم دیوبند ہی میں موجود تھے۔ ہم نے چند معتبر حضرات سے سنا ہے کہ جس وقت اینٹ بازی اور پتھراؤ شروع ہوا

مولانا اسعد صاحب کے مکان سے بھی اینٹیں برسائی گئیں اور دارالعلوم کے اہل انتظام کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی لیکن چلئے ہم اس سلسلے میں ان لوگوں کو معتبر نہیں مانتے بلکہ انھیں مفتری اور کذاب گمان کرتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی درست نہیں معلوم ہوتی کہ مولوی اسعد صاحب نے طلباء کو اس طرح اپنی چھت پر چڑھنے اور وہاں سے پتھراؤ کرنے کی اجازت دی ہوگی۔

ہمارا خیال ہے کہ چند لوگوں کی بات سنکر مولوی اسعد یا جمعیۃ العلماء کو فتنہ پرور سمجھ لینا غیر مناسب ہی ہوگا۔ لیکن اس اشتہار کا کیا ہوگا جو جھگڑے کے بعد دیوبند بھر میں چسپاں کیا گیا اور جس میں دارالعلوم دیوبند کے اہتمام پر کھلے حملے کئے گئے۔

قارئین یہ اشتہار بھی ملاحظہ فرمالیں :۔

دارالعلوم دیوبند کا حالیہ ہنگامہ
حقائق کی روشنی میں

دارالعلوم دیوبند کا حالیہ ہنگامہ سنکر دیوبند کے سادہ لوح شہریوں کو روحانی تکلیف ہوئی ہے۔ مگر اس ہنگامہ کا رُخ موڑکر "دیوبند ٹائمز" نے اپنے شمارہ ۱۳ ستمبر کے ذریعہ اہل شہر کو اس جھگڑے میں ملوّث کرکے شہریوں کو دلی صدمہ پہنچایا ہے۔ اراکین دارالعلوم اور اس کے سیاستداں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا کر طلباء عزیز کے جائز مطالبات کو ہمیشہ ایسے ہی ہنگامے کرا کر سبوتاژ کر دیتے ہیں۔ انتظامیہ کے شریف عناصر اور ان کے مدمقابل سیاستداں اچھائیوں کا صلہ تو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور برائیوں کا خمیازہ دیوبند کے بھولے عوام کے سر منڈھنے کی کوشش کرتے ہیں حبکہ دیوبند کے شہریوں کو دارالعلوم کے جھگڑے فساد سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

حقیقت :۔ اصل جھگڑا طلباء دارالعلوم کے جائز مطالبات اور انتظامیہ کی کتنہ پروری پر مبنی ہے جو وقتاً فوقتاً ہنگامہ کی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے اور جس سے ملک و ملّت اور سرکاری انتظامیہ کے لئے دشواریاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

طلبائے دارالعلوم کا یہ کہنا ہے (۱) طلباء کی کوئی یونین نہیں ہے (اس کو بنانے میں دشواریاں پیدا نہ کی جائیں۔

(۲) اکیس ۲۱ لاکھ روپے کے سالانہ بجٹ میں سے صرف ۲۵ فیصد طلباء پر خرچ کیا جاتا ہے اور ۷۵ فیصد انتظامیہ اپنے مصارف میں رکھتی ہے۔ ایسا کیوں ؟

(۳) مجلس شوریٰ میں طلباء کو نمائندگی دی جائے جس کے ذریعہ طلباء اپنی دشواریاں شوریٰ کے سامنے پیش کر سکیں۔

(۴) کتب خانہ کے اوقات بڑھائے جائیں۔ مطبخ میں تیار ہونے والے کھانے کا معائنہ کرنے کا حق طلباء کے نمائندہ کو دیا جائے۔ ان کے ساتھ اہانت آمیز رویہ ختم کیا جائے ——

جہاں تک طلباء کے مطالبات کا تعلق ہے وہ یکسر جائز ہیں انتظامیہ کو چاہیئے کہ ان کی شکایتوں پر غور کریں اور ان کو ہر ممکن طریقہ سے دور کرنے کی کوشش کریں جس سے کہ ان کے لئے تعلیم صحت، صفائی، اچھی خوراک وغیرہ فراہم ہوسکے۔ طلباء عزیز اور باشندگان دیوبند کے مابین طرح طرح کے جھوٹے پروپیگنڈے نہ کئے جائیں کیونکہ اس سے دیوبند کا وقار مجروح ہوتا ہے۔

یہ اشتہار کسی رکشہ پولر کی طرف سے نہیں چھاپا گیا تھا نہ ہی اسے مولانا سعید پالنپوری یا ان کے کسی چمچہ نے شائع کیا تھا بلکہ اسے کامریڈ اصغر حسین انصاری نے چھاپ کر دیواروں کی زینت بنایا تھا اور کامریڈ اصغر حسین انصاری جمعیۃ العلماء کے جوائنٹ سکریٹری ہیں۔

اندازہ یہ ہوا کہ اس تصادم میں جمعیۃ العلماء کا ہاتھ ضرور تھا۔ ہاتھ نہ بھی ہو تو یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ جمعیۃ العلماء دارالعلوم کے اہتمام کی دشمن ہے۔ بدخواہ ہے اور وہ کسی وقت بھی دارالعلوم کے خلاف اشتہار بازی کر سکتی ہے۔ جمعیۃ العلماء کو یکسر اور قطعی طور پر نظرانداز کر دینا اس بات کی کھلی علامت ہے کہ پمفلٹ نگار یا تو جمعیۃ العلماء کا غلام ہے یا عدالت و دیانت کی اہمیت سے قطعاً ناواقف ہے۔

مولانا سعید کو رسوا کرنے میں تو ان کے قلم نے خوب جولانیاں دکھائیں لیکن ان حضرات کو کلیۃً طور پر کیوں بیں انداز کر دیا گیا جو پردے کے پیچھے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور جن کا ہر اشارہ دارالعلوم کی پالیسی کے خلاف تھا

نوید عثمانی

اس زمین کی سب سے قیمتی چیز

جمادات ـــــــ وہ اینٹ پتھر تو نہ تھے

کہ جن کو جب انسانی عقل و ذہن نے سلیقہ کے ساتھ زمین سے لے کر زمین ہی کے سینہ پر کھڑا کیا تو وہ فن تعمیر کے کوئی شاہکار بن گئے، زمین پر کھڑے ہو گئے اور پھر سرد و گرم دنیا کے ہچکولے کھاتے یا کسی زلزلے، آندھی، طوفان کی زد میں آنے کے بعد سینۂ زمین پر پڑے رہ گئے۔ لیکن پھر بھی یہ شاہکار جب تک زمین پر کھڑا رہا اس وقت بھی اسکی کیسی قدر کی گئی! ـــــــ زمین کے گوشے گوشے سے جیتے جاگتے انسان اپنا گھر بار اور اپنے اہل و عیال کو پیچھے چھوڑ کر اس جماداتی حیرت ناک نمونے کے دیدار کے لئے آتے رہے اور فرطِ عقیدت سے اس کو تکتے رہے تاکہ اسکی تعمیری رعنائیوں کا خاکہ اپنے زیادہ و دل پر کھینچ کر لے جائیں اور پھر اس ذہنی خاکے کو اپنی اپنی زور افتادہ بستیوں میں سینۂ گیتی پر اینٹ پتھر کی ایک ایسی ہی تعمیر میں ڈھال سکیں

اور ـــــــ پھر جب وہ تعمیری شاہکار عناصر کے تھپیڑے کھاتا ہوا زمین بوس ہو گیا اور خاک کے حقیر فرش پر ڈھیر ہو گیا، ہاں تب بھی زمین کے دور دراز گوشوں سے دوسرے انسان اس نئے عنوان اور نئے زاویے سے اس کو خراجِ عقیدت دینے کے لئے آتے جاتے رہے

کہ یہ ایک تاریخی عمارت کا تاریخی کھنڈر ہے

ـــــــ ایک کھنڈر جس کی گونگی بہری اینٹوں سے یہ پرشوق اور پر یقین آس لگائی گئی کہ اگر انسان ـــــــ ہم جیتے جاگتے انسان کی طرح قلبی دھڑکنوں کو پوری طرح متوجہ کر سکیں تو وہ ہم سے بات کریں گی اور ہمیں ماضی کی کہانی سنائیں گی۔

یہاں زمین پر کھڑی ہوئی اور ـــــــ زمین پر پڑی ہوئی جماداتی تخلیقات کے ساتھ انسان کی بے قدردانی اور قدر شناسی کا جذباتی عالم ہو تو وہاں نباتات اور حیوانات کے سلسلہ میں اس نے کیا کچھ نادر نہ کیا ہوگا؟ ـــــــ اس نے اپنی دنیا کے ان غیر جنسی ساتھیوں کو جانتے پہچاننے کی کیسی کیسی انتھک کاوش کی، دن کی روشنی اور رات کے اندھیروں میں ان کی معرفت کا کیسا کیسا تعاقب کیا اس کی داستان چاہے انسانی تاریخوں کی عظیم آبلہ پائی سے سن لیجئے چاہے اس رخ سے دیکھ لیجئے کہ آج آدمی یہ جانتا ہے کہ آثار قدیمہ کے گھسے پٹے پتھر کیسے بولتے ہیں۔ نباتات کیسے ہنستے بولتے ہیں اور حیوانات کے لئے کس قسم کے جذبات کی دھوپ چھاؤں پائی جاتی ہے ـــــــ

لیکن ـــــــ

آہ! لیکن! ـــــــ خود اپنے ہم جنسوں کے ساتھ

اسی انسان کا انتظار کر رہی تھی ـ منتظر خود انسان کے اوپر نہ جانے کب سے خون کے آنسو رو رہا ہے ؟ ـــــــ وہ جمادات کے سامنے آتا ہے تو انسان بن جاتا ہے ـ نباتات اور حیوانات کے مطالعہ نے اس کو اپنے روبرو ایک بہترین ذی شعور اور جذبات سے مالا مال انسان ہی پایا ! ـــــــ لیکن جب وہ انسان کے مقابل آیا تو کہیں بھیڑیوں سے زیادہ بھیڑیا ہو گیا ـ کہیں جنگلیوں سے زیادہ جنگلی اور کہیں جانوروں سے بڑا درندہ جانور بن کر رہ گیا !! ـ اس کی اسی دنیا میں بار بار یہ خونچکاں حادثے ہوئے کہ کسی اچھی عمارت کو ڈھایا گیا تو وہ تڑپ اٹھا ـ کسی اچھے درخت کو کاٹا گیا تو اس کا دل کٹ گیا اور غیظ و غضب سے وہ پھوٹ پڑا ـ اور کسی مفید جانور کی "ہنسیا" پر تو کہیں کہیں اللہ ...... انتقام نے اس کے "ہتھیاروں" اور "قاتلوں" کو زن بچہ سمیت انتقام کی خونریز چکی میں پیس ڈالا ـــــــ لیکن اس کی زمین پر اگر کوئی اچھا انسان نمودار ہو گیا تو ...... تو اسی انسان نے جو جمادات نباتات اور حیوانات کا پروانہ وار رقص کر چکا تھا، اس بھلے مانس پر زبان سے آگ اگلی، ہاتھوں سے پتھراؤ کئے اور قدموں سے روند ڈالنے کی ہولناک دیوانگی دکھائی ـــــــ یہ بھلا آدمی جب تک زمین پر کھڑا رہا اسے ان دیوانوں نے دیوانہ قرار دیا لیکن جب وہ زمین کے سینے میں چھپ کر موت کی نیند سو گیا تو یہ دیوانگی کی نیند سونے والے جاگے ! مگر ہائے ! ان کا یہ جاگنا ان کے سونے سے بھی زیادہ لرزہ خیز ثابت ہوا وہ جسے زندگی میں "انسان" ماننے کو تیار نہ تھے ہاں اسی کو مرنے کے بعد "خدا" تسلیم کر بیٹھے ! ـ شاید اس کی اپنی خدا ناشناسی کی یہ وہی آخری سزا تھی جو وہ اسے اس کی زندگی میں بھی کبھی نہیں دے سکے تھے ـ وہ اس کو اس وقت دے دی گئی جب وہ ان کی شیطنت پر صدائے احتجاج کی ایک سسکی بھی نہ نکال سکے ـ

اُف ! یہ انسان ! جو انسان کے سب سے بڑے دشمن ہیں ـــــــ یہ نام نہاد انسان، کوئی بتلائے ان کا حقیقی نام کیا ہے آخر ؟ ان کی حقیقت ایسی پر اسرار ہے کہ خدا کے سوا اور کوئی ان کا حقیقی تعارف نہیں کرا سکتا اور خدا نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا ـــــــ ان کے پاس کان موجود ہیں مگر پھر بھی ان سے سنتے نہیں ! ـــــــ ان کے پاس آنکھیں موجود ہیں مگر پھر بھی یہ ان سے دیکھتے نہیں ـــــــ ان کے سینوں میں دل ہیں مگر پھر بھی ان سے وہ حقیقت کو چھوتے نہیں ـــــــ یہ تو ایسے ہیں جیسے جانور ! ـــــــ نہیں نہیں ـــــــ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ! ـ

یہ تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے جمادات کی قدر کی، نباتات کی قیمت پہچانی، جانوروں کا احترام کیا اور "انسان" کے دشمن ہو گئے ! ـــــــ لیکن آہ ! کیسے ہوں گے وہ "انسان" جن کے بارے میں انسان کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی تھی کہ رشک و نزہی نہیں زمین و آسمان دونوں کی مخلوقات جس کے گن خدا کے روبرو گاتی چلی جا رہی ہیں !

ہاں ـــــــ ان کے متعلق ہی تو یہ بتایا گیا تھا ہمیں کہ ـــ "جس آدمی کو خدا نے علم کی دولت بخشی اور پھر اس نے اس دولت کو خدا کے ہاتھ سے لے کر خدا کی مخلوق کی خدمت کے قدموں میں ڈال دیا ـــــــ دوسروں پر رال ٹپکانے کے بجائے دوسروں کے لئے جو روتا رہا ـــــــ علم فروشی کر کے دنیا کمانے کے بجائے خود اپنی دنیا کو قربانی کی راہ میں کھوتا رہا ـــــــ اس کے لئے سمندروں میں تیرتی ہوئی مچھلیاں ـــــــ خاک پر چلتے ہوئے جاندار اور فضاؤں میں اڑتے ہوئے پرندے اس کائنات کے حقیقی شہنشاہ سے یہ التجائیں کرتے ہیں کہ اس کو اپنی رحمت بیکراں سے ڈھانپ لے، اور اس کی خطاؤں کے گلے میں اپنی مغفرت کی باہیں حائل کر دے ـ اپنی جنت کے سارے بہار کھٹولوں کے پلہ ڈال دے خدایا !" ـــ

اور ـــــــ جن کے متعلق اسی ہستی نے یہ رائے دی تھی کہ یہاں یہی دولت دل کے زندہ خزانے اس زمین کے "روشن ستارے ہیں !" ـــــــ آسمان کے ستارے نکلتے ہیں تو زمین کو چمکاتے ہیں اور خود چمک اٹھتے ہیں ـــ

چھپتے ہیں تو بے نور ہو جاتے ہیں اور بے نور کر دیتے ہیں — لیکن یہ انسان جن کو "زمین کے ستارے" کہا گیا یہ تو جب نکلتے ہیں تب بھی چمکتے اور چمکاتے ہیں اور جب زمین کے سینے میں غروب ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی روشنی اس زمین سے آسمان تک کچھ اور تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور ——

اس وقت میری نظروں کے سامنے کچھ ایسے ہی غروب شدہ ستارے ضو پاشیاں کر رہے ہیں اے لوگو! ہے کوئی جو میرے ساتھ اس نظارے میں شریک ہو کر مجھے بتلائے کہ تو تو محض ان ستاروں کو دیکھ رہا تھا لیکن ہم نے تو آنکھیں دیکھ کر ان کی روشنی خونِ حیات کے قطرے قطرے میں بھر لی اور خود بھی ایسا ہی روشن ستارہ بن کر دکھا دیا! —

زندگی کے افق پر ایسے ستاروں کو ڈوبتا ہوا دیکھ کر یہ دُنیا نہ جانے کب سے رو رہی ہے —— اور اس کی آنکھوں کی روشنی پانی بنکر بہتی چلی جا رہی ہے۔ ہائے وہ لمحہ کب آئے گا کہ اس افق پر پھر ایسے ہی روشن ستاروں کی پوری کہکشاں طلوع ہو کر دم توڑتی ہوئی سسکتی ہوئی انسانیت کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکے! —

سچ بتاؤ! —— وہ لمحہ اب ہم سے کتنی دور ہے؟

—— یا . . . . . خدانخواستہ اتنی دور ہے کہ وہ زمین تک اس وقت آئے گا کہ جب ہم خود ہمیشہ کے لئے آنکھ بند کر چکے ہوں گے —— اگر اس المیہ کو سہنے کی تاب ہم میں نہیں تو مبارکباد! —— اس لئے کہ ایسے ہی لوگ تو وہ ہیں جو اس لمحہ کے آنے کا انتظار کرنے کے بجائے اس لمحہ کو لانے والے خود ہی ہوتے ہیں۔ اس انسانی سرائے فانی کی ظلمتوں کو اس طرح تڑپتے سینوں ہی سے ہمیشہ انسانیت اور زندگی کی نئی پو پھوٹی ہے دوستو! —— رگوں میں دوڑتا ہوا جو خون اسی طرح آنسو ہی آنسو بن کر رہ جاتا ہے۔ ہاں مادرِ گیتی کے ایسے ہی بیٹوں اور بیٹیوں کا خونِ حیات ہی تو ابھی مادرِ گیتی کو انسانیت کا نیا جوبن عطا کرتا آیا ہے۔ ایسے ہی وہ انسان تھے جو خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کے حسین ہونٹوں پر "روشن ستارے" بن کر بوسہ دے سکے۔ انھیں یہ اعزاز اس وقت تک ملا جب یہ اعزاز ان کی نظر میں اس دنیا کی لذتوں کو بے کیف بنا چکا تھا اور اس دنیا کی طاقتوں کو بے دم کر چکا تھا ہائے وہ دولت بے بہا! جسے کوئی دولت خرید سکی نہ للچا سکی اور ہائے وہ ایمان کا رقص بسمل جس نے طاقت کی ہر تلوار کی دھار کو اپنی مسلسل تڑپ کا دوشِ گل قرار دیا —— اے دنیا کے سیم و زر کی جھنکار پر سر دھننے والو! تم ہم سے مایوس ہو جاؤ کہ ہم پر تمہاری دولت کا طلسم قائم ہو سکے گا اسلئے کہ ابھی وہ لوگ ہماری نظروں کے سامنے ہیں جن کی دولتِ دل کی چوکھٹ پر تمہاری یہ ساری دولت ذلیل ہو کر آئی اور جبیں سائی کر کے ناکام لوٹی ہے اور اے دنیا کی طاقت و اقتدار کے پہاڑو! تم ہمیں خوف زدہ کرنے کا خیال نہ دو اسلئے کہ ابھی تاریخ کے دریچوں سے وہ لوگ ہماری طرف جھانک رہے ہیں جن کی حق گوئی و بیباکی، جن کے ہونٹوں کی پھونکوں نے تمہانے کتنی بار ایسے کتنے ہی پہاڑوں کو اس طرح اڑا دیا جیسے آندھیوں کے جھکڑوں میں ریت کے سر بفلک ٹیلے ریگزاروں میں اڑے اڑے پھرتے ہیں۔

دیکھو! یہ ہیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جن کی سفید پوشی اور نفاست طبع اور جن کی قدر و منزلت کو دیکھ کر دنیا نے یہ سوچا کہ یہ چیزیں ان کی کمزوری بن گئی ہوں گی اور وہ حق کی راہ میں اب اسے کھو کر حق گوئی کی جرأت کا تصور نہ کر سکیں گے۔ لیکن جب تاج و تخت کے مالک نے علم کی اس مسند سے پنجہ لڑایا تو اس مسند نے اس تاج کو ٹیڑھا کر دیا اور اس تخت میں زلزلہ دوڑا کر رکھ دیا —— طلاق بالجبر کے ایک غلط مسئلہ پر حق کا لیبل لگا کر اسے حکومت نے اپنی جبریہ بیعت اور حلفِ وفاداری کا عنوان بنانا چاہا اور یہ چاہا کہ امام مالک اپنی قدر و منزلت اور اپنی دنیاوی زندگی کا اعلیٰ معیار قائم رکھنے کے لئے حکومت سے نکرائیں تو فی الفور مسند چھوڑ کر سینۂ خاک پر اپنے ننگے پاؤں جما کر حکومت کے مقابلہ میں آکھڑے ہوئے اور اس طرح دنیا نے دیکھا کہ عشق کس طرح آتش نمرود میں بے خوف و خطر کود سکتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک جو ہستی ہمیشہ سے حکومت کی طرف سے اعزاز و قدر و منزلت سے

لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ہاں وہی ہستی آج اپنی خوشی سے حق کے لئے سینہ سپر ہو کر اپنی کمر پر ستر کوڑوں کی شاہی سزا سہہ رہی تھی اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ رہی تھی۔

علم دین کی پشت پناہی کے لئے یہی پیٹھ خدا نے تیار کی تھی کہ جو حق و صداقت کی آبرو قائم رکھنے کے لئے خود بے آبرو ہونے کو سب سے بڑا اعزاز تصور کرے۔ کیسی مقدس پیٹھ تھی جو ان میں نہا رہی تھی۔ لیکن کیسا منظر ہے اعلان حق اس خون کے ذریعہ فرشتوں کے ہاتھ قلمبند کر رہے تھے "آسمان کے بادشاہ کا قول برحق ہے اور اس سے ہٹنے والا زمین کا یہ بادشاہ جہالت اور باطل کی ٹھوکریں کھا رہا ہے"۔

دونوں ہاتھ مونڈھوں سے اتر گئے تھے مگر حق کے خلاف شاہی باطل انھیں اپنی حمایت میں اٹھوا نہ سکا۔ بادشاہ نے عالم دین کو ذلیل کیا تو دیکھ کر خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو گیا کہ علم و حق کی راہ میں ہر ذلت انسانی کردار کو چار چاند لگاتی چلی جا رہی ہے۔

انھیں جانور پر سوار کر کے سارے شہر میں تشہیر اور ذلیل کی سزا دی گئی۔ مگر خود انھوں نے یہ کہہ کر سارے شہر میں بادشاہ ذلیل اور حق کو سرخرو کر دیا کہ جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے جو نہیں جانتا وہ اب جان لے! ——— میں ہوں مالک بن انس کا بیٹا! ——— اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں مجھے ذلیل کرنے والا بادشاہ جہالت اور باطل کی ٹھوکر کھا رہا ہے"۔

اور ——— ایک نہتے انسان کی زد میں اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ گرجتی ہوئی حکومت خوف و دہشت سے دنگ ہو کر رہ گئی! ——— یہ امام احمد بن حنبلؒ ہیں جن کو دھمکایا گیا کہ اگر خلق قرآن کے اس فتنہ میں تم نے حکومت سے ٹکر لی تو خاک و خون میں لڑھکتے ہوئے ان سروں میں تمہارا سر بھی ہوگا ———

لیکن رمضان المبارک میں اس وقت ستر ستر کوڑوں کے ہاتھ نے کاں مار بھی نہ ان سے روزہ چھڑا سکی اور نہ حق و صداقت کا دامن! ان کے پیروں میں انتہائی بوجھل بیڑیاں ڈالی گئیں مگر ان کی حق گوئی مقید ہونے کے بجائے اور زیادہ آزاد ہو گئی ——— انہوں نے اپنے خون میں غسل کرتی ہوئی پیٹھ اور بھوک کی آگ میں سلگتے ہوئے پیٹ کے ساتھ آسمان و زمین کو اس صدائے حق سے بھر دیا کہ "حق صرف وہ بات ہے جو کتاب و سنت میں ہے، وہ نہیں جو بادشاہ کی زبان پر ہے۔

مجھ سے میرا دو جسم بھی چھین لو لیکن مجھے صرف اتنا ثبوت دیدو کہ بادشاہ کی رائے کتاب و سنت کی روشنی میں حق ہے"۔

اور ——— ایمان و یقین کے اس انسانی پیکر نے طوق و سلاسل کے درمیان یہ اعلان کر کے تاج و تخت پر ایسی بجلیاں گرا دیں کہ تاج و تخت اور دار و رسن سراسیمہ ہو کر رہ گئے۔

یہ امام ابوحنیفہؒ ہیں جن کو ضمیر کا خون کر کے شاہی تقرب سے لطف اندوز ہونے کی دعوت ملی تو انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جان پر ایمان نہیں بلکہ ایمان پر جان قربان ہونی چاہیے ان کی حق گوئی اور حق جوئی نے دکھا دیا کہ سچا انسان کتنی آسانی سے حق کے لئے جوشِ سپردگی میں شاہی تقرب و اعزاز کی مسند چھوڑ کر زنداں کی آہنی سلاخوں کے پیچھے اپنے پیروں چل کر جاتا ہے تو فرطِ تشکر سے خدا کے قدموں پر سر رکھ کر یوں روتا ہے کہ کہاں تھا خدایا میں اس اعزاز کے لائق کہ جس تک مقرب ترین فرشتوں کا بھی گذر نہیں"۔

یہ ہیں امام شافعیؒ جنھوں نے تلوار کی دھار کے نیچے اپنا سر رکھ کر یہ کہا تھا کہ یہ تلوار جس ہاتھ کی گرفت میں ہے وہ اگر حق و صداقت کا خون کرنا چاہے گا تو اس کی شاہی کلائی پکڑ لی جائے گی ——— پھر بھی نہ رکے گا تو توڑ دی جائے گی"۔

یہ حضرت حسن بصریؒ ہیں جنھوں نے اپنے عہد کی اس شاہی شورش پر برق بے تپاں بنکر گرتے ہوئے جب کسی سے یہ سنا کہ "کیا سب اس معاملہ میں باطل پر ہیں؟ کیا ..... آپ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت بھی؟" .... تو وہ حق و بینا کی کوہ افگن گرج بن کر ایک بار نہیں دو بار گرج اٹھے ———

"ہاں حکومت بھی...... ہاں ہاں حکومت بھی!"

یہ ہیں شیخ عبدالقادر جیلانی رح کہ جنھوں نے ظلم وستم کے خلاف بادشاہ کے نام مرسلہ احتجاجی خط میں ان الفاظ میں اقتدار کو للکارا تھا کہ "تو نے ارحم الراحمین کی مخلوق پر اظلم الظالمین حاکم مسلط کئے ہیں! بتا! احکم الحاکمین کو حشر کے دن کیا جواب دے گا؟" ——— اور دار و رسن کو للکارتے ہوئے یہ الفاظ جب اس شخص کی سماعت سے ٹکرائے کہ جو تخت شاہی پر تاج زرنگار رکھے بیٹھا تھا تو اس کا سارا وجود خوف سے کانپ اٹھا اور آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں

یہ ہیں امام جوزیؒ جنھوں نے چٹائی پر بیٹھ کر کرسئ اقتدار پر جھومتے ہوئے سروں پر اس تنقید کا تازیانہ مارا تھا کہ "یہ ہیں وہ فریب کار اور فریب خوردہ لوگ کہ جو اہل حق کو سزا دیتے ہوئے اقتدار کا ہاتھ چلاتے ہیں تو حق کو کمزور اپنے باطل کو طاقتور سمجھتے ہیں، لیکن پھر جب ان کا جرم ان کے ضمیر میں کانٹے چبھوتا ہے تو چاہتے ہیں کہ اب انھیں خدا کی پکڑ سے بچانے کے لئے ان ہی مظلوم اہل حق کے ہاتھ دست بدعا ہوکر بچا لیں۔ بہ خود زمین کے سینے پر بوجھ بن کر یہ چاہتے ہیں کہ قیامت کے دن گناہوں کا پلڑا دوسروں کی دعاؤں کے ہاتھ سے ہلکا کر لیجائیں گے!۔

اور

ایسے ہی نہ جانے کتنے روشن اور شمعی ستارے ہیں جن سے ہماری تاریخ کا آسمان بھرا پڑا ہے ——— جس طرح اس آسمان کے تاروں کا شمار ممکن نہیں اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ زمین کے ان روشن ستاروں کو ہندسوں اور گنتی کی حدود میں گھیرا جاسکے لیکن کیا ——— اب ایسا کوئی ستارہ ہم کروڑوں مسلمانوں کے کروڑوں افق پر اس دنیا کو نہیں دکھا پائیں گے؟ ——— اس وقت جب کہ ہم اسی ایمان کے مدعی ہیں جس کی روشنی نے کفر و شرک کی پیدائشی تاریکیوں کو ان ستاروں میں تبدیل کر ڈالا تھا؟ کیا.... آہ.... کیا ہم مسلمان ہیں؟ اور کیا ..... پھر بھی اس تاریک عہد کی اس للکار کے جواب میں ہر طرف سناٹا ہی طاری ہے؟..... ✿

تجلی کی ڈاک

پچھلی کتابوں کے منسوخ ہونے کا مسئلہ

سوال ۱ :- از رحیم الدین نیاز کریم نگری ۔

ایک سوال پیش خدمت ہے اس کا جواب عنایت فرمائیے ۔

دوران گفتگو میں زید نے کہا کہ قرآن پاک کے نزول ہونے کے بعد پچھلی تمام کتابوں مثلاً توریت، انجیل زبور وغیرہ کو منسوخ قرار دیا گیا ہے جس کا ذکر خود قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ بکر کا کہنا ہے کہ قرآن پاک میں پچھلی کتابوں کے منسوخ ہونے کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ لہٰذا اس بارے میں لفظ منسوخ کا استعمال غلط ہے۔ بکر دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ہم کو ایمان مفصل میں تمام کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے کے لئے کہا گیا ہے ۔ اس لئے ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے ۔

الجواب ۱ :-

ہمارے پاس روزانہ اتنی تعداد میں حل طلب مسائل آتے ہیں کہ اگر ہم ان کا تحقیقی اور مدلل جواب دینے کی روش اختیار کرلیں تو پھر یہ ہماری عمر عزیز ان ہی مسائل کی نذر ہو کر رہ جائے کسی دوسری ذمہ داری کی طرف توجہ کرنے کی نوبت کبھی نہ آسکے ۔

آپ نے جو سوال ارسال کیا ہے وہ بلاشبہ تحقیق اور دلائل کا مطالبہ کرتا ہے، لیکن عالم یہ ہے کہ دوسری گوناگوں ذمہ داریوں کی وجہ سے فرصت عنقا بلکہ ہما بنکر رہ گئی ہے ۔ اور جب فرصت ہی نادر و نایاب ہو کر رہ گئی ہو تو پھر دلائل کی چھان بین کرنا کس طرح ممکن اور مناسب ہے

دوسری بات یہ ہے کہ جن مسائل میں امت مسلمہ کا اجماع اور اتفاق ہے ان کے اثبات و تصدیق میں دلائل و براہین کی سطر بندی کرنا اضاعت وقت کے سوا کیا کہلائے گا ۔ ایک فرد یا دو چار افراد یا درجن دو درجن نفوس پر مشتمل کوئی ٹولی اگر اجماع امت کے خلاف بھاشن دینے لگے یا تردید و تکذیب اور تشکیک و تردد کا مظاہرہ کرنے

گئے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے — زبان کسی کی بند نہیں کی جا سکتی۔ دلائل کسی کج فکر کو خاموش اور مطمئن نہیں کر پاتے۔ جن حضرات کو غلط در غلط سوچنے کی عادت ہوتی ہے وہ ہمیشہ الٹی ہی سوچتے ہیں اور الٹی سیدھی ہانکتے پھرتے ہیں۔ یہ حضرات اپنا رویہ نہیں بدل سکتے۔ آپ لاکھ دلائل کی مسند سجائیے، لاکھ منطق جھاڑیئے اور لاکھ کتابوں کے حوالے دیجئے۔

امت کا اجماع ہے کہ سابقہ تمام ہی آسمانی کتب منسوخ ہو چکی ہیں۔ ان کے احکامات پر عمل کرنا درست نہیں۔ بکر اگر تھوڑی سی عقل کا استعمال کرتا تو اسے خود اس نتیجہ پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی تھی کہ قرآن حکیم کا نزول بجائے خود اس بات کی کھلی علامت ہے کہ پچھلی تمام شریعتیں اور تمام کتابیں منسوخ یعنی ناقابل عمل قرار پا چکی ہیں۔ ایک عام فہم بات ہے کہ ہر بعد والا حکم پہلے حکم کے لئے ناسخ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ بغرض علاج کسی حکیم کے پاس جائیں۔ نبض دیکھنے کے بعد وہ آپ کو نسخہ لکھ دے گا۔ آپ اس میں لکھی ہوئی دواؤں کا استعمال شروع کر دیں گے۔ چند دن کے بعد جب آپ کے مرض میں کچھ افاقہ یا اضافہ ہو چکا ہو گا۔ آپ دوبارہ حکیم صاحب کے پاس تشریف لائیں گے اور مرض کی کیفیات اور دواؤں کے استعمال کے بعد پیدا شدہ صورتِ حال کا تذکرہ کریں گے۔ حکیم صاحب پھر نبض دیکھیں گے اور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پچھلے نسخہ نے خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچایا ہے۔ چنانچہ وہ آپ کو دوسرا نسخہ عنایت فرما دیں گے۔ آپ بے چون و چرا دوسرے نسخہ کا استعمال شروع کر دیں گے۔

دوسرے نسخہ میں یہ کہیں تحریر نہیں ہوتا کہ پہلے نسخہ کو منسوخ سمجھئے بلکہ دوسرا نسخہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ پہلا نسخہ منسوخ اور ناقابلِ استعمال قرار پا چکا ہے۔ اور اس کی جگہ اس نئے نسخہ نے لے لی ہے اور اب یہی اور صرف نسخہ قابلِ استعمال ہے۔ آپ دونوں نسخوں کو استعمال میں نہیں لائیں گے — لائیں گے تو اسے کوئی معقول اور قابلِ تحسین فعل نہیں سمجھا جائے گا بلکہ دونوں نسخوں کا ایک ساتھ استعمال مضر اور نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبرستان میں آمد و رفت کرنے سے روک دیا تھا، پھر کچھ عرصہ بعد آپ نے زیارتِ قبور کی عام اجازت عطا فرما دی اور صرف یہ ارشاد فرمانے پر اکتفا کیا کہ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا۔ میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے روک دیا تھا۔ بس اب تم زیارتِ قبور کر سکتے ہو۔

یہاں کہاں یہ واضح فرمایا کہ میرا پہلا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ یہ واضح کرنے کی اس لئے بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ عام طور پر سابقہ حکم وضاحتِ تنسیخ کے بغیر منسوخ اور بعد والا حکم تشریح و توضیح کے بغیر ناسخ تصور کیا جاتا ہے۔

آغازِ اسلام میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے تمام کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا تھا، پھر کچھ مدت کے بعد آپ نے صرف کالے کتوں کو مارنے کا حکم صادر فرمایا اور اس طرح آپ نے اپنے پہلے فرمان پر خود ہی خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ زبان سے یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میرا پہلا قول منسوخ ہو گیا اور قابلِ عمل یہ بعد والا قول ہے۔

قرآن حکیم میں دسیوں آیات ایسی ہیں کہ جنھیں منسوخ سمجھا جاتا ہے۔ اور آنحضورؐ کے زمانۂ مبارک میں یہ آیات ناقابلِ عمل قرار پا چکی تھیں۔

سورۂ بقرہ کھولئے۔ اس میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ تم پر رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی روزہ رکھنے کی ہمت نہ رکھتا ہو تو وہ کسی مسکین کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دے اور یہ اس کی طرف سے روزہ کے قائم مقام ہو جائے گا اور اس کا شمار بھی روزے داروں میں کیا جائے گا یعنی اسے بھی وہ اجر اور ثواب نصیب ہو گا جو روزہ داروں کو ملنے والا ہے۔ لیکن دوسری آیت میں صاف صاف یہ ارشاد فرما دیا گیا کہ رمضان کے روزے رکھنے ضروری ہیں۔ بلا کسی عذر کے ان کا چھوڑنا جائز نہیں ہے اور بلا کسی عذر شرعی کے مسکین کو کھانا کھلانا

روزہ کا بدل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کھول کر دیکھ لیجئے۔ اسکی وضاحت نہیں کی گئی کہ پہلی آیت منسوخ ہے اور بعد والی ناسخ۔ لیکن مفسرین کا اجماع ہے کہ آیت وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ منسوخ ہو چکی ہے اور فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نے اسے ناقابلِ عمل بنا دیا ہے۔ اب پہلی آیت کو دلیل بنا کر رمضان کے روزوں سے گریز کرنا اور غریبوں کو کھانا کھلا کر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا جائز نہیں۔ غرضیکہ ہر بعد والا حکم پہلے حکم کو منسوخ کر دیتا ہے اور اسی طرح ہر نئی شریعت پرانی شریعت کو منسوخ کر دیتی ہے۔ قرآن حکیم کا نازل ہونا ہی فی نفسہٖ اس بات کی علامت ہے کہ سابقہ شریعت اور سابقہ کتب منسوخ کر دی گئی ہیں اور اگر انھیں قابل عمل تصور کیا جاتا تو پھر نئی کتاب کے نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

بکر کا انداز گفتگو یہ بتا رہا ہے کہ اس نے عقل وخرد کو طلاق دیکر اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ بکر کا اپنے نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ نظیر پیش کرنا کہ ایمان مفصل میں گذشتہ تمام کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے کی گذارش کی گئی ہے انتہائی لغو اور مہمل بات ہے۔

یہ کب اور کس نے کہا ہے کہ انجیل اور توریت وغیرہ آسمانی کتابیں نہیں ہیں۔ دنیا بھر کے تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ انجیل اور توریت وغیرہ بھی آسمانی کتب ہیں۔ یہ بھی قرآن کی طرح برحق اور شاہکار خداوندی ہیں۔ ان کی تصدیق وتائید کرنا بھی بالکل اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق وتائید کی جاتی ہے۔

ایمان مفصل کی بات چھوڑیئے۔ یہ تو احادیث سے ماخوذ ہے خود قرآن مقدس میں جا بجا سابقہ کتب کی تصدیق کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن کا پہلا صفحہ کھولئے یہ آیت نظر آئے گی۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔

مومنین اور متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی اور ان کتب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ سے پہلے دوسرے انبیاء پر نازل کی جا چکی ہیں۔ گویا کہ صرف احادیث ہی سے نہیں بلکہ قرآن حکیم کی آیات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کی طرح دوسری کتابوں کی تصدیق کرنا اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تصدیق کرنے اور ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں بھی آسمانی سمجھا جائے، منجانب اللہ تصور کیا جائے۔

آپ پورا قرآن ٹٹول لیجئے۔ یہ تاکید تو جا بجا نظر آئے گی کہ پچھلی کتابوں پر ایمان لاؤ، ان کی حقانیت کی تصدیق کرو لیکن یہ کہیں نظر نہیں آئے گا کہ ان احکامات پر بھی عمل کرو جو پچھلی کتب میں واضح اور غیر واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے احکامات پر بھی عمل کرنا بالکل اسی طرح ضروری اور ایمان و اسلام کا جزو تصور کرو جس طرح قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہونا ناگزیر اور ایمان واسلام کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔

قرآن کسی بھی جگہ یہ حکم نہیں دیتا کہ سابقہ شریعت پر عمل ضروری ہے اور یہ بجائے خود اس بات کا واضح اور بیّن ثبوت ہے کہ گذشتہ تمام احکامات وقوانین منسوخ ہو چکے ہیں۔ ان پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔

مثلاً:۔ پہلے عاشورہ کا روزہ فرض تھا لیکن اب اس کی فرضیت ساقط ہو گئی ہے۔ اسی طرح ایام بیض کے روزے پہلے فرض اور واجب کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن اب انکی فرضیت اور ان کا وجوب منسوخ ہو گیا ہے۔

پہلے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نمازیں ادا کی جاتی تھیں لیکن اب خانہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کو ضروری قرار دے دیا گیا ہے اور بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا جائز نہیں رہا ہے۔

سابقہ شریعت میں دو سگی بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا جائز تھا، بعد میں ناجائز قرار دے دیا گیا۔ امت مسلمہ کے لئے بھی یہ بات جائز نہیں کہ دو سگی بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھا جائے۔

اس قسم کی سیکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انجیل وغیرہ میں جو چیزیں جائز اور حلال تھیں

وہ قرآن حکیم میں ناجائز اور حرام کر دی گئیں۔ اسی طرح بعض چیزیں پہلی شریعتوں میں حرام تھیں انھیں شریعت اسلامی نے حلال کر دیا۔

بعض چیزیں مشترک قسم ہیں۔ یعنی پہلے بھی حرام تھیں اور اب بھی حرام ہیں۔ یا پہلے حلال تھیں اور فی زمانہ بھی حلال ہی ہیں۔

تمام کتابوں پر ایمان لانے کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ ان میں بیان شدہ احکامات و قوانین پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ قرآن حکیم کے نزول کے بعد پچھلی تمام کتب قطعی طور پر منسوخ ہو چکی ہیں۔ قرآن حکیم جیسی مکمل، جامع، وسیع اور ہمہ گیر کتاب کے ہوتے ہوئے اس بات کی احتیاج بھی نہیں کہ انجیل اور توریت وغیرہ کے احکامات پر نگاہ رکھی جائے۔ توریت اور انجیل میں جتنے احکامات اور مسائل بیان کئے گئے تھے تقریباً سبھی قرآن میں موجود ہیں اور جو موجود نہیں ہیں وہ منسوخ قرار دیئے جا چکے ہیں لہٰذا ان پر عمل کرنا عبدیت اور بندگی کا تقاضا نہیں۔

یوں سمجھئے کہ کسی جگہ چھوٹے چھوٹے پچاس قمقمے جل رہے ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں ایک بڑا بلب روشن کر دیا جائے ظاہر سی بات ہے کہ بڑا بلب روشن کر دینے کے بعد ان چھوٹے چھوٹے قمقموں کی روشنی ماند بلکہ کالعدم ہو کر رہ جائے گی۔ بڑے بلب نے جل کر چھوٹے قمقموں کا وجود نہیں مٹا دیا بلکہ اس روشنی کو ختم کر دیا ہے جو اس کے جلنے سے پہلے پھیلی ہوئی تھی۔

آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک جتنی بھی شریعتیں آئیں وہ جامع اور مکمل نہیں تھیں۔ ان کی حیثیت چھوٹے چھوٹے قمقموں جیسی تھی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں مبعوث کیا گیا اور ان کے ہمراہ جو شریعت ارسال کی گئی وہ بہر اعتبار جامع مانع اور کامل واکمل تھی اور اس شریعت کی حیثیت قطعاً دو ہزار واٹ کے بلب جیسی ثابت ہوئی۔ اس کی روشنی کے سامنے پرانی شریعتوں کی روشنی مدھم پڑ گئی بلکہ مانند عدم ہو کر رہ گئی۔ البتہ ان کا وجود پھر بھی باقی رہا اور ان کے وجود کی تصدیق اہل ایمان کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

حاصل یہ نکلا کہ سابقہ کتب کا وجود چونکہ دنیا میں پایا جاتا ہے اس لئے ان کی تصدیق ضروری ہے۔ نہ بھی پایا جائے تب بھی یہ سمجھنا اور کہنا تو ضروری ہی ہوگا کہ یہ تمام کتب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں کسی انسان کے ذہن کا اختراع نہیں تھیں۔ لیکن قرآن کے مبارک وجود نے ان احکامات کو منسوخ کر دیا ہے جو ان کتب میں موجود تھے یا موجود ہیں — منسوخ شدہ تعلیم پر عمل کرنا گناہ و معصیت کے ارتکاب سے کسی درجہ کم نہیں۔

جو شخص قرآن حکیم کے احکامات پر بھی عمل پیرا ہے اور ان فرمودات پر عمل کرنے کو بھی روا خیال کرتا ہے۔ جو انجیل اور زبور وغیرہ میں مذکور ہیں اس شخص کی مثال تو بالکل اس مریض کی سی ہے جو حکیم کے اس نسخہ کو بھی استعمال میں لا رہا ہے جسے خود حکیم نے کنڈم قرار دے دیا تھا۔ ایسا شخص دانشمند کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

صحابی کی تعریف

سوال ۲:- (ایضاً)

زید نے کہا کہ صحابی اس کو کہتے ہیں جس نے بحالت ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو اور آخر تک ایمان پر قائم رہا ہو۔ بکر کا کہنا ہے کہ صحابی وہ ہے جس نے بحالت ایمان حضورؐ کو دیکھا ہو یا دیکھ کر ایمان لایا ہو۔ اب آپ ہی بتایئے کہ کس کی بات درست ہے؟

جواب ۲:-

غالباً آپ سے زید و بکر کی گفتگو نقل کرنے میں چوک ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ دونوں کے نظریات تقریباً ایک ہی جیسے ہیں۔

صحابی کی مختصر تعریف ذہن نشین کر لیجئے۔ صحابی اس خوش نصیب مسلمان کو کہا جاتا ہے جس نے حالتِ ایمان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہو اور حالتِ ایمان ہی میں اس کا انتقال ہو گیا ہو۔ اگر کسی شخص کو حالتِ ایمان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ با برکت میں بیٹھنے کی

سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن پھر وہ مرتد ہو گیا اور آخر عمر تک
(مرتد ہی) رہا تو اسے صحابی نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی طرح
اس شخص کو بھی صحابی تصور کرنا غلط ہوگا جس نے حالت
کفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی اور آپؐ
کے دنیا سے روپوش ہونے کے بعد وہ دائرۂ ایمان میں داخل ہوا
گویا کہ صحابی کہلانے کا مستحق وہ شخص ہے جو صحبتِ
رسولؐ کے وقت بھی صاحبِ ایمان ہو اور اپنی وفات کے
وقت بھی صاحبِ ایمان ہی رہے۔ یہ کہنا کہ صحابی وہ
کہلاتا ہے جس نے آنحضورؐ کو بحالتِ ایمان دیکھا ہو۔ اور
بحالتِ ایمان ہی اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ جامع
مانع تعریف نہیں ہو سکتی۔

دیکھئے کہ اگر شرط قرار دیا جائے گا تو عبد اللہ بن مکتوم
جیسے نابینا لوگ صحابی کی تعریف سے خارج ہو جائیں گے
عبد اللہ بن مکتوم نابینا تھے۔ انھوں نے آنحضور صلی اللہ
علیہ وسلم کو کبھی نہیں دیکھا لیکن چونکہ انھیں آنحضورؐ کی طویل
صحبت پانے کا شرف حاصل ہوا ہے لہذا انھیں علمائے امت
نے صحابی تصور کیا ہے۔

اندازہ یہ ہوا کہ صحابی بننے کے لئے دیدارِ رسولؐ شرط
نہیں صحبتِ رسولؐ شرط ہے۔

خدا کے خیر و شر پر قادرِ مطلق ہونے کی بحث

سوال ۳:۔ جناب محفوظ الرحمن سالک۔

میں ایک ایسی الجھن میں پھنسا ہوں کہ اپنے ایمان کو
سالم رکھنا سخت مشکل ہے۔ چونکہ تجلی کے اشاعت کا مقصد
ہی دین کی خدمت ہے۔ اس لئے حضور والا سے عاجزانہ
درخواست ہے کہ میری اور میرے دوستوں کی اس مشکل کو حل
کریں تو بڑی عنایت ہوگی اور ہم لوگ اپنے ایمان کو بچانے
میں کامیاب ہوں گے۔ عرض خدمت ہے کہ بریلی مکتب
فکر کے ایک عالم سے ایک دن یوں ہی باتوں کے درمیان
یہ بات آئی کہ کیا خدا ہر چیز پر قادر ہے چاہے خیر ہو یا شر
چونکہ خدا قادرِ مطلق ہے اور خود خدائے تعالیٰ قرآن مجید
میں فرمایا ہے۔ ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر۔ اس پر
مولانائے محترم فرمانے لگے اس آیت کے تحت جو آپ نے
سمجھ رکھا ہے کہ خدا ہر خیر و شر پر قادر ہے، یہ غلط ہے۔ اور
بہت سے وہابی دیوبندی اس کی اس طرح غلط تفسیر بھی
بیان کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کو ہر خیر و شر اور ہر اس چیز پر
قادر مانتے ہیں جو بندہ کر سکتا ہے۔ ایسے لوگ مشرک ہیں۔ ان کی
توبہ قبول نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ خدا پاک اور بے عیب ہے
ہر وہ فعل جو بندہ کرتا ہے جیسے جھوٹ۔ زنا۔ چوری وغیرہ
اگر ان چیزوں پر خدا کو قادر مانا جائے تو ماننا ہوگا کہ خدا میں
عیب ہے۔ اور یہ مسلّم ہے کہ خدا بے عیب ہے۔ اس لئے خدا
برائیوں پر قادر نہیں۔

آپ کی ذاتِ گرامی سے پوری امید ہے کہ اس کو دینی
خدمت سمجھتے ہوئے جواب دینے کی زحمت گوارہ کریں گے
تاکہ ہم لوگوں کی رہبری ہو سکے۔

الجواب ۳:۔

ہمارا خیال ہے کہ عوام کو اس قسم کی نازک بحثوں میں
نہیں الجھنا چاہئے۔ ان پیچیدہ مسائل میں الجھنے سے فائدہ
کچھ نہیں، نقصان ہی نقصان ہے۔

بریلوی حضرات جب تک علمائے دیوبند پر تعصب کے
ڈھیلے نہیں اچھال لیتے ان کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ علمائے
دیوبند کو گالیاں دینا، ان کی ہتک کرنا، انھیں بدنام
کرنے کی کوشش کرنا تو ان کا شیوہ بن چکا ہے۔ اس مسئلہ
کی آڑ لے کر بھی انھوں نے علمائے دیوبند کو جی بھر کے صلوٰتیں
سنائی ہیں۔ حالانکہ دیوبندی علماء نے جو کچھ فرمایا تھا عقیدہ
وایمان اور علم وعقل کی رو سے وہ بالکل درست تھا۔

ایک واقعہ سنئے:۔

ایک مقرر صاحب کسی جگہ تقریر فرما رہے تھے۔ زنا کی
قباحت پر روشنی ڈالنے کے بعد انھوں نے زنا سے محترز رہنے
کی تاکید کی۔ اور ان افعال واطوار سے گریزاں رہنے کی بھی

تلقین فرمائی جو زنا تک پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوا کرتے ہیں۔

تقریر ختم ہونے کے بعد ایک صاحب نے اپنے چند بے تکلف ساتھیوں سے کہا خدا کا شکر ہے کہ ہم زنا جیسی ناپاک حرکت سے محفوظ ہیں اور ہمیشہ انشاء اللہ محفوظ رہیں گے ـــــ بلکہ کبھی زنا جیسے مردود گناہ کا ارادہ بھی نہیں کرینگے۔

یہ بات انھوں نے سینہ پھلا کر کہی تھی۔ ان کے لب و لہجہ سے خناس دپندار ٹپک رہا تھا۔ ان کے ساتھیوں کو بڑا تعجب ہوا۔ کچھ تفتیش تحقیقات شروع ہوئیں اور بالآخر یہ واضح ہو گیا کہ وہ صاحب قطعاً نامرد ہیں۔ ان کے اندر رجولیت سرے ہی نہیں کہ وہ کسی عورت کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کر سکیں۔

اب آپ ہی بتائیے کہ کیا ایسا شخص تعریف و ستائش کا مستحق ہو سکتا ہے۔ کیا ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ اس نے خدا سے ڈر کر بدکاری سے اجتناب کیا ہے۔

نہیں ہرگز نہیں۔ یہ شخص قابل تعریف تو اس وقت قرار دیا جاتا جب اس کے اندر زنا کی اہلیت ہوتی اور اس کے باوجود یہ گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا اور زنا سے محفوظ رہ کر دکھاتا۔

علمائے دیوبند کی گفتگو کا حاصل بھی بس یہی ہے وہ وہ فرماتے ہیں کہ خدا خیر و شر پر قادر ہے وہ شر کا ارتکاب کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے لیکن اس قدرت و اہلیت کے باوجود اس نے کبھی نہ برائیوں کا ارتکاب کیا اور نہ ہی کذب بیانی سے کام لیا ـــ اس لئے علمائے دیوبند خدا کی عظمت اور بڑائی میں چار چاند لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ بریلوی حضرات بات کی تہہ تک نہیں پہونچ پاتے اس لئے اس قسم کی باتیں سُنکر پرشور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ علمائے دیوبند خدا کی توہین کر رہے ہیں۔ علمائے دیوبند رسولؐ کی عظمت کے قائل نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر کہنے کا بھی واحد مقصد یہی ہے کہ انھیں نور کی مخلوق ماننے کے بعد ان کی وہ رفعت اور عظمت باقی نہیں رہ سکتی جو انھیں پیکرِ خاکی تسلیم کرنے کے بعد باقی رہتی ہے۔

بلاشبہ فرشتے نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم اور اختلاف سے بری ہے کہ ان کی ذات سے خطاؤں کا صدور ممکن نہیں۔ لیکن کیا فرشتوں کا خطاؤں سے محفوظ رہنا قابل تحسین قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

ظاہر ہے کہ نہیں اور بالکل نہیں۔ فرشتوں کے اندر سرے سے وہ مادہ ہی نہیں ہوتا جو خطاؤں پر اکساتا ہے وہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی جس کا سہارا لے کر گناہ کئے جاتے ہیں۔ پھر بھلا فرشتوں کا خطاؤں سے دامن بچا لینا کیا کمال کی بات ہوئی۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نور کی مخلوق تسلیم کر لیا جائے تو بلاشبہ ان کی فطری عظمت و رفعت کو گھٹا دینے کے مرادف ہوگا۔ اس لئے کہ نور کی مخلوق میں گناہ کرنے کی اہلیت موجود نہیں ہوتی اور اہلیتِ گناہ کی عدم موجودگی میں گناہوں سے راہِ فرار اختیار کر لینا نہ لائق داد و تحسین ہے نہ قابلِ واہ واہ۔

کمال تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیکرِ خاکی تھے۔ انسان تھے۔ انسانوں میں پیدا ہوئے۔ انسانوں میں پلے بڑھے اور وہ تمام فطری تقاضے بھی آپ کی ذاتِ گرامی میں پائے جاتے تھے جو ہر انسان کے خمیر میں پیوست ہیں گناہ کرنے کی صلاحیت بھی آپ کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اس کے باوجود آپ نے زندگی بھر کوئی گناہ نہیں کیا خدا کی نافرمانی نہیں کی۔ کسی جرم و خطا کے قریب تک نہیں گئے۔

ہر دانش مند آدمی غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ دیوبندی حضرات نے خدا اور اس کے رسولؐ کو ہر خیر و شر پر قادر مانکر ان کی عظمت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے اور بریلوی حضرات انھیں گناہ و خطا کے معاملہ میں مجبورِ محض تصور کر کے ان کو ان کے اصلی مقام سے گرانے کی سعی نامشکور کا مظاہرہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں:

خط کشیدہ عبارت پڑھ کر بڑا تعجب ہوا۔ کس قدر

احمقانہ تصور ہے۔ کیسی مہمل بات ہے۔ زید جھوٹ بول سکتا ہے۔ زنا کرنے پر قادر ہے۔ چوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ قتل جیسا بدترین جرم کرنے کی اہلیت بھی اسکے اندر موجود ہے لیکن وہ ان گناہوں میں سے کبھی کسی گناہ کے قریب بھی نہیں پھٹکا۔ کبھی گناہ کرنے کا ارادہ تک نہیں کرتا۔ لیکن ہے وہ عیب دار۔ اس لئے کہ مذکورہ بالا تمام گناہ عیوب کی فہرست میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے ارتکاب و صدور کی اہلیت بہرحال زید کے اندر پائی جارہی ہے۔ ارے بھئی زید کو عیب دار کہنا تو اسی وقت درست ہوگا جب وہ کسی جرم و خطا کا ارتکاب کرے محض جرم و خطا کرنے کی صلاحیت کسی کو عیب دار نہیں بناتی۔

انبیاء کے اندر جھوٹ بولنے کی اہلیت پائی جاتی تھی ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ جھوٹ بولنا بعض اوقات جائز بلکہ ضروری بھی ہوجاتا ہو لیکن جھوٹ ہے تو بہرحال جھوٹ ہی۔ اسے کوئی دوسرا نام تو نہیں دیا جاسکتا ——— ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو تین جھوٹ بولے تھے انھیں تاویلات کا سہارا لیکر آپ کسی بھی خانہ میں رکھئے لیکن یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ انبیاء کے اندر جھوٹ بولنے کی استعداد موجود ہے۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں۔ اس لئے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جھوٹ قرآن حکیم میں ذکر کئے گئے ہیں۔ اور اقرار کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ انبیاء بھی نعوذ باللہ عیب دار تھے اس لئے کہ جھوٹ ایک عیب ہے اور انبیاء میں جھوٹ بولنے اور کذب بیانی کرنے کی استعداد پائی جاتی تھی۔

لوگ زبان درازی کرتے وقت یہ سوچنا تک گوارہ نہیں کرتے کہ ان کے سنگین الفاظ کی ضرب کہاں کہاں اور کس کس پر پڑے گی۔

شاید ایسے لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ اسی فیصد لوگ زبان کی وجہ سے دوزخ کا ایندھن بنیں گے ——— آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ دل اور زبان اگر درست ہوجائیں تو پورا انسان درست ہوجاتا ہے اور اگر یہ دونوں بگڑ جائیں تو پورا انسان بگڑ جاتا ہے۔ پورے جسم میں فساد اور برائی پھیل جاتی ہے ——— اللہ زبان پر کنٹرول رکھنے کی طاقت اور توفیق عطا فرمائے۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا کو خیر و شر پر قادر ماننے والوں کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی وہ بدترین قسم کے مشرک ہیں ان کے بارے میں اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں۔ اس کے دماغ کی چولیں ڈھیلی ہیں۔ وہ انتہائی درجہ کا احمق اور اجہل واقع ہوا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ ایسے سرپھرے لوگوں سے الجھتے کیوں ہیں۔ کیوں ان کے ساتھ مغز زنی کرکے اپنی عمر عزیز کے چند قیمتی لمحات ضائع کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر سر راہ ٹکرا جائیں تو صحابہ کرام کی تقلید کرتے ہوئے "السلام علیکم" کہئے اور اپنی راہ لیجئے ——— اسی میں خیر و سلامتی ہے۔

آپ کا سوال بے حد طویل تھا مصلحتاً ہم نے اسے حذف کردیا ہے۔ آئندہ سوالات ارسال کرتے وقت اختصار کو پیش نظر رکھیں۔

ایک واہی روایت

سوال ۴:- از سکندر اعظم۔ ۴۴۔ کلکتہ۔

یہاں کچھ دنوں سے ایک نام نہاد ملا مجلس سیرت و میلاد میں بڑی خرافات بکتا ہے۔ اس میں ایک یہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ کی نسبت ایک روز کہنے لگا کہ حضور ﷺ نے اپنا پیشاب ایک شخص کو دیا کہ اسے پھینک دو، وہ اسے پی گیا۔ سرکار ﷺ نے اس سے دریافت کیا کہ تونے پیشاب کا کیا کیا۔ اس شخص نے کہا کہ میں اسے پی گیا۔ سرکار دو عالم نے فرمایا تمہارے پیٹ میں کبھی کوئی بیماری نہ ہوگی۔

کیا یہ واقعہ صحیح ہے۔ یہاں سنجیدہ لوگوں میں کہا جارہا ہے یہ سرکار پر اتہام ہے۔ ملا قابل سزا ہے۔ بستی میں ہنگامہ آرائی کا خدشہ ہے ——

خدارا آپ اپنے جریدے کی قریبی اشاعت میں اظہار

خیال فرمائیں۔

الجواب:۔

آپ نے مقرر صاحب کے بارے میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے وہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ آپ کو مقرر صاحب سے کسی قسم کی کد اور عداوت ضرور ہے۔ ورنہ اتنے گھٹیا اور توہین آمیز الفاظ میں گفتگو کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ زبان کی شائستگی اور طرز گفتگو شریف اور غیر شریف آدمیوں کو پہچاننے کی بہترین کسوٹی گردانی گئی ہے۔ ایک شریف آدمی کا لب و لہجہ غیر شریف آدمی کے لب و لہجہ سے یقیناً جدا اور ممتاز ہوتا ہے۔

مقرر کی غلطی پر پیچ و تاب کھا کر آپ کا اپنی شرافت اور سنجیدگی کا گلا گھونٹ دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔

ہمیں آپ کا لب و لہجہ قطعاً پسند نہیں آیا۔ آئندہ اس انداز میں کسی کے بارے میں بھی گفتگو کرنے سے احتراز کیجئے اور دوسروں کی خامیوں پر گرفت کرتے وقت خود ناسمجھی کا مظاہرہ مت کیجئے اور اس سطح پر مت اتریئے کہ جہاں تہذیب اور غیر مہذب میں کسی قسم کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

بلاشبہ مولوی صاحب نے کذب بیانی سے کام لیا۔ ذخیرۂ احادیث میں اس قسم کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی واہیات باتیں کرنے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست توہین ہوتی ہے نہ جانے لوگوں کو کیا ہوتا جا رہا ہے وہ ہذیان بکتے وقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط اور جھوٹی باتیں منسوب کرتے وقت خدا کے عذاب اور احتساب آخرت سے کیوں بے خوف اور بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔

لوگوں کا کہنا درست ہے۔ واقعتاً مولوی صاحب سزا پانے کے مستحق ہیں۔ عوام کی طرف سے انھیں ضرور سزا ملنی چاہئے۔ لیکن سزا دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ انھیں کسی پہاڑ سے دھکا دیدیں یا چوراہے پر کھڑا کرکے گولی مار دیں یا کھٹ سے ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیں۔

ہمارے خیال میں مولوی صاحب کے لئے یہ سزا کافی ہے کہ ان کی تقریر پر پابندی لگادی جائے جب تک عوام اس بات کا تہیہ نہیں کریں گے کہ ان حضرات کی تقاریر سننے سے مطلقاً پرہیز کیا جائے جو من گھڑت باتیں ہانکتے ہیں اس وقت تک تیسرے درجہ کے واعظین افسانے اور کہانیاں بیان کرنے سے باز نہیں آسکتے۔

چونکہ عوام کو عجیب و غریب باتیں سننے میں مزا آتا ہے اس لئے مقررین حضرات نے عجیب و غریب باتیں بنانے کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے ان کا مقصد صرف عوام کو خوش کرنا ہوتا ہے خواہ عوام کو خوش کرنے کے نتیجہ میں اپنی آخرت ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے عوام خوش نہیں ہوں گے تو اپنا اپنا پیٹ کیسے سیدھا ہوگا۔ جیب کیسے بھرے گی۔

آپ اپنے دوستوں کی رفاقت سے ایک انجمن بنایئے اور سب مل کر یہ فیصلہ کیجئے کہ غیر مستند مولویوں کا وعظ نہیں سنا جائے گا اور ان حضرات کو تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، جن کی زبان خانہ ساز اور من گھڑت روایات بیان کرنے کی خوگر ہو چکی ہے۔

جب تک غیر ذمہ دار واعظین پر پابندیاں عائد نہیں کی جائیں گی اس وقت تک غیر ذمہ دار واعظین کو اپنی شرارتوں کا احساس نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ اپنے کرتوت پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارہ کریں گے۔

خدا کے ضبط و تحمل پر حیرت

سوال ۵:۔ از:۔ غلام عمر صاحب۔ ورنگل۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے ہیں تو خدا کے گھر (مسجد) کی زیادہ بے حرمتی کی جاتی ہے اس کے برعکس درگاہوں جیسے مقام پر اس طرح کی حرکات دیکھنے میں نہیں آتیں۔

اب یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کس طرح اپنے پاک گھر کی بے حرمتی گوارہ کر لیتا ہے ـــ ؟

الجواب ۵:۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کفار و مشرکین کی نگاہوں میں

مساجد بھار کی طرح کھٹکتی ہیں، نہ کہ درگاہیں۔ لہٰذا تکرار و فساد کے موقع پر وہ اپنے من کی بھڑاس نکالنے کے لئے مساجد کی توہین اور بے حرمتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مساجد کے در و دیوار پر تھوک تھوک کر کے دلی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مساجد کے سامنے ننگی جہالت اور فحش قسم کی اظہار عداوت کرتے میں انھیں مزا آتا ہے۔

درگاہوں سے انھیں کوئی دشمنی نہیں ہوتی۔ درگاہوں کے بارے میں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہاں وحدہٗ لاشریک لہ کی پرستش نہیں ہوا کرتی بلکہ اصحاب قبور کی پوجا کی جاتی ہے بزرگوں سے بھیک مانگی جاتی ہے۔ غیر اللہ کے سامنے پیشانیاں گھسی جاتی ہیں۔

اور یہی سب کچھ مندروں اور صنم خانوں میں ہوتا ہے پھر بھلا درگاہوں سے انھیں کیوں بیر ہو سکتا ہے۔ ان سے درگاہوں کی توہین اور بے حرمتی کرنے کا جرم کیوں اور کیسے سرزد ہو سکتا ہے انھیں تو دشمنی و عداوت سے ہے۔ شرک سے نہیں۔ عبادت گاہوں سے ہے صنم خانوں سے نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء کی توہین و تکذیب کی جاتی رہی خدا دیکھتا رہا۔ اہل ایمان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے رہے خدا دیکھتا رہا۔ بیت المقدس پر یہودیوں نے قبضہ جما لیا۔ خدا دیکھتا رہا۔ دشمنانِ اسلام، اسلام اور اسلام کے پرستاروں کو گزند پہنچاتے رہے، خدا دیکھتا رہا۔ قرآن حکیم کی بے حرمتی اور مساجد کی توہین ہوتی رہی اور خدا یہ بھی دیکھتا رہا ——— آخر کیوں ——— ؟

اس لئے کہ فوراً گرفت کرنا اس کا مزاج نہیں بلکہ تحمل اور برداشت اس کی نمایاں عادت ہے۔ وہ برائیاں کرنے والوں کو ڈھیل دیتا ہے۔ ان کی رسّی دراز کرتا ہے۔ انھیں فوراً ہی کسی عذاب میں گرفتار کر دینے کا عادی نہیں اور نہ ہی یہ اس کے شایانِ شان ہے۔

ہمیں یہ بات اس لئے قابل تعجب معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے اندر دشمنوں کو معاف کرنے اور تحمل و برداشت کرنے کا مادّہ نہیں ہے۔

اگر ہمیں کوئی معمولی درجہ کا نقصان پہنچا دے تو ہم اس کے درپے ہو جاتے ہیں اور موقع ملتے ہی پہلی ہی فرصت میں اس سے انتقام لے لیتے ہیں۔ جب تک اسے کوئی سزا نہیں دے لیتے ہمیں قرار نہیں آتا۔

خدا غفور و رحیم ہے۔ درگزر کرنے والا ہے، گناہوں اور خطاؤں سے صرف نظر کرنا اس کی خاص الخاص صفت ہے۔ رحم و کرم اور عفو و بخشش اس کی ذات کے غیر منفک اجزاء ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ دنیا دار العمل ہے دار الجزاء نہیں یہاں گناہوں کی نقد سزا نہ ملنے کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ خدا غافل ہے، اسے کچھ خبر ہی نہیں۔ اور قیامت کے میدان میں بھی مجرمین اسی طرح سرخرو ہی نظر آئیں گے۔ انھیں کوئی سزا نہیں ملے گی، ان سے کوئی محاسبہ و مواخذہ نہیں ہوگا۔

مساجد کی توہین اور بے حرمتی کرنے والوں کی اگر بروز محشر عزت افزائی ہوئی۔ ان کے گلوں میں بہشتی پھولوں کے گجرے ڈالے گئے۔ انھیں اعلیٰ درجہ کے خلعت عطا کئے گئے تو بے شک یہ حیرتناک بات ہوگی لیکن دنیا میں ایسے لوگوں پر فی الفور عذاب کا نازل نہ ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں، باعث حیرت نہیں۔ تشویشناک نہیں۔

بلکہ مجرمین کی فوری گرفت نہ کرنے پر حیرت کرنا بجائے خود قابل تعجب اور حیرت ناک ہے۔ اور خدا کے رحم و کرم اس کے طریقہ و سنت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

آپ مطمئن رہئے۔ انسانوں کے ایک ایک حرکت کی تصویر بنائی جا رہی ہے۔ ایک ایک عمل نوٹ کیا جا رہا ہے۔ قیامت کے دن ہر برائی اور گناہ کی باز پرس ہوگی۔ آج مساجد کی توہین کرنے کے بعد جو لوگ خدا کی لاٹھی سے بچ گئے ہیں ضروری نہیں کہ کل بھی بچے رہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کے سوال کرنے کا مقصد یہ ہو کہ خدا مجبور محض ہے اس لئے وہ مساجد کا دفاع نہیں کر سکتا اور بزرگانِ دین مختار کل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج تک درگاہوں اور مزاروں کی بے حرمتی نہیں کی گئی ــ بزرگوں کا تصرف مانع رہا۔ اگر خدانخواستہ یہ کفر دکلاس تصور آپ کے ذہن کے کسی گوشہ میں بسا ہوا ہے تو ہمیں

صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ درگاہوں اور مزارات پر طوائفوں کا ناچنا شرک و بدعات کا مظاہرہ کیا تو ہین اور بے حرمتی ہی کے مصداق ہے۔ اگر بزرگان دین اور اصحاب قبور کو ذرا بھی اختیار اور قدرت حاصل ہوتی تو ان کے مزاروں پر رقص و سرود اور گانے بجانے کی محفلیں منعقد نہیں ہوسکتی تھیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ توہین اور بے حرمتی کا شکار صرف مساجد ہی نہیں، بے چاری درگاہیں بھی ہیں۔

اور جس طرح خدا مساجد کی توہین اور بے حرمتی کرنے والوں سے محاسبہ کرے گا، اسی طرح ان حضرات سے بھی پوچھ تاچھ ہوگی جو مزاروں پر ناچ گانوں کی محفلیں سجا کر بزرگان دین کو روحانی اذیت پہنچاتے ہیں اور اس طرح اس کے نیک اور مقرب بندوں کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔

رشوت دینے کا مسئلہ

سوال ۶ :- (ایضاً)

آجکل رشوت دیئے بغیر خود ہمیں اپنا کوئی حق بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً بغیر رشوت دیئے نوکری کا ملنا ناممکن ہے۔ ازروئے شرع بتلائیے کہ کیا بحالت ضرورت رشوت دیکر ہم نوکری حاصل کرسکتے ہیں؟

الجواب ۶ :-

اگر رشوت دیئے بغیر آپ کو اپنا کوئی جائز حق نہیں مل رہا ہے یا رشوت کے بغیر ملازمت کا ملنا مخیل اور ناممکن بنکر رہ گیا ہے تو فقہاء نے رشوت دینے کی اجازت دی ہے۔ کراہیت دل کے ساتھ آپ رشوت دیکر اپنا حق یا ملازمت وغیرہ حاصل کرسکتے ہیں مولانا عامر عثمانی نے بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں رشوت دینے کو جائز قرار دیا ہے۔ وہ تجلی کی ڈاک میں رشوت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

"جہاں تک دینے کا سوال ہے فقہ میں پہلے سے یہ حکم موجود ہے کہ اپنا کوئی حق اگر بغیر رشوت دیئے ملنا دشوار ہو تو بادل ناخواستہ دے لو۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے شدید ضرورت لاحق ہو تو سودی قرض لیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک اچھے نمبروں میں پاس شدہ طالب علم کو کسی کالج کے داخلے سے اس لئے محروم ہونا پڑ رہا ہے کہ وہاں کے ارباب اقتدار راشی ہیں تو کراہت کے ساتھ جائز ہے کہ رشوت دیکر داخلہ لے لیا جائے

(تجلی جولائی اگست ۶۲ء)

بکرے کے خصیوں کا کھانا ناجائز ہے

سوال ۷ :- از عبدالغفور صاحب۔ حیدرآباد۔

بکرے کے خصئے کھانا جائز ہے یا نہیں۔ مقامی بعض علماء خصیوں کے استعمال کو جائز قرار دے رہے ہیں اور بعض علماء مکروہ تحریمی کہتے ہیں۔ کتاب و سنت کی روشنی میں مدلل جواب سے سرفراز فرمائیے۔ نیز عضو تناسل کے استعمال کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب ۷ :-

بکرے کے خصیے (فوطے) کھانا جائز نہیں۔ ہم نے کتنے ہی باشعور حضرات کو یہ کہتے سنا ہے کہ دیوبندی فقہاء کے نزدیک بکرے کے خصیوں کا استعمال جائز ہے حالانکہ یہ بہتان اور الزام تراشی کے سوا کچھ نہیں۔ دیوبندی علماء نے کبھی خصیوں کی حلت کا فتویٰ صادر نہیں فرمایا۔

ہمارا خیال ہے کہ عضو تناسل کا کھانا تو بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

مرہونہ مکان سے انتفاع

سوال ۸ :- (ایضاً)

جو مکان رہن کے طور پر لے رکھا ہو اس میں رہ سکتے ہیں

یا نہیں۔ یہاں پر کچھ لوگ کرایہ پر دینے کو حرام کہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں رہنا بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ شرعی حکم تحریر فرمائیے

الجواب :-

مرہونہ مکان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ فقہاء نے مرہونہ چیز سے فائدہ حاصل کرنے کو سود قرار دیا ہے۔ اور سود حرام ہے۔ گویا کہ رہن میں رکھی ہوئی چیز کو استعمال کرنا بھی سود کے قائم مقام ہو جاتا ہے — جو لوگ مرہونہ مکان میں رہنے کو حرام قرار دے رہے ہیں یا اس سے کسی اور طرح کا فائدہ اٹھانے کو ناجائز بتا رہے ہیں وہ حق پر ہیں۔ ان کی بات مانی جائے۔

خودکشی پر جرمانہ

سوال ۹ :- از کیف احمد صاحب (سردار)

ہمارے یہاں ایک صاحب اپنے صاحبزادے کی شادی کی شادی کے کچھ دنوں بعد صاحبزادے کی ماں کو احساس ہوا کہ بہو کا سایہ منحوس ہے۔ چنانچہ ساس نے بہو کو ستانا شروع کر دیا۔ لڑکی نے روز روز کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا پروگرام بنایا عین وقت پر گھر والوں نے دیکھ لیا۔ فوراً اس کے گلے سے رسی کاٹی گئی اور اسے اس کے میکے پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد قاضی کی موجودگی میں تحریری طور پر طلاق دیدی گئی۔ لڑکی کے سرپرستوں نے مہر طلب کیا (مہر ایک ہزار روپے ہے) تو قاضی صاحب نے فرمایا کہ پہلے لڑکی کا باپ عدالت میں چار ہزار روپے جمع کرے۔ اس کے بعد اسے ہزار روپے ملیں گے۔ کیونکہ لڑکی نے خودکشی کا ارادہ کیا تھا۔ خودکشی حرام ہے اور اس کا جرمانہ ہزار روپے ہے۔

احقر معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کیا قاضی صاحب نے ٹھیک فیصلہ دیا ہے۔ ہم لوگ کم علم ہونے کی وجہ سے آنجناب کو تکلیف دے رہے ہیں۔

الجواب ۹ :-

بلاشبہ خودکشی کرنا حرام ہے۔ احادیث میں خودکشی کرنے والے کے لئے بڑی وعید آئی ہے اور سخت عذاب کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ حق تعالیٰ خودکشی کرنے والے اور خودکشی کا ارادہ کرنے والے پر اپنا فضل و کرم فرما کر ان کی غلطی کو درگذر کرے۔

کسی لڑکی کے بارے میں یہ تصور دل میں جما لینا کہ یہ منحوس ہے، بدنصیب ہے، تکالیف و مشکلات کا باعث ہے۔ انتہائی درجہ کی جہالت اور بدعقیدگی کی بات ہے۔

لڑکی کا گھریلو حالات سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی طرف قدم اٹھانا بلاشبہ ایک ناقابل مذمت فعل تھا۔ اور اگر وہ خودکشی کر گذرتی تو یقینی طور پر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا قیامت کے دن اس سے بازپرس ہوتی۔ عفو و بخشش تو ایک الگ مسئلہ ہے مگر از روئے قانون لڑکی عذاب و عتاب کی مستحق قرار پاتی۔ لڑکی کے لئے ایک فعل حرام کا مرتکب ہونا باعث توبیخ سہی لیکن وہ حضرات بھی خدا کی ناراضگی اور اس کے قہر و عتاب سے محفوظ نہیں رہ سکتے جن کے طنز و طعن اور زہر آلود الفاظ نے لڑکی کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ خود کو ہلاک کر دے اور اس عذاب سے نجات حاصل کرے تو اس کی گردن حیات کا طوق بنکر رہ گیا تھا۔

طلاق واقع ہونے کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے مہر کا مطالبہ کرنا بالکل بجا ہے۔ لڑکے والوں کو شرافت اور اسلام پسندی کا ثبوت دینا چاہئے اور مہر کی وہ رقم بخوشی ادا کر دینی چاہئے جس کی ادائیگی کی اسلام تاکید کرتا ہے۔

اگر یہ رقم ادا نہیں کی گئی تو لڑکے والے گناہگار ہوں گے اور اگر لڑکی نے حق مہر معاف نہیں کیا تو قیامت کے دن لڑکے والوں کو مصیبت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مہر لڑکے کی طرف ایک قسم کا قرضہ ہے جو بہرحال چکانا پڑے گا اس دنیا میں یا اُس دنیا میں۔

خودکشی کے حرام ہونے میں ریب و شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن خودکشی کرنے والے پر از روئے شریع کسی قسم کا کوئی جرمانہ عائد نہیں ہوتا۔

جو قاضی صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خودکشی کرنے پر

چار ہزار روپے جرمانہ عائد ہوتا ہے تو وہ اعلیٰ درجہ کے جاہل اور لاثانی احمق واقع ہوئے ہیں انھیں کسی عجائب خانہ میں داخل کرا دیجئے تاکہ دنیا بطور عبرت ان کی زیارت سے مشرف ہو سکے۔

دیوانگی کی ایک نئی قسم

سوال :- از شیخ شبیر عثمان صاحب اسلام پورہ۔

ایک صاحب جو بریلوی مکتب خیال کے حامل ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں ایک میت کی تکفین و تدفین کے بعد قبر پر اذان دی ان کا خیال ہے کہ شیطان قبر میں منکر نکیر اور مُردے کو قبر میں فریب دینے کی کوشش کرتا ہے اور مردے کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ مجھے خدا کہہ۔ اذان سنکر شیطان دور بھاگ جاتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ بات حدیث میں مذکور ہے اس سے قبل یہاں کبھی قبر پر اذان نہیں پڑھی گئی۔ آپ سے گذارش ہے کہ اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالیں۔

الجواب :-

شیطان کے کید و مکر صرف اس دنیا ہی میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ آدمی دوسری دنیا میں منتقل ہوتے ہی شیطان کے حدود اختیار اور اس کی دسترس سے باہر ہو جاتا ہے اگر قبر کے اندر شیطان کی رسائی ممکن ہوتی تو اس کے تدارک کے لئے کوئی طریقہ احادیث میں ضرور بیان کیا جاتا۔ کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شیطان قبر کے اندر پہنچکر بھی مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کر سکتا ہے اور اس کے دفع کرنے کے لئے اذان دینا موثر اور مفید ہے۔

جو شخص مردے کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینے کو مفید اور منجملۂ سنت خیال کرتا ہے وہ جہل مرکب میں گرفتار ہے اسے صرف جہل تصور مت کیجئے بلکہ یہ بھی یقین کر لیجئے کہ حماقت اور دیوانگی اس کے دماغ میں اپنا گھر بنا چکی ہے۔

* * *

وراثت کے مسائل

سوال :- از سعیدہ سلطانہ۔ دختر محمد ابراہیم مرحوم جگتیال

محترمی مدیر تجلی! سلام مسنون!!

میرے والد میری کمسنی میں رحلت فرما گئے تھے۔ بچپن کی عمر والدہ اور بڑے بھائی کی سرپرستی میں گذاری۔ میری شادی کے لئے میرے والد نے وصیت کے ذریعہ ایک قطعہ زمین محفوظ کر دیا تھا، چنانچہ اس کو فروخت کرکے میری شادی کی گئی۔ اب جب کہ جائیداد تقسیم ہو رہی ہے تو میرے بڑے بھائی کے مشورہ پر تمام بھائی مجھے محروم وراثت قرار دے رہے ہیں۔ صرف اسلئے کہ جن لڑکیوں کی شادی والد کے گذرنے کے بعد ہوتی ہو وہ تو محروم وراثت قرار پاتے ہیں۔ براہ کرم اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔

مزید برآں حسب ذیل سوالات کا جواب عنایت کریں۔

(الف) یتیم لڑکیوں کی جائیداد کی نگرانی کس کو اور کس طرح کرنی چاہئیے اور کب اس جائیداد کو ان کے حوالے کرنا چاہئے

(ب) کیا سرپرست اخراجات شادی کے عوض وراثت کو تلف کیا جا سکتا ہے۔

(ج) کیا صاحب مال کسی کے حق میں زیادتی اور کسی کے حق میں کمی کی وصیت کر سکتا ہے۔ اگر کوئی اللہ کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کرکے بڑے لڑکے کو زیادہ مال کی اور چھوٹوں کو کم مال کی وصیت کرے تو ایسی وصیت کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

(د) عاق کرنے کا مطلب کیا ہے اور عاق کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اگر کسی نے عاق نامہ تحریر کر دیا تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟۔

(ھ) وراثت کیسے قائم ہوتی ہے اور وارث کو کب جائیداد عطا کر دینی چاہئیے۔ کیا حقوق کے معاملہ میں لڑکا اور لڑکی کی حیثیت برابر نہیں ہے۔ کیا لڑکا اپنی مرضی سے لڑکی کے حقوق تلف کر سکتا ہے۔

الجواب :-

وراثت کے مسائل انتہائی پیچیدہ اور باریکیوں پر مبنی ہوتے

ہیں۔ انھیں سمجھنے اور حل کرنے کے لئے وسیع علم اور گہری نظر اور بے پناہ ذکاوت کی ضرورت ہے۔

ہمیں اپنی کم علمی اور ناواقفی کا اعتراف ہے۔ لہٰذا یہ گزارش کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ ہم وراثت کے بارے میں متیقن طور پر کچھ عرض کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں لب کشائی تو کرنی ہی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ یہ لب کشائی حتمی حیثیت کی حامل قرار نہیں دی جا سکتی۔ اس پر فتوے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اسے بس "اصولی بحث" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ فتویٰ اگر درکار ہو تو اپنے مرحوم والد کے مکمل ترکہ کی ایک فہرست بنا کر اور تمام صورت حال کو قلم بند کر کے دارالعلوم دیوبند کی طرف رجوع کیا جائے یقین ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے فتویٰ حاصل کر لینے کے بعد آپ کے ذہن میں کوئی الجھن باقی رہے گی اور نہ ہی ان حضرات کو آئیں بائیں شائیں کرنے کا حق ہو گا جو آپ کو وراثت سے محروم کرنے کی ٹھانے ہوئے ہیں۔

لیجئے حسب ترتیب اپنے سوالوں کے جواب ملاحظہ فرمائیے :۔

(الف) اگر ماں زندہ ہو تو اسی کو اپنے یتیم بچوں کی جائداد کا نگراں اور محافظ بننا چاہئے۔ بڑے بھائی اور رشتہ دار ان کے دوسرے حضرات بھی یتیموں کی سرپرستی کر سکتے ہیں اور ان کی جائدادوں کے تحفظ کی ذمہ داریاں ان سرپرست حضرات کو سونپی جا سکتی ہیں لیکن محافظین اور نگرانی کرنے والے حضرات کے لئے ضروری ہے کہ دیانتداری اور خوف خدا کو ملحوظ رکھیں۔ ان کی طرف سے کسی بھی قسم کی بددیانتی اور ناانصافی کا مظاہرہ ان کے حق میں ہلاکت و عذاب کا موجب بن سکتا ہے۔ قرآن میں جا بجا اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ یتیموں کے اموال کی حفاظت پوری دیانتداری اور پرہیزگاری کے ساتھ ہونی چاہئے۔ ان کے مالوں میں سے ایک دانہ کے برابر بھی غصب کر لینا یا خواہ مخواہ کسی اور بخشش دینا جائز نہیں بلکہ ایسا کرنا یتیموں کے حق میں صریح ظلم کے مرادف ہے اور اس کی پاداش نارِ جہنم کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔

ہونا یہ چاہئے کہ جب تک بچے بالغ ہوں انکے اموال کی حفاظت کی جائے اور ان کا پیسہ ازراہ ضرورت ان ہی کے مفادات میں خرچ کیا جائے کسی اور مد میں خرچ کرنے کی اجازت نہیں۔ بالغ ہوتے ہی ان کے اموال ان کے حوالے کر دیئے جائیں۔ حق حقدار تک نہ پہنچانا کتنا قبیح گناہ ہے یہ بات کم از کم ان حضرات سے پوشیدہ نہیں ہو گی جو وقتاً فوقتاً قرآن حکیم کے ترجمہ کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔

(ب) اگر لڑکی کی شادی پر وہ ہی روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے جو ورثہ کے طور پر اس کے نام پر جمع ہے تو بلا شبہ جائداد کی تقسیم کے وقت لڑکی کے حصہ میں سے اتنی رقم کاٹ لی جائے گی جتنی شادی کے مصارف میں خرچ ہو چکی ہے۔

لیکن اس کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ روپیہ خرچ کرنے سے پہلے لڑکی سے باقاعدہ اجازت لے لی جائے۔ اس بارے میں لڑکی کی خاموشی کو رضامندی کے قائم مقام نہیں سمجھا جائے گا بلکہ لڑکی کو بالفاظ صریح ہاں یا نا کرنی ہو گی اگر اس نے انکار کر دیا تو پھر اس کے حصہ میں سے شادی کے لوازمات پر خرچ کرنا جائز نہیں ہو گا۔

بعض یتیموں کے کفیل اور سرپرست لوگ دنیا پر تو یہ رعب جماتے ہیں کہ یتیم کی بچی کی شادی ہم نے کی۔ جملہ اخراجات و مصارف ہم نے برداشت کئے، جہیز وغیرہ کی فراہمی کے لئے ہمیں اپنی جیبیں ہلکی کرنی پڑیں اور لڑکی پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تمہاری شادی پر جو بھی خرچ کیا جا رہا ہے تمہارے ہی ورثہ میں سے کیا جا رہا ہے۔ تقسیم وراثت کے وقت اتنی اتنی رقم تم سے وصول کر لی جائے گی۔ یہ طریقہ بدترین جرم اور گھٹیا درجہ کی نافرمانی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر کسی یتیم لڑکی کی شادی کے وقت سرپرست حضرات نے جہیز وغیرہ کا بندوبست کر دیا اور کچھ دوسرے لوازمات بھی اپنی جیب سے پورے کر دیئے تو اسے تبرع اور احسان پر محمول کیا جائے گا۔ بلاشبہ یہ اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے لیکن یتیم بچوں کی شادی وغیرہ پر روپیہ خرچ کرنے کے بعد ان سے

توریثی حصّوں میں سے اپنی خرچ شدہ رقم کی کٹوتی کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔

(ج) ابتدائے اسلام میں بذریعۂ وصیت تقسیم جائداد کی کھلی اجازت تھی یعنی صاحب جائداد اپنی مرضی سے اپنے تمام مال کو تقسیم کرنے کا مکمل استحقاق رکھتا تھا، اسے اس بات کا مکمل اختیار حاصل ہوا کرتا تھا کہ وہ اپنے ورثاء میں سے کسی کو زیادہ دے کسی کو کم، کسی کو اپنی ساری جائداد کا مالک بنا دے اور کسی کو ایک کوڑی بھی نہ دے۔ لیکن بعد میں اس اجازت کو منسوخ قرار دیا گیا اور حق تعالیٰ نے خود ہی اپنی صوابدید سے ورثاء کے حصّے متعین فرما دئیے۔ اب صاحبِ جائداد کو اس بات کا قطعًا حق حاصل نہیں ہے کہ وارثوں کے حصہ میں بذریعۂ وصیت کمی بیشی کر سکے۔ اگر کوئی شخص اپنے پس ماندگان کے حصوں میں تحریرًا یا تقریرًا کمی اور زیادتی کی وصیت کرے گا تو وہ وصیت ناقابلِ اعتبار سمجھی جائے گی پس ماندگان میں سے بڑے اور چھوٹے کے درمیان کسی قسم کی کوئی تفریق قائم نہیں کی جا سکتی۔ سب کی حیثیت مساوی سمجھی جائے گی اور تقسیم وراثت کے وقت عمروں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ نہ ہی بڑے وارثوں کو اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ چھوٹے وارثوں کے حصوں میں دخل اندازی کریں۔ تمام ورثاء کے درمیان خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے مساوی طور پر وراثت تقسیم ہوگی۔

(د) عاق کرنے کا سیدھا سادا مطلب ہوتا ہے محروم کر دینا۔ بعض لوگ اپنی نافرمان اولاد کے بارے میں "عاق نامہ" تحریر کر جاتے ہیں یعنی تحریری طور پر یہ وصیت کر جاتے ہیں کہ میں اپنے فلاں لڑکے کو از خود محروم وراثت قرار دے رہا ہوں۔ لہٰذا اسے ایک دمڑی دینے کی ضرورت نہیں۔ اس صورت کو شریعت نے جائز قرار نہیں دیا۔ اولاد کتنی بھی نافرمان اور بدکردار کیوں نہ ہو اسے وراثت سے محروم نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کوئی شخص اپنے کسی لڑکے کے بارے میں کوئی عاق نامہ تحریر کر جائے اور صراحت کے ساتھ تحریر کر دے کہ میرے فلاں لڑکے کو کوئی پیسہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے عاق (محروم) کر چکا ہوں تو شریعت کی رو سے اس وصیت اور تحریر کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور جائداد کی تقسیم کے وقت اس نافرمان لڑکے کو بھی اتنا حصہ دیا جائے گا جتنا حصہ فرمانبردار اولاد کے نصیب میں آ رہا ہے۔

کسی کے بارے میں عاق نامہ لکھنا اور اسے وراثت سے محروم کر دینے کی کوشش کرنا سراسر ان حدود کی خلاف ورزی ہے جو بنفسِ نفیس حق تعالیٰ نے قائم کئے ہیں۔ اور جن سے متجاوز ہونے والے کو دائمی عذاب کی بشارت سنائی گئی ہے۔

عاق نامہ کا چونکہ کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اور وراثت کی تقسیم کے وقت شریعت اس بیٹے کو وراثت کا حق دار گردانتی ہے اس لئے عاق نامہ تحریر کرنے کی حیثیت گناہ بے لذت سے زیادہ نہیں۔

(ھ) صاحبِ جائداد کے فوت ہوتے ہی ورثاء کو وراثت کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ احتیاط اور پرہیزگاری کا تقاضا تو یہ ہے کہ صاحبِ جائداد کے مرتے ہی وراثت بانٹ دی جائے۔ لیکن اگر کسی مصلحت یا مجبوری کے پیشِ نظر فوری طور پر وراثت کا انقسام ممکن یا مناسب نہ ہو تو چند ماہ بعد بلکہ چند سال بعد بھی وراثت تقسیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لڑکے کو قطعًا اس بات کا حق و اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنی کسی بہن کے حصے کو تلف کر ڈالے اور بہن کو اس کے واجبی حق سے محروم کر دے۔ البتہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان یہ فرق خود قرآن حکیم کا قائم کردہ ہے کہ لڑکی کو جتنی رقم سونپی جائے گی لڑکا اس سے دوگنی رقم کا حقدار ہے گا۔ لڑکی کے حصّے میں دس روپے آ رہے ہیں تو لڑکا بلاشبہ بیس روپے کا حقدار قرار پائے گا۔

اس بارے میں تردد اور اعتراض کی گنجائش اس لئے نہیں کہ یہ تفریق گوناگوں مصلحتوں کے پیشِ نظر حق تعالیٰ نے فرمائی ہے اور حق تعالیٰ کا ہر فیصلہ کم از کم مسلمانوں کے نزدیک شکوک اور اعتراض سے بالاتر ہونا چاہئے۔

حاصل یہ نکلا کہ یتیموں کے مال کی دیکھ بھال پورے اتقا اور دیانت داری کے ساتھ کی جائے اور جب وہ سنِ بلوغ

تک پہونچ جائیں ان کی جائداد ان کے حوالے کردی جائے سرپرستی کے عوض وراثت ہڑپ کرلینا صرف اسلامی ہی نقطۂ نظر سے ناجائز نہیں بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے بھی معیوب اور اخلاق و شرافت کے منافی ہے۔

جو رقم شادی کے اخراجات میں کھپا دی گئی ہے، یہ وارث سے وصول کی جاسکتی ہے لیکن اس کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ شادی میں روپیہ خرچ کرنے سے پہلے لڑکی سے باقاعدہ زبانی اجازت لے لی گئی ہو۔ صرف خاموشی کو اجازت نہ سمجھا جائے۔ زبان سے اقرار وا نکار کرایا جائے۔ اگر وہ خوشی سے بہ الفاظ صریح اس بات کی اجازت دیدے کہ میری شادی میں جو روپیہ خرچ ہوگا وہ میرے واجبی حصہ میں سے نکال لیا جائے یا فی الوقت اپنی جیب سے خرچ کردیا جائے اور تقسیم وراثت کے وقت مجھ سے وصول کرلیا جائے تو پھر اس کے حصہ میں سے اتنی رقم کی کٹوتی کرلینا جتنی شادی کی ضروریات میں کھپ گئی ہے جائز ہے۔ البتہ لڑکی کی اجازت لئے بغیر اس کے حصہ میں سے اسی کی شادی میں کچھ خرچ کرنا جائز نہیں۔ اگر کسی نے اپنی جیب سے روپیہ خرچ کرکے شادی کی ضرورتیں پوری کردیں تو اسے تبرع اور احسان پر محمول کیا جائے گا اور لڑکی کی وراثت میں کٹوتی کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ احسان تو ایک نیکی ہے اور نیکی کی جزا خدا دیتا ہے۔ نیکی کی قیمت بندوں سے وصول کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔

ایک بات یہ بھی ذہن نشین کرلیجئے کہ اگرچہ لڑکی کی اجازت لینے کے بعد اس کی وراثت کو اس کی شادی میں خرچ کیا جاسکتا ہے لیکن سرپرست حضرات کے لئے یہ ذلت و عار کی بات ہے سرپرست حضرات کے لئے مناسب ترین اور قابلِ تحسین طریقہ یہ ہے کہ یتیموں کی شادیاں وغیرہ اپنا پیسہ خرچ کرکے کی جائیں اور ان کی جائداد بہرصورت انھیں پوری پوری دیدی جائے۔ اور اپنی نیکیوں اور احسانات کا صلہ صرف اور صرف خدا سے طلب کیا جائے۔

صاحب جائداد اپنے کسی وارث کو محروم کردینے کا مجاز نہیں ہوتا۔ اگر کسی نے عاق نامہ تحریر کر بھی دیا تو اس عاق نامہ کو کوئی وقعت نہیں دی جائے گی۔ وراثت کی تقسیم مساوی طور پر ہوگی ان ورثاء کو بھی وراثت عطا کی جائے گی جو مرحوم کو محبوب تھے اور ان ورثاء کو بھی عطا کی جائے گی جو قطعًا نافرمان تھے اور مرحوم کو ان سے شدید نفرت تھی۔

یہ کہنا کہ جن لڑکیوں کی شادی والد کے مرنے کے بعد ہوئی ہو وہ محروم وراثت سمجھی جاتی ہیں، دھاندلی کے سوا کچھ نہیں۔

یہ ضروری بات بھی نوٹ کرلیجئے کہ چونکہ وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔ لہٰذا آپ کے والد مرحوم نے بذریعہ وصیت جو زمین کا ٹکڑا آپ کے نام کردیا تھا وہ صرف آپ کا تصور نہیں کیا جاسکتا، وہ تمام وارثین کا حصہ ہے۔ آپ کے والد صاحب کی وصیت ناقابلِ اعتبار سمجھی جائے گی۔ اگر اس حصہ کو فروخت کرنے کے بعد آپ کی شادی کی گئی ہے تو تقسیم وراثت کے وقت آپ کے حصہ میں سے اتنا روپیہ کاٹ لیا جائے گا جتنا اس قطعۂ زمین کو فروخت کرنے کے بعد حاصل ہوا تھا۔

شریعت نے صاحبِ مال کو اس بات کا حق دیا ہے کہ وہ اپنے کل مال میں سے ⅓ حصہ کو بذریعہ وصیت کسی کے حوالہ کرسکتا ہے۔ ایک تہائی مال میں اس کی وصیت قابلِ اعتبار اور قابلِ قبول تصور کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کے پاس اپنی وفات کے وقت چھ ہزار روپے ہیں، وہ دو ہزار روپوں کے بارے میں وصیت کرنا چاہتا ہے تو اس کو شرعی طور پر اس بات کا حق اور اختیار حاصل ہے۔ اور اس کی یہ وصیت بہرحال قابلِ نفاذ قرار پائے گی۔ دو ہزار روپے اس کی وصیت کے مطابق تقسیم ہوں گے اور چار ہزار شریعت کے بتلائے ہوئے حصوں کے مطابق بانٹے جائیں گے۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ صاحبِ مال ⅓ حصہ کے بارے میں جو وصیت کررہا ہے وہ کسی شرعی وارث کے

حق میں نہیں ہونی چاہیئے بلکہ یہ وصیت ایسے شخص کے لئے کیجاتی چاہیئے جو شرعی طور پر اس کا وارث نہیں بن سکتا۔

بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو حق وراثت نہیں پہنچتا لہٰذا اگر یہ وصیت کی جائے کہ آپ کے مال کا ایک تہائی حصہ میرے پوتے کو سونپ دیا جائے تو درست ہوگا۔ اور وراثت تقسیم کرنے وقت چھ ہزار میں سے دو ہزار پوتے کے حوالے کئے جائیں گے، بعدہٗ دوسرے ورثاء کو حسب دستور حصے دیئے جائیں گے۔

آپ کے والد نے دو شادیاں کی تھیں اور انکی وفات کے وقت دونوں بیویاں بقید حیات تھیں۔ لہٰذا تقسیم وراثت کے وقت ⅛ حصہ برابر برابر دونوں بیویوں میں تقسیم کیا جائے۔ اگر بعد میں کسی ایک بیوی کا انتقال ہوگیا ہو تو اس کا حصہ اس کی سگی اولاد کے حوالے کر دیا جائے۔ بیویوں کے علاوہ تمام اولاد کے مابین بھی قرآن کے مقرر کردہ حصوں کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے۔ یعنی لڑکیوں کے حصہ میں جو کچھ آرہا ہو لڑکوں کو اس سے دوگنا دیا جائے اور چونکہ آپ اپنے والد کی شرعی طور پر وارث ہیں۔ لہٰذا آپ کے حق میں آپ کے والد کی وصیت ناقابل اعتبار تصور کیجائیگی اور اتنی رقم آپ کے حصہ میں سے کاٹ لی جائے گی جتنی اس قطعۂ زمین کو فروخت کرنے کے بعد ہاتھ آئی تھی جو غیر شرعی طور پر آپ کے نام پر وقف کر دیا گیا تھا۔ واللہ اعلم۔

وہ جوابات جنکے سوالات حذف کر دیئے گئے

واقعۂ فیل

معتبر اور معتمد مفسرین نے لکھا ہے کہ واقعۂ فیل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے دو ماہ قبل پیش آیا تھا۔ اگر کوئی شخص مفسرین کی اس تحقیق کی مخالفت کرے تو دلائل کے ڈھیر لگانے جا سکتے ہیں لیکن خواہ مخواہ کاغذ سیاہ کرنے سے کیا حاصل۔

⁂ ⁂ ⁂

آفتاب مغرب سے کیوں طلوع ہوتا ہے؟

میرے بھائی آفتاب مغرب سے نہیں مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ میں آپ کے اس سوال کو مضحکہ خیز اور حماقت آمیز اس لئے قرار نہیں دے سکتا کہ ممکن ہے آپ کے سوال کرنے کا مقصد یہ رہا ہو کہ قیامت سے قبل آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے کیوں طلوع ہوگا۔ صرف گمان نہیں بلکہ یقین ہے کہ آپ نے یہی پوچھنا چاہا ہوگا۔ غلطی سے برعکس جملہ قلم سے نکل گیا۔

یہ کیوں تو بڑی خطرناک بیماری ہے۔ اول تو اس قسم کی نازک باتوں کی وجہ اور حقیقت بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اگر کھینچ تان کر کوئی مطمئن کن وجہ آپ کو بتا دی جائے تو کیا سند ہے آپ آئندہ اس کیوں کے چکر میں نہیں پڑیں گے بلکہ عقل اور تجربات یہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کو اس کی صحیح وجہ سے روشناس کرا دیا گیا تو آپ کل دوسرے پیچیدہ حقائق اور حل نہ ہونے والی باریکیوں کے بارے میں باقاعدہ تحقیقات شروع کر دیں گے۔ اور پھر ہر حقیقت کے بارے میں یہی ہوا کرے گا کہ یہ کیوں ہوتا ہے۔ وہ کیوں ہوا تھا۔ ایسا کیوں ہوگا۔؟

مرد کو چار شادیوں کی اجازت کیوں دی گئی۔ وراثت میں عورت کو نصف حصہ کیوں دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ دوبارہ کیوں پیدا کئے جائیں گے۔ عورت نازک اندام کیوں بنائی گئی ہے۔ مرد کو حیض کیوں نہیں آتا۔

بتائیے اس لفظ کیوں کی منتہا کیا ہے؟ اگر کوئی منتہا نہیں تو پھر اس کے چکر میں مت پڑیئے۔ ورنہ دل و دماغ الجھ کر رہ جائیں گے اور نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔

(تنبیہ)

ایک مرتبہ میں تین سوال سے زائد ارسال مت کیجئے سوالات کا خوشخط اور مختصر ہونا ضروری ہے

(ایڈیٹر)

پچھلے دنوں حکومت ہند نے جن جماعتوں اور تنظیموں پر پابندی عائد کی ہے ان میں آر. ایس. ایس اور آنند مارگ جیسی انتہا پسند اور فاشسٹ جماعتیں بھی شامل ہیں ــــ اندرون ملک ان جماعتوں کی تمام سرگرمیاں غیر قانونی قرار دیدی گئی ہیں۔ ان سے وابستہ افراد گرفتار کرلئے گئے ہیں دفاتر سربمہر ہیں۔

جو لوگ آر. ایس. ایس اور آنند مارگ جیسی تنظیموں سے واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ یہ تنظیمیں روز ازل سے غیر قانونی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھیں۔ اگرچہ ان جماعتوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ محض ثقافتی اور سماجی ادارے ہیں۔ اور یہاں سماج کی بھلائی اور شانتی کے لئے کام کر رہے ہیں یہ دعویٰ کس قدر گمراہ کن اور کتنا غلط تھا۔ آئینہ الی ہر صبح اس کے خلاف دلائل فراہم کرتی تھی۔ جہاں کہیں بھی فرقہ دارانہ فساد ہوتا۔ آگ لگائی جاتی، حملے کئے جاتے، گھر تباہ کئے جاتے، آبروئیں لوٹی جاتیں، وہاں ان جماعتوں کے چہرے ضرور نظر آتے تھے۔ مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کھلی وحشت انگیزی اور انتہا پسندی کے باوجود حکومت انھیں نظر انداز کرنے رہنے کی مسلسل پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سنجیدہ طبقوں کی طرف سے اس رجحان پر ہمیشہ تشویش بے چینی اور اضطراب کا اظہار کیا جاتا رہا۔ مگر حکومت نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر خاموش رہی اور اس نے انھیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ بہرحال اب قدم اٹھالیا گیا ہے توقع رکھنی چاہئے کہ یہ اقدام دیرپا ثابت ہوگا۔ اور دوبارہ ان انتہا پسندوں کو چھوٹ نہیں دی جائے گی۔

آر. ایس. ایس کا قیام ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے۔ یہ جماعت فرقہ وارانہ فسادات سے متأثر ہو کر قائم کی گئی تھی۔ ایک مخصوص طبقے کے مفادات اور ایک مخصوص تہذیب کی حفاظت اس کے مقاصد میں شامل تھی بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس جماعت کو ایسے رہنما ملے جو اپنے ذہن، اپنے مزاج، اپنے طرز فکر اور اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے ہندوستان جیسے جمہوری ملک کے لئے انتہائی غیر موزوں تھے جماعت کے پہلے سربراہ اور بانی ڈاکٹر کے. آر. ہیڈگوار کے انتقال کے بعد مسٹر گول والکر نے اس کی قیادت سنبھالی انھوں نے آر. ایس. ایس کو ایک نیم فوجی تنظیم بنا دیا اور فرقہ دارانہ ہنگاموں میں اس کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں۔ اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے افراد کی جسمانی اور ذہنی پرورش

ایک مخصوص نظام کے تحت کی جانے لگی۔ تنظیمی اسکولوں میں نفرت انگیز نصاب پڑھایا جانے لگا۔ یہ سرگرمیاں بڑے عرصہ سے جاری تھیں۔ قریب تھا کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے مسز گاندھی کے بروقت اقدام نے ملک کو ایک انتہائی خوفناک موڑ سے بچا لیا ہے۔

آنند مارگ بھی امن، شانتی اور سماج کی اصلاح کے نام پر ہوئی تھی۔ مگر بہت جلد یہ بھی کھل سامنے آگئی اور اس کی خوفناک سرگرمیوں کا راز فاش ہو گیا۔ اس جماعت کا قیام اگرچہ ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ ہوا ہے۔ مگر ۱۹۷۱ء میں شہرت اس وقت ملی جب یہ بات سامنے آئی کہ آنند مارگی انسانی جانوں کی ہلاکت اپنی فلاسفی کا انتہائی اہم جزء سمجھتے ہیں۔ اس جماعت کا بنیادی اعتماد تشدد پر ہے۔ یہ لوگ تشدد کی زندگی کی روح قرار دیتے ہیں۔ انھیں جمہوریت پر یقین نہیں ہے۔ یہ لفظ ان کی ڈکشنری میں بے معنی اچھل کود اور ذہنی افلاس کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔ اس نام نہاد جماعت کا سربراہ پربھات انجمن سرکار دآنند مارگی۔ جو جماعت کی تشکیل سے قبل بہار ریلوے ورکشاپ میں ایک معمولی کلرک تھا۔ آجکل جیل میں ہے۔ اس کے خلاف لوگوں کے قتل کے مقدمے زیر سماعت ہیں۔

آنند مارگ نے ہمیشہ تشدد کی پالیسی اختیار کی ہے ابھی اخبارات سے پتہ چلا کہ یہ جماعت ملک کے اہم سیاسی لیڈروں کو قتل کرنے کی سازش میں مصروف تھی۔ اندرون ملک ان سرگرمیوں کے لئے آنند مارگ کو بڑی طاقتوں سے دولت ملتی تھی۔ حال ہی میں جب ان کے دفتروں پر چھاپے مارے گئے تو غیر ملکی ساخت کے اسلحہ جات بڑی تعداد میں برآمد ہوئے۔ ان دفتروں سے لاتعداد انسانی کھوپڑیاں بھی نکلیں جنھیں وہ اپنی پوجا پاٹ کے لئے استعمال کرتے تھے۔ آنند مارگ کی طرح آر۔ ایس۔ ایس کے دفتروں سے بھی بڑی تعداد میں اسلحہ برآمد ہوئے۔ دارالحکومت کے دفتر سے امریکی چھاپ اسلحہ ملا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں جماعتیں غیر ملکی آلۂ کار کے طور پر کام کر رہی تھیں۔

بعض واقعات اپنے پس منظر اور ردعمل کے اعتبار سے اہم ہوا کرتے ہیں۔ ۱۵ اگست کی شب بنگلہ دیش میں جو کچھ ہوا وہ بھی اسی طرح کا ایک واقعہ ہے۔ اس کا بھی ایک وسیع پس منظر ہے اور نہایت دور رس نتائج ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ مجیب الرحمن نے اپنے ملک کی آزادی، سالمیت اور ترقی کے لئے زبردست جد و جہد کی ہے۔ ایک ایسی قوم جسے اقتصادی اور سیاسی ہر سطح پر کش مکش کا سامنا ہو سنبھالے رکھنے میں شیخ نے اپنی پوری صلاحیتیں لگا دی تھیں۔ اور وہ ایک ایسے ملک کی تشکیل کے لئے کوشاں تھے جو ان کے خوابوں کا آئینہ دار ہو۔ مگر اس سے پہلے کہ شیخ اپنی کوششوں میں رنگ بھرتے وہاں بغاوت ہو گئی اور اس طرح وہ کتاب مکمل ہو گئی جسے شروع ہوئے بس چند ہی برس گذرے تھے۔

بالکل اچانک ڈھاکہ ریڈیو نے فوجی بغاوت کی خبر نشر کی۔ دوسرے ذرائع نے شیخ مجیب الرحمن کی ہلاکت کی اطلاع بھی دی جس کی تصدیق بعد میں خود بنگلہ دیش ریڈیو نے بھی کی۔ ریڈیو نے یہ بھی بتلایا تھا کہ فوج کی حمایت سے مسٹر خوندکر مشتاق احمد نے حکومت سنبھال لی ہے۔ ہنگامے میں شیخ مجیب کی رفیقۂ حیات، ان کے دو بھتیجے ہلاک ہوئے۔ وزیر اعظم مسٹر منصور علی خاں کی خبر بھی تھی مگر بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ وہ حیات ہیں اور انھوں نے صدر سے ملاقات کی ہے۔

مسٹر خوندکر شیخ مجیب الرحمن کی وزارت میں وزیر تجارت کی حیثیت سے شریک رہے ہیں۔ بنگلہ دیش کی آزادی سے پہلے کلکتہ میں جو عبوری حکومت قائم تھی اس میں بھی مسٹر خوندکر شریک تھے۔ شیخ کے پرانے ساتھیوں میں سے تھے۔ آزادی کی جد و جہد میں ان کے ساتھ کام کرتے رہے۔ مسٹر خوندکر کے قریب ترین ساتھیوں کا کہنا ہے کہ وہ شیخ مجیب الرحمن کے نکتہ چیں رہے ہیں۔

بنگلہ دیش کی نئی کابینہ بیشتر ان ہی افراد پر مشتمل ہے جو پرانی کابینہ میں بھی وزارتوں پر فائز تھے۔ اس میں دو ایک افراد وہ بھی آگئے ہیں جو شیخ کے معتوب تھے۔ نئے عہدیداران کا

حلف لینے کے بعد دو گھنٹے کے اندر اندر انھوں نے دس وزراء اور چھ وزرائے مملکت پر مشتمل وزارت تشکیل دی ہے۔ اس نئی وزارت کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا بہت مشکل ہے ابھی تک بنگلہ دیش کے واقعات کی گرد صاف نہیں ہوئی ہے۔

نئے صدر مسٹر مشتاق احمد نے اپنی پہلی تقریر میں کہا ہے کہ قیادت انہوں نے ملک اور قوم کے وسیع مفادات کے پیش نظر سنبھالی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ نئی حکومت بددیانتی اور اقربا پروری سے کسی بھی شکل میں سمجھوتہ نہیں کرے گی۔ ساتھ ہی انھوں نے ملک کے تمام مذہبی اقلیتی طبقوں کو انصاف اور برابری کا یقین بھی دلایا۔ انھوں نے دشمن ملکوں سے تعلقات قائم کرنے اور باقی رکھنے کی بات بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ بنگلہ دیش دوسرے ملکوں کی علاقائی سالمیت کا احترام کرے گا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی چاہے گا کہ اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ بنگلہ دیش [illegible] علاقوں کے انخلاء کے لئے عربوں کی مدد کرے گا۔ اس طرح وہ اسلامی ممالک کی تنظیم، دولت مشترکہ کے ممالک، ناوابستہ ملکوں اور بڑی طاقتوں سے بھی اپنے تعلقات وابستہ رکھے گا۔

بنگلہ دیش کے واقعات کے سلسلہ میں مختلف ممالک کا مختلف ردعمل رہا ہے۔ پاکستان نے حادثے کے بعد فوراً ہی بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ ساتھ ہی بطور امداد پچاس ہزار ٹن چاول، پچاس ہزار گز ململ اور ایک کروڑ گز لٹھا دینے کا اعلان بھی۔ پاکستان کی یہ فراخدلانہ پیش کش بلا وجہ نہیں ہے سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ پاکستان بنگلہ دیش کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لئے بے چین ہے۔ دوسری طرف بنگلہ دیش کے نئے صدر نے بھی حکومت پاکستان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ برطانیہ نے شیخ کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ساتھ ہی بنگلہ دیش کی نئی حکومت کو تسلیم بھی کر لیا ہے۔

مصر، سعودی عرب، سوڈان، شمالی یمن، ایران، کویت اب تک بارہ ممالک نئی حکومت کو تسلیم کر چکے ہیں۔

بنگلہ دیش کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے حکومت ہند کے ایک ترجمان نے دہلی میں کہا کہ حکومت ہند بنگلہ دیش کے واقعات کا بغور جائزہ لے رہی ہے ایک پڑوسی ملک ہے اور ہم ان واقعات سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو ہمارے پڑوسی ملک میں پیش آرہے ہیں ترجمان نے شیخ اور ان کے ساتھیوں، عزیزوں کی وفات پر اظہار افسوس کیا۔

دوسری طرف بنگلہ دیش کی نئی حکومت نے ہند کو یقین دلایا ہے کہ وہ ان تمام معاہدوں کی پابند رہے گی جو پچھلے دور میں طے پا چکے ہیں۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ نئی حکومت ہندوستان سے کشیدہ رہے گی۔

حال ہی میں جو واقعات سامنے آئے ہیں ان کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی حکومت بھی پچھلی حکومت کی طرح ہماری دوست رہے گی اور عوام کی خوشحالی کے لئے دونوں ممالک میں تعاون کی رفتار وہی رہے گی جو شیخ مجیب کے دور میں تھی۔

عرب لیگ مشن

مرحوم شاہ فیصل کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ وہ یروشلم میں واقع مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کریں۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے ملاقاتیوں سے بارہا اس بارے میں اظہار خیال کیا کرتے تھے۔

یہ ایک عظیم المیہ ہے کہ اسرائیل بیت المقدس کی بے حرمتی کرکے اس کے مذہبی تقدس کو پامال کر رہا ہے اور اس کو بطور ایک سیاسی حربہ کے استعمال کر رہا ہے۔ جب سے اسرائیل نے یروشلم پر قبضہ جمایا ہے تب سے اس نے بہت سے ہنگامے دیکھے ہیں۔ بیت المقدس کو جانے والے مبصرین نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ ۱۹۶۷ء سے بیت المقدس سے عیسائیوں کی لگاتار ہجرت ہوئی ہے جس سے شہر کے مختلف مذہبی عقائد کے حضرات کو دھکا پہنچا ہے۔

جہاں تک مشرقی یروشلم کا تعلق ہے اس کو اسرائیل نے ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ وہ اسرائیل ہی کا ایک حصہ ہے۔ اسی سال نوروز کے موقع پر انٹرویو دیتے ہوئے صیہونی ایجنسی کے سربراہ پنہاس سفیر نے اسرائیلیوں کو تلقین کی ہے کہ انکی آبادی پچاس لاکھ تک پہنچ جانی چاہیئے جبکہ آجکل یہ ۳۰ لاکھ ہے۔ مشکل ہی سے عرب عیسائی یا عرب مسلمان مشرقی یروشلم میں نقل و حرکت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسرائیلی اخبارات اپنی حکومت کے نوآبادی پروگرام کے بارے میں بار بار لکھتے رہتے ہیں۔ خاص طور سے جب ان کا تعلق تعمیراتی سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔ سابق عرب یروشلم کا عرب سیکٹر تیزی کے ساتھ قلعہ نما گھروں میں بسایا جا رہا ہے یہ اسرائیلی اقدام مشکل سے ہی اسرائیلی نیک نیتی یا اس کے مستقبل کے بارے میں اعتماد بحال کر سکتے ہیں۔

اسرائیل کے لئے جارحانہ ڈرامے کھیلنا اس کے معمولات میں شامل ہو گیا ہے۔ اس وقت جب کہ مسئلہ کا منصفانہ حل تلاش کرنے کے لئے سنجیدہ کوششیں کی جا رہی ہیں مسجد ابراہیم پر اسرائیلی ناپاک منصوبہ کے بارے میں کوئی اور تشریح نہیں ہو سکتی۔ اسرائیل کا یہ فیصلہ مسجد ابراہیم کو مسلمانوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا جائے نہ صرف یہ کہ ایک مقدس عبادت گاہ کے تقدس کی بے حرمتی کرتا ہے بلکہ انسانی حقوق جو اقوام متحدہ کی چارٹر میں درج ہیں۔ عبادت کی آزادی وغیرہ کے قطعی منافی ہے۔

۱۰ اگست ۱۹۷۵ء کو عرب لیگ کے سکریٹری جنرل جناب محمود ریاض نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل، انسانی حقوق کمیشن کے چیرمین اور یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ مسجد ابراہیم میں اسرائیل کے ناپاک منصوبوں کے بارے میں تحقیقات کریں۔ ان اقدامات کو جارح قرار دیتے ہوئے عرب لیگ سکریٹری جنرل نے اقوام متحدہ کی طرف سے فوری مداخلت پر زور دیا تھا۔ عرب لیگ کے اسسٹنٹ سیکریٹری جنرل ڈاکٹر نوفل نے اردنی حکومت سے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے اس بات کی مانگ کی ہے کہ وہ ان کو تفصیلی معلومات فراہم کرے تاکہ اس معاملہ پر عرب وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں غور وخوض ہو سکے جو ۲ ستمبر ۱۹۷۵ء میں منعقد ہوگی۔ نیز عرب لیگ اس سلسلہ میں ایک مشترکہ حکمتِ عملی کی تشکیل کرے گی جو کہ اقوام متحدہ کے دائرہ کار میں ہوگا۔

۱۲ اگست ۱۹۷۵ء کو یروشلم سے ملنے والی خبر رساں ایجنسی کی اطلاعات کے مطابق مسجد ابراہیم کی تقسیم سے متعلق ناپاک اسرائیلی منصوبوں سے تمام مغربی کنارے کے لوگوں میں زبردست غم وغصہ پایا جارہا ہے۔ مغربی کنارے کے عربوں نے گزشتہ جمعہ کے روز مظاہرے کئے اور عام ہڑتال بھی عمل میں آئی۔ یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ کویت اور عراق نے بھی اردنی حکومت سے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے اس بات کی مانگ کی ہے کہ اس مسئلہ پر غور وخوض کرنے کے لئے اسلامی وزرائے خارجہ کی طرف سے ایک ہنگامی اجلاس بلایا جائے۔ دنیا بھر کے امن پسند لوگ یقیناً اسرائیل کی ان گندی اور معیوب چالوں سے سخت پریشان ہوں گے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ کچھ لوگ خیر سگالی کے جذبہ سے مغربی ایشیا میں ایک منصفانہ اور مخلصانہ حل تلاش کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہوں۔

جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

مجھے نمک کی کان میں مٹھاس کی تلاش ہے
برہنگی کے شہر میں لباس کی تلاش ہے
وہ برف باریاں ہوئیں کہ پیاس خود ہی بجھ گئی
میں ساغروں کو کیا کروں کہ پیاس کی تلاش ہے

گھرا ہوا ہے ابر ماہتاب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

اور
شاید آپ کو یاد ہو گا
کہ پونا کے مشاعرے میں
یہی نظم مرحوم نے نذرِ
سامعین کی تھی ::

پھر کچھ ہی دیر کے بعد
ان کے پروردگار نے
انھیں نیند کی شراب
پلا دی تھی۔ اور اس نظم
کو پیش کرنے کے ۲۰ بیس
منٹ بعد وہ گہری نیند
میں ڈوب گئے تھے ::

انا للہ و انا الیہ راجعون!

جو رک سکے تو روک دو یہ سیل رنگ و نور کا
مری نظر کو چاہئے وہی چراغ دور کا
کھٹک رہی ہے ہر کرن نظر میں خار کی طرح
تپا دیا ہے تابشوں نے آئینہ شعور کا
نگاہِ شوق جل اٹھی حجاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

یہ دھوپ زرد زرد سی یہ چاندنی دھواں دھواں
یہ طلعتیں بجھی بجھی، یہ داغ داغ کہکشاں
یہ سرخ سرخ پھول ہیں کہ زخم ہیں بہار کے
یہ اوس کی پھوار ہے کہ رو رہا ہے آسماں
دل و نظر کے موتیوں کی آب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

یہ تلخ تلخ راحتیں جراحتیں لئے ہوئے،
یہ خوشچکاں لطافتیں کثافتیں لئے ہوئے
یہ تار تار پیرہن، عروسۂ بہار کا
یہ خندہ زن صداقتیں، قیامتیں لئے ہوئے
زمین کی تہوں میں آفتاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

کھڑے ہوئے ہیں صف بہ صف بہت سے خواب سامنے
حقیقتیں بھی آگئی ہیں بے حجاب سامنے

ورق ورق الٹ رہا ہوں میں کتاب وقت کا
لہو سے جو لکھی گئی ہے وہ کتاب سامنے
جو اس کتاب میں نہیں وہ باب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

جو مرحلوں میں ساتھ تھے وہ منزلوں پہ چھٹ گئے
جو رات میں لٹے نہ تھے وہ دوپہر میں لٹ گئے
مگن تھا میں کہ پیار کے بہت سے گیت گاؤں گا
زبان گنگ ہو گئی گلے میں گیت گھٹ گئے
کٹی ہوئی ہیں انگلیاں رباب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

یہ کتنے پھول ٹوٹ کر بکھر گئے یہ کیا ہوا
یہ کتنے پھول شاخچوں پہ مر گئے یہ کیا ہوا
پڑی جو تیز روشنی دمک اٹھی روش روش
مگر لہو کے داغ بھی ابھر گئے یہ کیا ہوا
انھیں چھپاؤں کس طرح نقاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

خوشا وہ دورِ بیخودی کہ جستجوئے یار تھی
جو درد میں سرور تھا تو بے کلی قرار تھی
کسی نے زہرِ غم دیا تو مسکرا کے پی گئے
تڑپ میں بھی سکون تھا خلش بھی سازگار تھی

حیاتِ شوق کا وہی سراب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

خلوصِ بے شعور کی وہ زود اعتباریاں
وہ شوقِ سادہ لوح کی حسین خام کاریاں
نئی سحر کے خال و خط نگاہ میں بسے ہوئے
خیال ہی خیال میں وہ حاشیہ نگاریاں

جو لُٹ گیا فریبِ شباب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

وہ لعل و لب کے تذکرے وہ زلف و رخ کے زمزمے
وہ کاروبارِ آرزو، وہ ولولے وہ قہقہے
دل و نظر کی جان تھا وہ دور جو گزر گیا
نہ اب کسی سے دل لگے، نہ اب کہیں نظر جمے

سمندِ وقت جا چکا، رکاب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

بہت دنوں میں راستہ حریم ناز کا ملا
مگر حریم ناز تک پہونچ گئے تو کیا ملا
مرے سفر کے ساتھیو تمہیں سے پوچھتا ہوں میں
بتاؤ کیا صنم ملے، بتاؤ کیا خدا ملا

جواب چاہیئے مجھے، جواب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

غزل

ہر آدمی لہو کا شناور ملا ہمیں ۔۔۔ دیکھا نہ جا سکا وہی منظر ملا ہمیں

فطرت کی آگہی بھی میسر نہیں یہاں ۔۔۔ اس کی ہو کیا خوشی کہ سمندر ملا ہمیں

یہ سوچتے ہیں اب اسی جنگل میں آبسیں ۔۔۔ کتنا سکون شہر کے باہر ملا ہمیں

پھولوں سے شاخ شاخ لدی ہے تو کیا ہوا ۔۔۔ ہم نے بڑھائے ہاتھ تو خنجر ملا ہمیں
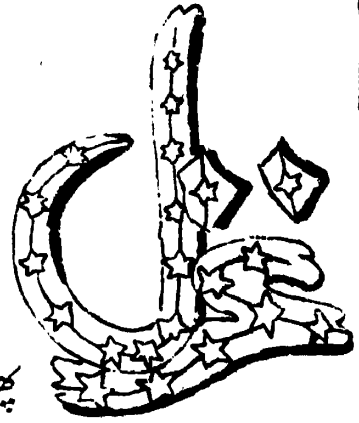
جامہ دری کے بعد بھی عریاں ہوئے نہ ہم ۔۔۔ زخمِ بدن بصورتِ چادر ملا ہمیں

کیا لوگ تھے جو آگ کو گلزار کر گئے ۔۔۔ سو بھی سکے نہ ہم جو یہ بستر ملا ہمیں

سر پر سنبھل سکی نہ کلاہِ ہنر وراں ۔۔۔ ہر آسماں زمیں کے برابر ملا ہمیں

جو شخص ہم میں سب سے شگفتہ مزاج تھا ۔۔۔ دیکھا اسے تو درد کا پیکر ملا ہمیں

ہم رفتہ رفتہ سارے زمانے سے مل چکے ۔۔۔ اب ایک روز ہم سے بھی چل کر ملا ہمیں

"اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی" ۔۔۔ غالب سے کم نہ کوئی سخنور ملا ہمیں

ہم بھی فضاؔ ہیں نخلِ ثمردار کی طرح
پھل غیر کا نصیب تھے، پتھر ملا ہمیں

جناب فضاؔ ابن فیضی

ذرا سوچیے آپ کسی گلاب کی شاخ پر بیٹھ کر خیالات کے شیشوں میں حوران بہشت کا عکس ملاحظہ کر رہے ہوں ــ یا خیالی شیخ عبداللہ کے کاندھوں پر کھڑے ہو کر وادیٔ کشمیر کا نظارہ کرنے میں منہمک ہوں۔ یا اپنے کمرے کی تنہائی میں مراقبہ کئے بیٹھے ہوں اور اپنی من پسند ہیروئن سے خیالی گفتگو کے مزے لوٹ رہے ہوں۔ اچانک صوفی آرپا جیسا فیل نما آدم زاد آ دھمکے اور اپنی وحشت خیز اور سماعت شکن آواز میں آداب بجا لائے تو بھلا کیا گذرے گی آپ کے نازک خیالات پر اور کیا حشر ہوگا اس گفتگو کا جو ظاہری فاصلوں اور نظر آنے والی دوریوں سے بے نیاز آپ کے اور مینا کماری یا آپ کے اور قلاتی کماری کے درمیان ہو رہی تھی۔ بودیت نہ ہو تو صداقت اور حقیقت سے لبریز ایک واقعہ سنئے۔ واقعہ کیا ہے [illegible] بلکہ روداد خواب و خیال کہہ لیجئے۔

ایک مثال سے سمجھیں گے تو غالباً اندازہ لگانا آسان ہوگا

ہمارے دیوبند میں ایک اجڈا ور نیم احمق قسم کا آدمی [illegible] ایک دن وہ اپنی بیٹھک میں بیٹھا ہوا خیالات کے سمندر میں کاغذ کی ناؤ چلا رہا تھا دفعتاً صوفی آرپا نازل ہوئے اور اپنی مکروہ ترین آواز میں بولے

ہیلو مائی ڈیر! مزاج گرامی!!

وہ شخص چونک اٹھا۔ خیالی سمندر کا ایک ایک قطرہ زمین حقیقت میں اتر چکا تھا۔ کشتیاں ریگستانی صحراؤں میں ہچکولے کھا رہی تھیں اور وہ شخص ..... ؟ اس وقت اسے کس درجہ کوفت ہوئی ہوگی اسکا اندازہ لگانا آسان نہیں ــ آپ سر کے بل کھڑے ہو کر انتہائی اخلاص کے ساتھ فاختہ کی بولی بولنے میں منہمک ہوں، عین اسی وقت آپ کی اہلیہ یا اہلیہ کے والد خطرناک زمین کی تہہ میں سے ابھریں اور آپ کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیں۔ بس جو کوفت اور الجھن اس وقت آپ کو محسوس ہوگی بالکل وہی کوفت صوفی آرپا کے غلط وقت نازل ہونے سے اس شخص کو بھی ہوئی تھی جسکا دماغ تصورات کی پگڈنڈی پر سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا ــــ جو خیالی سمندر میں کاغذ کی ناؤ چلا کر شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں ہی اس کا ناخدا ہوں ـــــ جو خیالی ہیروئن سے خیالی گفتگو کرتے وقت یہ سمجھ رہا تھا کہ فلمی دنیا کا پیچ حصہ میرے کمرے میں سمٹ آیا ہے ـــ جو ... آپ میری بات کاٹ کر پوچھیں گے کہ وہ بدبخت ناہنجار کون ہے جو دیوبند شریف کی مقدس سرزمین پر بیٹھ کر خیالی ٹیلیفون کے ذریعہ کسی ہیروئن سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہے۔ وہ سرکش اور سرپھرا کون ہی جو ہندوستان کے

مدینہ میں اقامت گزیں ہونے ہوئے بھی ناپاک عورتوں کے
تصورات دل میں بسائے ہوئے ہے۔

میں انتہائی عاجزانہ بلکہ عالمانہ انداز میں گذارش
کروں گا۔ وہ بار بخت ناہنجار خاکسار ناچیز فقیر میں ہی ہوں
یعنی ملا ابن العرب مکی، یعنی برصغیر کا سب سے
زیادہ ہوشمند اور سب سے زیادہ احمق آدمی یعنی کہ قارئین
تجلی کا فرزند ارجمند اپنا پیارا محترم۔

واقعہ کی الف لیلیٰ سماعت فرمایئے۔ جمعہ کا
دن تھا۔ اہلیہ چار گھنٹے کے لئے کہیں ہجرت کر گئی تھی۔ بچوں
کا قافلہ بھی ماں ہی کے ساتھ سرگرم سفر تھا۔ گھر میں
حاصل ضرب کے طور پر صرف ناچیز باقی رہ گیا تھا
تنہائی تھی، خاموشی تھی اور سکون تھا۔ یعنی خیالی راکٹ
اڑانے کا شاندار موقعہ تھا۔ چنانچہ میں نے بسم اللہ کی
اور ہزار میل فی منٹ کی رفتار سے دوڑ کر بمبئی جا پہنچا۔ بمبئی
کی سڑکوں پر پھیری خوبصورت اور رنگ برنگی تتلیوں کو نظر انداز
کرتے ہوئے میں اپنی دل پسند ہیروئن وحیدہ رحمان کے بنگلہ پر
پہنچا۔ روایتی جنت کی دو مصنوعی حوریں میرے استقبال کے
لئے دروازہ ہی پر کھڑی تھیں۔ میں نے ان سے جاہلانہ عربی
میں کلام کرتے ہوئے کہا۔

مجھے اردو میں ملا ابن العرب مکی کہا جاتا ہے۔ آکاش
وانی دیوبند سے آیا ہوں۔ دارالعلوم سے فارغ التحصیل
بھی ہوں۔ حسن مجسم وحیدہ رحمان سے ملنے کی اچھا ہے۔

انھوں نے مجھے قابل رشک یا قابل فخر نگاہوں سے
گھورا اور پھر خالص رومانی انداز میں بولیں۔

چلئے اندر تشریف لے چلئے۔ وحیدہ جی سو سال سے
آپ کی منتظر ہیں۔ میں ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا اندر
پہنچا۔ ماشاء اللہ کمرہ کیا تھا۔ پیرس اور لندن کا چھوٹا بھائی
تھا۔ نہیں نہیں۔ وہ ... کیا کہتے ہیں اسے جنت
ہاں تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰار کی تفسیر بنا کر جنت کا
مکمل نقشہ کھینچ دیا گیا تھا۔ ایک جانب مخمل کے گدے
بچھے ہوئے تھے۔ ان پر گاؤ تکئے جمائے گئے تھے۔ ادھر ادھر
میز پر چاندی کی صراحیاں سلیقہ کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں
غالباً ان میں شراب طہور جیسی ہی کوئی شئے ہو گی۔ ایک
جانب خالص سنگ مرمر کی ایک میز بھی موجود تھی۔ جس پر
پچاس قسم کے پھل نظر آرہے تھے۔ ظاہر ہے یہ سب اہتمام ناچیز
فقیر ہی کے لئے کیا گیا تھا۔

کمرے کے بیچوں بیچ سنگ ذخار کا بنا ہوا ایک تخت بچھا
ہوا تھا۔ اس پر وحیدہ رحمان جلوہ گر تھیں اور ان کے پہلو میں
بیٹھے ہوئے ان کے نام دار شوہر سجدے سے سجانے تک کی دوسری
جلد کی تلاوت میں مشغول تھے۔

ملا صاحب! آپ کے دیدار کی بڑی حسرت تھی۔ وحیدہ
رحمان کی خوشگوار آواز کانوں کی گلیوں سے گزر کر شہر دل
تک پہنچی۔

اور خاکسار پیدا ہونے سے پہلے ہی آپ سے ملنے کا متمنی
تھا۔ میں نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

وہ دونوں مجھے عقیدت سے اس طرح گھور رہے تھے
جیسے میں ملا ابن العرب مکی نہیں ارسطو کا مقبرہ ہوں۔

میں دل میں پختہ ارادہ کئے ہوئے تھا کہ ذرا تکلف اور جھجک
ختم ہو تو میں فارسی یا سط علی کی آواز میں یہ ڈائیلاگ بولوں گا۔

عزیز ترین وحیدہ جی! میں دنیا کا بڑے سے بڑا عذاب
ہنس کر سہہ سکتا ہوں۔ آپ سیکڑے طمانچے ماریئے میں منہ نہیں
بسوروں گا۔ آپ مجھے کھجور کے درخت میں الٹا لٹکا دیجئے میں کوئی زیاد
نہیں کروں گا بلکہ محبت کی بانسری وہاں بھی بجاتا رہوں گا۔ آپ
مجھے کسی پاگل ہاتھی کی دم سے باندھ دیجئے مجال ہے کہ میں کوئی
حرف شکایت زبان پر لاؤں۔ آپ مجھے چائے میں زہر یا زہر
میں چائے ملا کر دیجئے میں اسے ہم ... روح افزا سمجھ کر
پی جاؤں گا۔ اور میری زبان پر جملے نہیں بلکہ یہ پاکیزہ کلمات
مٹک رہے ہوں گے۔

وحیدہ رحمان محبت وہمدردی کا پیکر ہیں۔ وحیدہ رحمان
رحم وکرم کا مجسمہ ہیں۔ وحیدہ رحمان اخلاق وانسانیت کی ماں ہیں
لیکن یہ ... جان جو پچھلے تین سو ساٹھ برس سے
آپ نے بے رخی کا چلن اختیار کر رکھا ہے یہ میرے لئے قطعاً

ناقابل برداشت ہے۔ میری رگ رگ میں آندھیاں چل رہی ہیں میری روح تباہ ہو رہی ہے۔

مگر ستیاناس۔ ابھی اس مقدس ڈائیلاگ کا پہلا حرف بھی زبان پر نہیں رینگا تھا کہ اچانک ایک بم پھٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے خیالات کی وہ حسین جنت جس کا سنگِ بنیاد میرے ہی ہاتھ میں تھا، اپنی تمام حور و غلمان سمیت نیست و نابود ہو کر رہ گئی۔ بیچاری وحیدہ رحمان بھی پر نچے اڑ گئے۔ ان کے خوش بخت شوہر بھی دھواں بنکر فضاؤں میں تحلیل ہو گئے تھے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے صوفی آرپار کھڑے ہیں اور ان کی ایٹمی آواز میرے دریچۂ سماعت کا خون کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

میں سمجھ گیا۔ خیالات کے شیش محل میں جو زبردست دھماکہ ہوا تھا وہ صوفی آرپار کی دل خراش آواز ہی کا مرہونِ منت تھا ——— لیجئے لگے ہاتھوں اور بطور تبرک صوفی آرپار کے جسم مبارک کا طول و عرض اور ان کی آواز کی کھڑکھڑاہٹ کا اجمالی تعارف سماعت فرما لیجئے۔

جسم کی چوڑائی ایک مونڈھے سے دوسرے مونڈھے تک کامل سات دن کی مسافت۔

جسم کی لمبائی۔ یعنی قد و قامت کی اونچائی کا اندازہ اس واقعہ سے لگا لیجئے۔ ایک مرتبہ بازار گئے اور ایک دکاندار سے دریافت کرنے لگے۔ ارے بھائی یہ لیموں کس حساب سے دے رہے ہو ———

دکاندار نے انھیں غصہ سے دیکھا پھر ان کی طوالتِ جسم کا ادراک کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے بولا۔

مولانا آپ کافی فاصلہ سے دیکھ رہے ہیں، آپ کا کوئی قصور نہیں۔ اونچائی سے ہر چیز چھوٹی ہی نظر آتی ہے اتنا کہہ کر وہ ٹوکرا اپنے سر پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ لیموں نہیں سنگترے ہیں۔

آواز۔ جب بات کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایٹمی دھماکے ہو رہے ہوں۔

آپ سوچیں گے کہ شاید میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں۔ میں عرض کروں گا کہ ہرگز نہیں۔ جھوٹ بولنے کا میں عادی نہیں۔ بلکہ جھوٹ میں نے کبھی رمضان تک میں نہیں بولا۔ جبکہ اکثر صوفی رمضان ہی میں جھوٹ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں ——— غلط بیانی سے مجھے چڑ ہے ——— بیر ہے ——— میں دنیا کا بڑے سے بڑا گناہ انتہائی خندہ پیشانی سے کر سکتا ہوں۔ آپ مجھے عورتوں کی بھیڑ میں چھوڑ دیجئے میں غضِ بصر کا تصور بھی ذہن میں نہیں لاؤں گا۔ آپ مجھے کسی یتیم خانہ کا منیجر بنا دیجئے انشاء اللہ خیانت اور بد دیانتی کا اعلیٰ ترین ریکارڈ قائم کروں گا یقین کیجئے میں نے شیخ زکریا کی فضائل حج کا مطالعہ تصویر محل میں بیٹھ کر کیا تھا۔ اور میں نے بحالتِ اعتکاف ابن صفی کے ناول گھول گھول کر پیئے ہیں۔ ایک بار میں نے عین روزہ کی حالت میں صوفی ھل من مزید کی بیوی کو آنکھ ماری تھی۔ لیکن خدا گواہ ہے اور خدا کے ساتھ ساتھ شیطان بھی گواہ ہے۔ میں نے کبھی کذب بیانی سے کام نہیں لیا۔ کبھی دروغ بافی نہیں کی۔ اگر آپ کو اب بھی میری صداقت پرستی پر شبہ ہو تو اپنے خرچ سے دیوبند تشریف لائیں اور صوفی آرپار کی بچشم خود زیارت کر ڈالیں ان کے جسم پر چڑھی ہوئی تہہ در تہہ چربی اور ان کے منہ سے خارج ہونے والی ایٹمی آواز کا مشاہدہ کرنے کے بعد آپ ملا کی صدق بیانی پر سو فیصد ایمان لے آئیں گے۔ ●

میں مانے لیتا ہوں کہ صوفی آرپار کے جسم کا حدود اربعہ میرے اندازِ بیان سے کسی قدر مختلف ہو۔ مثلاً مونڈھوں کی مسافت سات دن نہ سہی صرف سات گھنٹے ہوں چلئے سات گھنٹے بھی نہ سہی لیکن آپ کو سات منٹ یا سات پل تو ضرور تسلیم کرنے ہوں گے آپ لفظ سات کی تکذیب نہیں کر سکتے۔

میرے انداز بیان کو زیادہ سے زیادہ مبالغہ آمیزی کہہ کر اڑایا جا سکتا ہے۔ جھوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ کذب بیانی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ صوفی آرپار نے الفاظ کی وہ دھما چوکڑی مچائی کہ میرے خیالات کے شیش محل جیسا تاخ

چیں بہ جبیں ہو گئے۔

لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے تو کباڑا ہی کر دیا ——

"میں جھلا کر بولا"

جانتے ہو میں اس وقت کہاں تھا۔

اماں بھٹک رہے ہوں گے کہیں خیالات کے جنگل میں

"اُن کے لب و لہجہ میں بے نیازی تھی"۔

بد ذوقی کی حد ہے۔ آپ بمبئی کو جنگل کہتے ہیں۔

بمبئی؟ "وہ بڑبڑائے"۔

ہاں بمبئی۔ عروس البلاد۔ جنت ہمہ۔ بیت الحسن و العشق

بمبئی کیوں گئے تھے؟

کیوں —— کیوں کا کیا مطلب؟

مطلب یہ ہے کہ جب خیالات کے اُڑن کھٹولے پر ہی سفر کر رہے تھے تو یہ پرواز صرف بمبئی تک ہی کیوں محدود رہی۔ آپ پیرس، لندن اور ٹوکیو کی سیر ایک ہی وقت میں کر سکتے تھے۔

مولانا عامر عثمانی کے مزار پر چادر چڑھانے گیا تھا۔

سچ —؟

خادم نے جھوٹ کب بولا تھا — "میرے لہجہ میں شورش تھی"۔

ماشاء اللہ، سبحان اللہ۔ اب ہوتے جا رہے ہو تم سُنّی مسلمان۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عامر عثمانی صاحب کی موت تمہارے حق میں مفید ثابت ہوئی۔

صرف مفید ہی نہیں، مفید در مفید۔ بلکہ مفیدات۔ اب میں مزاروں پر چلہ کشی کرنے اور آپ جیسے معتبر صوفیوں کے لئے لوتے لوٹانے کے لئے بالکل آزاد ہوں۔

اور یہ نیا ایڈیٹر —— انھوں نے اس طرح چاروں طرف دیکھ کر کہا جیسے حسن احمد صدیقی یہ الفاظ کی کسی رتیج میں گھسا بیٹھا ہو۔

بڑا ہی کٹر ہے۔ مولانا مرحوم میں تو سختی کے ساتھ نرمی بھی پائی جاتی تھی —— اور یہ لونڈا —— اُف خدا کی پناہ! — اس کے تو شاید پڑوس سے بھی نرمی نہیں گذری —— ایک دم ملک الموت معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے اندر چنگیز و ہلاکو دونوں کی روحیں بیک وقت عود کر آئی ہیں ——

پھر؟ "وہ سراپا سوالیہ نشان بن چکے تھے"۔

پھر کیا؟ —— میں اس کا لحاظ بھی نہیں کر سکتا۔ صوفی صاحب کسی سے کہنے کی بات نہیں۔ ماجرا کل تک ناک پونچھتے پھرتے تھے۔ میں نے حضرت کو گودوں کھلایا ہے آج اگر ایڈیٹر بن گئے تو میں کیا رعب میں آجاؤں گا —— کل ہی کی تو بات ہے۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا میں ذرا دیر سے پہنچا۔ فرمانے لگے۔

دیر کیوں ہو گئی۔؟

ذرا شاہ ولایت تک گیا تھا۔

آخر کیوں۔؟

دیا جلانے۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ قبروں پر دیئے جلانا بدعت ہے"۔

مجھے آپ کے رویّہ نے شہ دی ہے۔؟

کیا مطلب "وہ چونکے"۔

معتبر مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں کبھی گھڑی نہیں باندھی۔ لہذا گھڑی باندھنا بدعت کے سوا کچھ نہیں۔ اور آپ دن کی روشنی میں یہ گھڑی باندھے پھرتے ہیں۔

پھر کیا بولے؟ "صوفی آرپار کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی"۔

کیا بولتے —— خادم نے تو اچھے اچھوں کی زبانیں بند کر دی ہیں —— اس بیچارے کی تو ہستی کیا ہے —— بڑا فاضل دارالعلوم بنا پھرتا ہے۔

یہ تمام گفتگو چونکہ ہنگامی حیثیت کے قائم مقام تھی۔ اس لئے کھڑے ہی کھڑے ہوتی رہی۔ اس کے بعد صوفی آرپار دھم سے صوفہ پر گر پڑے۔

قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے یہ بتلائے دے رہا ہوں کہ پچھلے چند ماہ سے میرے اور صوفی

آرپار کے درمیان زبردست کشیدگی چل رہی تھی۔ کشیدگی اور رسہ کشی کی وجہ مزاجوں کا تضاد اور نقطۂ نظر کا نمایاں فرق تھا۔ وہ بیسویں صدی کے تمام نہاد صوفی ہونے کے باوجود تبلیغی جماعت کے شیدائی ہیں۔ تبلیغی جماعت کا شیدائی ہونا نہ کوئی جرم ہے اور نہ کوئی بیماری۔ بلکہ تبلیغی جماعت کی موافقت کرنا اس بات کی علامت ہے کہ روح صحت مند ہے۔ دل و دماغ میں ایمان و اسلام کے ہنڈے روشن ہیں۔

لیکن ان کے اندر لاعلاج مرض یہ ہے کہ وہ علماءِ دیوبند پر طنز و تنقید کے پتھر اچھالتے رہتے ہیں۔ ہر وقت دیوبندی علماء کی غیبت۔ فلاں صاحب کے گھر میں یہ ہوتا ہے۔ فلاں صاحب یہ کرتے ہیں۔ فلاں صاحب کے کردار کا طول و عرض یہ ہے۔

مجھے ان باتوں سے الجھن ہوتی ہے۔ مجھے دیوبندی حضرات سے جو عقیدت اور نسبت ہے یہ کم از کم ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہوگی جن کی پیشانی پر زیادہ سے زیادہ دو اور کم سے کم ایک آنکھ موجود ہو — میں دیوبندی علماء کی توہین اور بے حرمتی گوارہ نہیں کر سکتا دیوبندی علماء فرشتے نہیں ہیں۔ ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کا مجھے بھی احساس ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ جیسے کیسے ہیں اس دور کا معیارِ حق ہیں۔ انھیں گالی دینا حق کو گالی دینے کے برابر ہے۔ انھیں منھ چڑانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم حق پرستی کو منھ چڑا رہے ہیں۔

آپ سوچیں گے کہ تبلیغی جماعت کا شیدائی علماءِ دیوبند کا مخالف کیسے ہو سکتا ہے۔

یہی بات دس سال سے میں بھی سوچ رہا ہوں۔ لیکن اب تک کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکا۔ تبلیغی جماعت بذاتِ خود دارالعلوم کی مداح ہے۔ پھر اس کے وابستگان علمائے دیوبند کی مخالفت کیوں اور کیسے کر سکتے ہیں۔ ... منتقل کرنا بھی غلط ہی ہوگا — ... لئے تبلیغی جماعت کی اکثریت دیوبندی علماء کا احترام کرتی ہے۔ ان سے عقیدت رکھتی ہے۔ اکا دکا لوگ جنھیں علم و عقل کی خوشبو بھی نصیب نہیں ہے دیوبندی علماء پر کیچڑ اچھالتے نظر آتے ہیں۔

ان مقدس حضرات میں سے ایک حضرت صوفی آرپار بھی ہیں۔ علمائے دیوبند بلکہ تبلیغی بزرگوں کے علاوہ دنیا بھر کے علماء اور بزرگانِ دین کو گالیوں کی سوغات سے نوازنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ صوفی آرپار خدا کی قسم کھا کر کہا کرتے ہیں کہ جس نے تبلیغی جماعت میں چلہ نہیں دیا اس کی قبر میں الٹرا اندھیرا ہوگا۔ وہ دو میٹر کے بچھو ہوں گے — عذاب دینے والے فرشتوں کی پوری پلٹن ہوگی۔

میں ان کی خدمت میں بار بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ اے میرے بھائی تمہاری ان احمقانہ باتوں سے تبلیغی جماعت بدنام ہوتی ہے۔ تبلیغی جماعت بلا شبہ ایک اچھی جماعت ہے۔ وہ دینِ اسلام کی خدمت میں منہمک ہے لیکن وہ کسوٹی کہلانے کی مستحق تو نہیں ہے کہ جو شخص اس میں شامل ہو وہ مسلمان اور جو اس کے قریب نہ پھٹکے وہ کافر اور ملحد۔

میں نے انھیں سمجھایا کہ یہ چلے دینا خلافِ سنت ہوتے ہوئے بھی کوئی معیوب فعل نہیں۔ قابلِ تعریف نہیں۔ لیکن یہ عقیدہ بنا لینا کہ جو تبلیغی جماعت میں چلہ نہیں دے گا وہ خدا و رسول کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ کسی طرح اپنے ایمان میں نکھار پیدا نہیں کر سکتا صرف جہالت ہی نہیں بلکہ حماقت اور دیوانگی بھی ہے اگر ما بعد لیا نے دماغ کو تباہ نہ کر دیا ہو تو آدمی ایسی احمقانہ بولیاں نہیں بول سکتا۔ میں نے کئی بار ان کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا کہ اے فدائے تبلیغ تمہارا علمائے دیوبند پر فقرے کسنا، ان کی خامیوں اور کمزوریوں پر حاشیے چڑھانا حماقت در حماقت والی بات ہے اور اسے احسان فراموشی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ اگر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد نہ رکھی جاتی تو تبلیغی جماعت

اور جماعت اسلامی اور فلانی جماعت اور فلاں گروہ کہاں سے جنم لے لیتے۔ یہ ساری جماعتیں اور سارے گروپ تو دارالعلوم دیوبند ہی کی اولاد ہیں۔ تم تبلیغی جماعت پر تو مٹے جا رہے ہو لیکن اس دارالعلوم دیوبند سے تمہیں عقیدت اور لگاؤ کیوں نہیں ہے جس کے صلب سے تبلیغی جماعت پیدا ہوئی ہے۔

وہ بالعموم علمائے دیوبند پر یہ اعتراضات وارد کرتے اب دارالعلوم دیوبند کے صحن میں برائیاں پرورش پاتی ہیں علمائے دیوبند آرام طلب ہو چکے ہیں۔ وہ تبلیغی جماعت کی جدّ و جہد میں حصہ نہیں لیتے حالانکہ چلّہ کشی کے بغیر نفس کی اصلاح ممکن نہیں۔

علمائے دیوبند اپنا دین فروخت کرتے پھرتے ہیں وہ اصلاح عوام کی خاطر تقریریں نہیں کرتے بلکہ نذرانے بٹورنے کیلئے اور عوام کی جیبیں خالی کرانے کے لئے بھاشن دیتے پھرتے ہیں۔ اگر انھیں امت کا درد ہے تو دیوبند میں تقریریں کیوں نہیں کرتے۔ دیوبند کے حالات کس درجہ خراب ہو چکے ہیں — یہاں عوام و خواص کے مکانوں میں کیسی کیسی خرابیاں داخل ہو گئی ہیں۔ بے پردگی عام ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری ہزاروں برائیاں بھی اپنے پورے شباب پر ہیں۔

میں علمائے دیوبند کا دفاع ضرور کرتا۔ ان سے جھک مارتا کہ میرے بھائی عوام کے بگڑنے اور گھر گھر میں برائیوں کے داخل ہو جانے کی ذمہ داری علماء دیوبند پر کیسے عائد کی جا سکتی ہے۔ رہا تقریر کا سوال تو اگر دیوبند کے عوام نے کبھی تقریروں کی فرمائش کی ہو اور دارالعلوم کے اساتذہ نے تقریر کرنے سے انکار کر دیا ہو تو بلاشبہ تمہیں غرّانے کا حق ہے۔ آنکھیں نکال نکال کر چیخنے کا ادھیکار ہے۔ لیکن اگر عوام ہی ذکرِ خدا اور ذکرِ رسولؐ سے بیزار ہو چکے ہوں تو اس میں بیچارے علماء کا کیا قصور۔

میں اسی انداز میں انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا لیکن ان کی کھوپڑی میں میری فلسفیانہ باتیں نہیں سماتی تھیں — میرے دلائل سنکر وہ آگ بگولا ہو جاتے اور خالص نسوانی انداز میں صلواتیں سنانے لگتے۔

تم تبلیغی جماعت کے جانی دشمن ہو۔ تم مودودی ہو۔ تم دیوبندیوں کے چمچے ہو۔ تم یہ ہو۔ تم وہ ہو۔

میرے اور ان کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان جھڑپوں کی نوعیت ہمیشہ مختلف ہوتی کبھی معمولی کبھی غیر معمولی کبھی نہ معمولی نہ غیر معمولی۔ یعنی کہ بس متوسط و معتدل۔

ایک مرتبہ تکرار لحاظ و مروت کے تمام حدود پار کر گئی اور میرے اور صوفی آرپار کے درمیان نفرت اور کشیدگی کی اونچی اونچی فصیلیں حائل ہو گئیں۔ تعلقات ختم — بات کرنا تو درکنار چھ مہینے تک ہم ایک دوسرے کے حق میں نامحرم بنے رہے قطعًا پردہ۔

سرِراہ اگر کبھی ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو وہ کہیں اِدھر اُدھر کو کھسک لیتے۔ اگر میں انھیں دیکھ لیتا تو آس پاس کوئی مسجد تلاش کرنے لگتا تاکہ اس میں گھس کر پناہ گزیں ہو سکوں اور صوفی آرپار کے باعث تکلیف چہرے کی طرف قصدًا نظر اٹھانے کا کبیرہ گناہ سرزد نہ ہونے پائے۔

اسے میری بدنصیبی کہئے یا بلند اقبالی۔ وہ از خود غریب خانہ پر تشریف لے آئے تھے۔ اور اس طرح انھوں نے نفرت کی اس فلک بوس فصیل کو خود ہی ٹھوکر مار کر گرا دیا تھا جسکی بنیاد ہم دونوں ہی نے انتہائی اخلاص کے ساتھ رکھی تھی — مذاق مت سمجھئے۔ ہماری عداوت و نفرت واقعتًا دیانت اور اخلاص پر مبنی تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے طور پر یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اب کبھی ایک دوسرے سے آنکھیں نہیں ملائیں گے ایک دوسرے کے جنازے میں شرکت نہیں کریں گے۔ قیامت کے دن بھی ایک دوسرے کو قہر آلود نظروں سے دیکھیں گے جنت میں بھی ایک دوسرے پر ڈھیلے اچھالیں گے۔

اندازہ لگا لیجئے کہ کس قدر خلوص اور استقامت تھی ہمارے ارادوں میں — لیکن شاید کاتب تقدیر نے ازل ہی میں یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ملّا اور صوفی کی دشمنی کچی اور ناپائیدار ہے، وہ ایک دن مٹ جائے گی اور صوفی ملّا کے درِ دولت پر آکر تجدیدِ تعلق کرے گا۔

اب میں کبھی اتنا سنگ دل اور ہٹ دھرم نہیں ہوں کہ صوفی آرپار جیسا کٹر آدمی اپنے پیروں سے چل کر میرے گھر آئے اور میں حقارت سے منہ پھیر لوں۔

نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میں اتنا پتھر دل واقع نہیں ہوا ہوں۔ انھوں نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اور میں آنکھوں کی خاموش زبان کو سمجھ گیا۔ وہ نگاہوں کی زبان سے کہہ رہے تھے۔

پیارے ملّا! چونکہ تمہارے بغیر میری زندگی ایک اندھیرے کی مانند تھی۔ اس لئے میں تمہارے چرنوں میں اپنا سر رکھنے کے لئے چلا آیا —— اب چاہے مجھے مارو پیٹو یا طلاق دو۔ میں تمہارے گھر سے نکلنے کا تصور تک ذہن میں نہیں لاؤں گا۔ میں تمہارا اور صرف تمہارا ہوں تم بھی مجھے اپنا سمجھو اور سینہ سے لگا لو اے میرے ہمراہی!

اور پھر اگلے ہی لمحے ہم واقعی ایک دوسرے کے سینہ سے لگ گئے —— اور بقول شاعر:-

جب گلے سے مل گئے سارا گلا جاتا رہا

اب ہماری روحوں اور جسموں کے درمیان بال برابر بھی کشیدگی باقی نہیں تھی — ہم ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو گئے تھے جس طرح صبح کو لڑے ہوئے میاں بیوی شام کو ایک دوسرے سے متصل ہو جاتے ہیں اور ان کے درمیان تکدر کی پرچھائیں تک باقی نہیں رہتی۔ یہ لپیٹ چپیٹ اور تجدید تعلق تو کل کی بات تھی۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ صوفی آرپار آج بھی آدھمکیں گے۔ ملائن کے ہجرت کرنے کے بعد میں بیٹھک میں آکر بیٹھ گیا تھا —— ایک شادی شدہ اور صاحب کثرت اولاد کو ایسی مبارک تنہائی کب کب نصیب ہوتی ہے۔ میں نے موقعۂ فرصت سے فائدہ اٹھایا اور خیالات کے اڑن کھٹولے میں بیٹھ کر اپنی پسندیدہ اسٹار کے گھر میں جا کودا۔

لیکن وہ کسی صاحب ہوش نے کہا تھا نا۔ آسمان سے گرے کھجور میں اٹک گئے۔

اہلیہ سے نجات ملی تو صوفی آرپار گلے کا طوق بن گئے خیالات کا ستیاناس ہوا اور وہ گفتگو شہید ہو کر رہ گئی جو میرے اور حسینہ رحمان کے درمیان گہری عقیدت اور خدا ترسی کی موجودگی میں ہو رہی تھی۔

آج صوفی آرپار کا پھر نازل ہو جانا اس بات کی علامت تھی کہ انھیں کوئی حاجت اور غرض ہے جو ان کو میرے گھر کا طواف کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ میرا گمان محض غلط فہمی اور سوءِ ظن ثابت نہیں ہوا بلکہ حرف بحرف صحیح نکلا۔ انھوں نے چند رسمی اور فضول سی باتیں کرنے کے بعد خود ہی اپنا شان نزول واضح کر دیا۔ تکلف اور بے تکلفی کے ملے جلے انداز میں کہنے لگے۔

ملّا بھائی! ذہن بڑا ہی پریشان ہے۔ ایک خطرناک معاملہ پیش آگیا ہے۔ تمہاری دستگیری کی سخت ضرورت ہے۔

میری دستگیری —— مجھے یا پیر دستگیر سمجھ لیا ہے کیا —— ؟

باتوں میں مت اڑائیے۔ بڑا ہی نازک مسئلہ ہے آپ کی مدد کے بغیر حل ہی نہیں ہو سکتا۔

ایسا کیا مسئلہ ہے۔ جو میری ٹانگ اڑے بغیر حل ہی نہیں ہو سکتا۔ کسی کی داڑھی میں آگ لگوانی ہے۔

توبہ کرو۔

پھر؟

بعض امور ایسے ہوتے ہیں جنھیں حل کرنے کے لئے منوں عقل کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے تمہارے دماغ میں جو ترادٹ رکھی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور یہ ترادٹ منوں عقل پر بھاری ہے۔ تم اگر ہمت کرو تو بات کی گہرائی تک پہونچ سکتے ہو۔ اور معاملہ کو سلجھا کر اس ذہنی کشمکش کو زائل کر سکتے ہو جس سے آجکل ہمارا پورا محلہ دوچار ہے۔

ذرہ نوازی پر ہزار بار تھینک یو —— لیکن معاف کیجئے گا آجکل میں قطعاً کسی مسئلہ کو سلجھانے کے موڈ میں

نہیں ہوں۔ مسائل سلجھانا تو بڑی بات ہے۔ ہفتہ عشرہ سے میری ڈاڑھی کے بال بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ میں انھیں ہی سلجھانے کی اہمیت اپنے اندر نہیں پا رہا ہوں۔ بہتر ہے کہ میری جان بخشی فرما کر صوفی قالو بلی یا صوفی تریاق علی سے رجوع کریں۔ وہ دنیا کے ہر مسئلہ کو ڈیڑھ منٹ میں سلجھا دیتے ہیں۔

اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے جس قسم کے بھیجے کی ضرورت ہے وہ ان کے پاس کہاں۔ وہ بھیجہ تو صرف تمہاری کھوپڑی کے تہہ خانہ میں قید ہے۔

خدا کے لئے اتنی بار یار دو مت بولئے۔ ساتویں آسمان سے پتھر برسنے شروع ہو جائیں گے۔

مسئلہ کچھ اس قسم کا ہے کہ تمہارا ذوق سراغرساں بھی بیدار ہو جائے گا۔" انھوں نے میرے جملہ کو پس انداز کرتے ہوئے کہا۔"

ذوق سراغرسانی۔ یہ کونسے یتیم خانہ کا نام ہے۔

للہ مذاق مت کیجئے۔

مذاق کرنا تو میں اپنے اوپر حرام کر چکا ہوں۔

صوفی صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

تو بتاؤں کہ معاملہ کیا ہے اور آپ کو کیا کرنا ہے۔

صوفی صاحب میں اپنی پیدا ہونے والی گیارہ پشتوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مولانا عامر عثمانی کے انتقال کے بعد سے میں ذہنی طور پر مادرزاد یتیم ہو کر رہ گیا ہوں — میرا دماغ سو فیصد قلاش ہو گیا ہے اب آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ ذہانت و ذکاوت پر منوں مٹی پڑ چکی ہے اور اب میں اس مقام پر پہونچ چکا ہوں کہ ہارہا اپنی بیوی کا نام تک یاد نہیں رہتا بلکہ اکثر یہ بھی یاد نہیں کہ اس سے میرا باقاعدہ نکاح ہوا تھا یا وہ یوں ہی میرے گلے کا طوق بنی ہوئی ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ میں اب اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں بتا سکتا کہ میں کب کیوں اور کہاں پیدا ہوا تھا۔ مجھے تو آپ بس ایک زندہ لاش ہی سمجھئے۔ اور ظاہر ہے مردوں سے کسی امداد کی توقع رکھنا دماغی ہیضہ اور دماغ پیدا نہ ہونے کی علامت ہے۔

تم ان حالات میں بھی وہ سب کچھ کر سکتے ہو جو دوسرے لوگ نارمل حالات میں بھی نہیں کر سکتے۔

ڈیر صوفی شاید تم یہ فیصلہ کر چکے ہو کہ ملاّ کو جہنم میں دھکیل کر ہی دم لوگے۔

وہ یہ جملہ سنکر اس طرح مسکرائے جیسے میں نے ان کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھ دیا ہو۔

چلو خیر —— جب جہنم میں جانا ہی ٹھہرا تو پہلا اور بعد کے جھمیلوں میں پڑ کر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔

اب کہہ بھی ڈالئے۔ ایسا کونسا مسئلہ درپیش ہے جسے صرف ملاّ کی یتیم و لاوارث کھوپڑی ہی حل کر سکتی ہے۔

ایک آدمی کو رام کرنا ہے" انھوں نے مسرور لہجہ میں فرمایا"۔

رام اور رحیم کی بات مت کرو۔ ان تک میری پہنچ نہیں دھرتی پر رہنے والے گدھوں کی بات کرو۔

ہاں وہ شخص نرا گدھا ہی ہے۔

معاملہ کیا ہے ؟

پرسوں رات۔ یعنی خاص شب برات کو ہمارے محلہ کی ایک لڑکی اغوا کرلی گئی ہے۔

لڑکی ؟ —— اغوا ! باپ رے۔ کس کی بیٹی تھی

ہمارے پیر بھائی ہیں نا —— منشی اعتماد علی — وہ موٹے موٹے —— بھاری بھرکم۔

سمجھ گیا۔ وہی جو اللہ میاں کی بھینس کے نام سے مشہور ہیں۔

ہاں ہاں —— انھیں کی بیٹی ہے۔

منشی اعتماد علی کہاں ہیں ؟

گجرات گئے ہوئے ہیں۔

گجرات —— کس سلسلہ میں۔

تجارت کے سلسلہ میں۔

ان کے گھر میں اور کوئی مرد ہے ؟

کوئی نہیں۔

پھر بیوی بچوں کو کس کی نگرانی میں چھوڑ کر گئے ہیں ؟

اللہ کے سہارے پر ——

خوب ——— اچھا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ فرار ہوئی ہو۔ آج کے دور میں عشق کرنا ناگزیر ہو گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس نے بھی طبع آزمائی کی ہو اور.......

" میں نے جملہ پورا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی"۔

بعض قرائن و شواہد یہ ثابت کر رہے ہیں کہ لڑکی از خود کسی کے ساتھ فرار نہیں ہوئی بلکہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔

مثلاً۔

مثال کے طور پر اپنی جس سہیلی کے ساتھ وہ جلسہ میں گئی تھی وہ اس بات کی گواہ ہے۔

کیا کہتی ہے وہ ؟۔ "میرے لب ولہجہ میں ہر آن سنجیدگی کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی"۔

وہ بتا رہی تھی کہ جب ہم جلسہ سنکر واپس ہوئے تو چھتہ کے موڑ پر سات آٹھ آدمی کھڑے تھے۔ انھوں نے نسرین کو اٹھا لیا اور تو دو گیارہ ہو گئے۔

نسرین کی سہیلی کا نام کیا ہے ؟۔

منور سلطانہ۔

کیا تم مجھے اس سے ملا سکتے ہو ؟۔

م ..... ملانے کا کیا مطلب۔" ان کی آواز میں تزلزل پیدا ہو گیا تھا"۔

گھبراؤ نہیں۔ "میں منور نام کی ہر لڑکی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں"۔

ملانے میں تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن معلوم نہیں اس کے ماں باپ کیا خیال کریں گے۔

" ماں باپ کو سمجھا لیا جائے گا۔ میں تمہاری موجودگی اور پردے کی آڑ میں اس سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں"۔

تو پھر چلئے ابھی نمٹے لیتے ہیں۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

بہتر ہے۔ ارسطو کی بھی یہی تاکید تھی کہ کل کا کام آج اور آج کا کام ابھی کر لو۔

تقریباً نصف گھنٹہ کے بعد ہم صوفی نونہال کے دولت کدہ پر چہ کر ڈی جائے ان کی صاحبزادی منور سلطانہ سے محو گفتگو تھے۔

چند یوں ہی سے سوالات کرنے کے بعد میں نے منور سلطانہ سے پوچھا۔

کیا تم ان آٹھ آدمیوں میں سے کسی کو پہچانتی ہو ؟۔

اُف اللہ ——— آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، میں نے تو نقاب ڈھک رکھا تھا۔ پھر بجلی بھاگی ہوئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کمبختوں کی صورتیں میں کیا دیکھ لیتی۔

جلسہ میں تقریر کس کی ہوئی تھی ؟

میرے اس سوال پر وہ گھبرا گئی۔ وہ پردے کی آڑ میں تھی اور میں اس کے چہرے کے تأثرات کا مشاہدہ کرنے سے قاصر تھا۔ لیکن اس کی آواز تو میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ اور اس کی آواز میں گھبراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔ اس نے لرزتی کانپتی آواز میں کہا۔

ج ..... جی ..... پ ..... پچھلے سال تو مدرسہ عرفان العلوم کے مہتمم صاحب کی تقریر ہوئی تھی۔

پچھلے سال کی بات چھوڑئیے۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ پچھلے سال شب قدر میں مہتمم صاحب نے وعظ فرمایا تھا۔ لیکن مجھے تو اس سال سے غرض ہے۔ میں تو اس سال کی بات کر رہا ہوں، اس سال شب قدر کو اسلامیہ بازار میں کن صاحب کی تقریر ہوئی !

تو پھر شاید مولانا خیال حسین صاحب کی ہوئی ہوگی۔ کئی سال پہلے بھی مدرسے والوں نے ان کا وعظ کروایا تھا۔

شاید کا کیا مطلب۔ یقینی بات بتائیے۔ ؟

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا ——— ایک دم خاموشی طاری ہو گئی۔

خیر ——— میں نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے اپنے مونڈھے جھٹکے، پھر صوفی آرپار سے مخاطب ہو کر بولا۔

آپ بتائیے اور دوسرے ایسے کونسے قرائن و شواہد ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نسرین بھاگی نہیں اغوا کی گئی ہے۔

چند ہفتے پہلے اس کا پرچہ آیا تھا۔

کس کا ؟

اسی کا جس کو رام کرنا ہے۔

کون ہے وہ اور کہاں رہتا ہے ؟

محلہ شہشاد نگر میں رہتا ہے۔ برسہا برس سے وہ منشی اعتماد علی کا دشمن ہے۔ ذات کا پٹھان ہے۔ اصلی نام تو خدا ہی جانے کیا ہوگا، شرفو کے نام سے مشہور ہے۔

کیا لکھا تھا اس نے پرچہ میں ؟

الفاظ تو میرے ذہن میں محفوظ نہیں مفہوم یہ تھا کہ میں عنقریب تمہاری لڑکی کو اغوا کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں گا۔

پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماضی میں منشی اعتماد علی سے کوئی ایسی خطا سرزد ہو گئی تھی جس سے شرفو کی ذات کو کوئی نقصان پہنچا ہو اور وہ اسی کا انتقام لینے کے لئے بے چین و بے قرار تھا۔

مجھے صحیح صورت حال کا علم نہیں۔ صوفی آرپار بوکھلاتے ہوئے بولے" ویسے کچھ نہ کچھ چکر ضرور ہے۔

اس سلسلہ میں شرفو سے ملاقات ہوئی ؟

محلہ کے چند معزز حضرات اس کے پاس گئے تھے لیکن وہ خدا اور رسول کی قسمیں کھا کر یقین دلانے کی کوششیں کرتا رہا کہ مجھے اب ان سے کوئی عداوت نہیں۔ بلاشبہ پہلے میں ان کا دشمن تھا لیکن یہ تو قصۂ ماضی ہے اب نہ مجھے ان سے کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی میں انھیں تکلیف پہنچانے کی تاک میں رہا کرتا ہوں۔ رہا کسی کی بیٹی کو اغوا کرنے کا معاملہ تو اس گری ہوئی حرکت کی توقع آپ کسی ایسے آدمی سے کیوں کرتے ہیں جو خود چند بیٹیوں کا باپ ہو۔ میں کسی کی بیٹی کو رسوا کروں گا تو یقیناً کوئی میری بیٹیوں کی عزت تاراج کر دیگا۔

پرچہ کے بارے میں کوئی بات ہوئی تھی ؟

ہاں، لیکن وہ تو اس کا بھی انکار کر رہا تھا۔ کہنے لگا اگر میں نے کبھی اس قسم کا پرچہ لکھا ہو تو میری اولاد کا بیڑا غرق ہو میرے گھر میں طاعون پھیلے۔

پھر آپ کا کیا خیال ہے ؟

ہمارا خیال ہے کہ وہ صاف جھوٹ بول رہا ہے وہ ایک تیسرے درجہ کا آدمی ہے اس کے لئے جھوٹی قسمیں کھانا کوئی بڑی بات نہیں۔ پھر اس کے علاوہ شہر بھر میں کوئی منشی اعتماد علی کا دشمن نہیں ہے۔ اگر وہ پرچہ اس نے نہیں لکھا تھا تو پھر کس نے لکھا تھا۔ اور کیا فائدہ ہوا کسی کو وہ پرچہ لکھ کر۔

ہو سکتا ہے کہ کسی نے بس یوں ہی پریشان کرنے کے لئے لکھ دیا ہو" میں نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

چور چوری کرنے کے بعد آسانی سے کب اقرار کر لیتا ہے کہ مجرم میں ہوں۔" منور سلطانہ اپنی گھبراہٹ کو سمیٹتے ہوئے بولی"۔

اچھا تو اجازت دیں۔ بس یہی چند باتیں دریافت کرنی تھیں۔ وقت ضائع کرنے کی معافی چاہوں گا۔

چچا جان ابھی مت جایئے گا ذرا میں چائے لا رہی ہوں منور نے لہراتے ہوئے کہا۔

خدا جانے اس نے چچا جان مجھے کہا تھا یا صوفی آرپار کو قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ صوفی آرپار ہی کو کہا ہو گا۔ وہ ان کے گھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ مجھے تو پہلی ہی بار جانے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔

پندرہ منٹ اور بیٹھنا پڑا۔ اس کے بعد ہم چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔

ملائن بھی تشریف لا چکی تھیں۔ میں چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوا اور ملائن سے نظریں بچاتا ہوا اپنے کمرہ کی طرف بڑھ گیا۔ کمرہ میں گھسنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ ملائن کی کرخت آواز کانوں میں گھل کر رہ گئی۔

کہاں گئے تھے ؟۔

منشی اعتماد علی اور صوفی نونہال کے دولت کدہ تک گیا تھا۔

کیوں ؟۔

وہ منشی اعتماد علی کی لڑکی تھی نا نسرین —— تھی۔

تھی کا کیا مطلب ؟۔

دراصل اب وہ اپنے مکان میں موجود نہیں ہے۔
کہاں گئی؟ —
جتنے منہ اتنی باتیں۔ بقول سقراط اغوا کی گئی ہے اور بقول افلاطون از خود کسی کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔
سقراط۔ افلاطون ——" ملا تن نے حیرت کا اظہار کیا"۔
مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے ہیں ان کا مقام خود ان کی نظر میں سقراط اور افلاطون سے کسی درجہ کم نہیں۔
آپ وہاں کیا لینے گئے تھے؟۔
تحقیقات کا کام میرے ہی سپرد کیا گیا ہے۔
کیسی تحقیقات؟ اس کے خوبصورت چہرے پر حیرت و استفہام کی سلوٹیں نمایاں طور پر ابھر آئی تھیں۔
مجھے تحقیق یہ کرنی ہے کہ لڑکی خود بھاگی ہے یا اس کو اغوا کیا گیا ہے اور وہ دنیا کے کونسے خطے میں معتکف ہے۔
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ دوسروں کے پھڈے میں کیوں اپنے پاؤں پھنساتے پھرتے ہیں۔ آپ کی بلا سے کوئی بھاگے یا اغوا ہو۔
تم نہیں سمجھ سکتیں کہ میں ملت بیضا کی خدمت کے لئے ہمہ تن اور ہمہ وقت کیوں مستعد رہتا ہوں۔ دراصل میں جانتا ہوں کہ اگر میں ان نازک مسائل میں ٹانگ نہ اڑاؤں تو قیامت کے دن فرشتے میری بوٹیاں نوچ لیں گے — وہ میری پتلی کمر پر ایک گُرس گھونسے رسید کریں گے اور ہر گھونسہ پر یہ ارشاد فرمائیں گے کہ اے بدبخت جب خدا نے تیری کھوپڑی میں اسپیشل قسم کا بھیجا رکھ دیا تھا تو تو نے اس سے فائدہ حاصل کیوں نہیں کیا۔ تجھے سراغ رسانی کی صلاحیتیں وافر مقدار میں بخشی گئی تھیں تاکہ تو ان صلاحیتوں سے ان غریب اور شریف انسانوں کی مدد کر سکے جن کی بہو بیٹیاں آٹومیٹک طور پر غائب یا فرار ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے میدان حشر میں میرے پاس سوائے خاموشی اور تأسف کے اور کیا ہوگا —— اور پھر نتیجتاً میں دوزخ میں پھینک دیا جاؤں گا ——

دوزخ میں جانا بھی چلئے بصد شوق منظور — لیکن تمہاری جدائی کیسے برداشت ہوگی۔ تمہارے بغیر دوزخ میں دل کیسے لگے گا۔
آخرت میں ساتھ رہنے کی دو ہی صورتیں ہیں — یا تو تم دھڑا دھڑ میری نافرمانیاں کرو تاکہ تمہارے لئے دوزخ میں جانا حلال ہو جائے ورنہ مجھے ملت اسلامیہ کی خدمات کرنے کا موقع دو تاکہ جنت کے کسی چھوٹے موٹے حصہ کی بکنگ کرا سکوں —" محل کی خواہش تو مناسب نہیں — اور اس طرح آپ اور میں — یعنی میں اور آپ ہمیشہ ہمیشہ قربت کی لذتوں سے محظوظ ہوتے رہیں۔
وہ مجھے گھورتی رہی —— اور میں روانی کیساتھ اسطرح ڈائیلاگ بولتا رہا جیسے وادیٔ کشمیر میں دریائے جہلم بہہ رہا ہو۔
میری تلاش و جستجو کئی اعتبار سے منفعت بخش ہوگی اگر میں منشی اعتماد علی کی صاحبزادی کی کھوج لگانے میں کامیاب ہوگیا اور اسے لا کر ان کے حوالہ کر دیا تو حق تعالیٰ کے انعام و اکرام کا تو پرمٹ ملا ہوا ہی سمجھو۔ ساتھ ہی منشی اعتماد علی کی اہلیہ نے سو دو سو روپے انعام کے طور پر دینے کا بھی اشارہ کیا ہے —— اشارتاً کہا بس مصلحتاً ہی سمجھو۔ کیونکہ تشہیر کرنے میں رسوائی اور شرمساری کا اندیشہ تھا —— اور بیگم تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ رمضان سر پر کھڑا ہے —— شاید اللہ میاں نے من و سلویٰ کے طور پر ہمارے اوپر اس طرح رحمت نازل کرنیکا ارادہ فرمایا ہو —— اس کی تو شان ہی نرالی ہے۔
بس سحر و افطار کے انتظامی تفکرات سے بے نیاز ہو جائیں گے اور مسجد سے میخانے تک کے نئے نئے پلاٹ تلاش کرنے کے ماسوا کچھ اور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑیگی —— ایڈیٹر تجلی نے جو تانا شاہی حکم دے رکھا ہے تاکہ رمضان المبارک کے فوراً ہی بعد عامر عثمانی نمبر کے لئے بالکل اچھوتے اور نئے انداز میں مسجد سے میخانہ تک تیار رہنا چاہیئے۔
کیا بیگم! یہ کفران نعمت نہیں ہوگا کہ دوہری دوہری نعمتوں کو ٹھکرا دیا جائے۔

بس بس خدا کے لئے میرا دماغ مت چاٹیے۔

صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھے ان خرافات میں مزا آتا ہے۔ بلا وجہ کی باتیں۔

لب و لہجہ کی مصنوعی تلخی صاف بتا رہی تھی کہ میری پالیسی سے وہ پوری طرح متفق ہیں۔

ایک خوشخبری سنو میں نے موضوع بدلنے کی غرض سے کہا "صوفی آرپار سے پھر تعلقات استوار ہو گئے۔

کون صوفی آرپار۔؟

ارے وہی جن سے ابھی چند ماہ پہلے بڑی گرماگرم بحث ہوئی تھی اور میں نے ان کی ریش مبارک پکڑ کر کہا تھا۔

یا ایہا الصوفی! زیادہ بکواس کی تو جہنم کی گہرائی میں اتار دوں گا۔

آپ نے تو قسم کھائی تھی ان سے زندگی بھر بات نہ کرنے کی۔ آخر زبان ہے یا چھکڑا۔

میری کیا خطا۔ کل دوپہر آ کر انھوں نے اپنا دامن کا سر بے رقی میرے پیر پر رکھ دیا۔

کل تو آپ نے بتایا نہیں تھا۔

اس میں کچھ مصلحت تھی۔

یہ صوفی آرپار وہی تو ہیں نا جن کے برادر کلاں ہمارے منے کا اچکن اٹھا کر لے گئے تھے۔

کیوں گڑے مردے اکھاڑتی ہو جس زمانہ میں انھوں نے یہ حرکت فرمائی تھی وہ تو بے شعوری کا دور تھا۔ اب دیکھو انھیں۔ سراپا شریعت محسوس ہوتے ہیں۔ سر پر شرعی بال جو کسی حالت میں دو تین کلو سے کم نہیں ہوں گے — داڑھی ایک مبین الالتزامی۔ کرتا اتنا لمبا کہ اس کی کوئی حد تعین نہیں کی جا سکتی۔ اگر تم خوردبین لگا کر بھی ان کے پاجامہ کا سراغ پا جاؤ تو ارشد القادری کی جیب سے نکال کر دس ہزار روپے نقد انعام۔

خالی لباس وغیرہ سے کیا ہوتا ہے۔ اونچے نیچے کپڑے تو مرزا نقشبین علی بھی پہنتے ہیں۔ داڑھی تو ان کی بھی کسی باضابطہ ولی کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن ان سے زیادہ کاذب اور مکار آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔

بیگم خدا سے ڈرو۔ اسی فیصد مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس وقت دھرتی کے سینہ پر مرزا نقشبین علی سے زیادہ ثقہ شخصیت موجود نہیں ہے۔ ایک حلقہ ان کے تقدس کی قسم کھاتا ہے۔ ان ہی کے خاندان میں ایک بزرگ گزرے ہیں شاہ گدڑی پوش۔ مادرزاد ولی تھے جانتی ہو مادرزاد ولی کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔؟

وہ مجھے استفہامیہ نظروں سے تک رہی تھی —— میں ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ مادرزاد ولی وہ کہلاتا ہے جو پیدا ہونے سے پہلے بھی ولی ہوا اور مرنے کے بعد بھی ولی ہی رہے۔

شاہ گدڑی پوش بھی اسی انداز کے ولی تھے سنتا ہے کہ ایک بار رجب نام کے کسی آدمی نے ان کے مزار کی طرف رخ کر کے پیشاب کر دیا تھا بس پھر کیا تھا جلال آگیا۔ اسی وقت کتا بنا کر اسے کیکر کے درخت میں لٹکا دیا تھا۔ ایک معتبر مؤرخ نے لکھا ہے کہ وہ چالیس برس تک وہیں لٹکا ہوا کائیں کائیں کرتا رہا۔ پھر ان کے کسی ہم عصر نے اس کی سفارش کرتے ہوئے کہا تھا۔

اے سراپائے رحم و کرم رجب کے گناہوں کو معاف کر دیجئے۔ اسے پھر سے انسانی پیکر میں ڈھال دیجئے۔ بہت سزا بھگت چکا ہے۔ بس پھر اسی وقت انسان بن گیا تھا سنا ہے کہ اب اس کا مزار بھی شاہ گدڑی ہی کے پہلو میں واقع ہے اور خلقت اسے کتے شاہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

یہ حضرات بڑے ہی پائے کے بزرگ تھے۔ اللہ اللہ

بس خدا کے لئے مجھے یہ قصے کہانیاں مت سنائیے

ملائن یہ کہتے ہوئے باورچی خانہ کی طرف چلی گئی۔

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ عورتیں خالص دنیا دار اور دنیا پرست واقع ہوئی ہیں۔ آپ انھیں لیڈی منٹو۔ فلاںین اور راؤ فلانے فلانے کپڑوں کی

باتیں سنائیے قیامت آجائے گی بلکہ حساب کتاب بھی نمٹ جائیگا لیکن یہ اکتانے کا نام نہیں لیں گی اور اولیاء اور صوفیاء کے واقعات سنکر اس طرح بھاگتی ہیں جیسے ان کے کانوں میں سیسہ پگھلاکر ڈال دیا ہو۔ اللہ جانے قیامت کے دن ان کا کیا حشر ہوگا۔ میں ان کے بارے میں مطمئن نہیں ہوں۔

ایک ہفتہ بڑی کشاکش اور بھاگ دوڑ میں گذرا۔ اس عرصہ میں اپنا ہوش رہا نہ اہل وعیال کا۔ نہ اپنی دنیا کی فکر تھی نہ آخرت کی۔ نہ اپنے کسی ذاتی غم کا احساس تھا نہ خوشی کا بس ہر وقت ایک ہی فکر تھا۔ ایک ہی دھن سوار تھی کہ نسرین کا سراغ لگ جائے اور میں ساتھ عزت وعافیت کے اسے اس کے گھر پہنچا دوں۔

میری کوشش اور بھاگ دوڑ بے فائدہ ثابت نہیں ہوئی بلکہ ہفتہ بھر کی جاندوجہد کے بعد نسرین کا سراغ لگ گیا اور میں طاقت اور ترکیب کا استعمال کرکے اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

ایک ایک بات لکھتا تو طوالت اور کوفت کا باعث ہوگا بس مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ منور سلطانہ کی گھبراہٹ اور اس کی ادت پٹانگ باتیں سننے کے بعد میں نے جو اندازہ لگایا تھا وہ سو فیصدی صحیح ثابت ہوا۔ نسرین کو اغوا نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ ازخود خالد نام کے ایک لڑکے کے ساتھ رفو چکر ہوئی تھی۔

اس شرمناک واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ خالد ایک مدت سے نسرین کو بھاگنے پر اکسا رہا تھا۔ نسرین کو اگرچہ خالد سے وہ تعلق تھا جسے مہذب حضرات عشق کا اور غیر مہذب لوگ عیاشی کا نام دیتے ہیں۔ اور اگرچہ وہ خالد کے ساتھ جانے کے لئے ہمہ تن تیار تھی۔ لیکن اسے اپنے شریف ماں باپ کی عزت کا خیال تھا۔ وہ یہ بات گوارہ نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے چلے جانے کے بعد شہر بھر میں چہ میگوئیاں ہوں اور دنیا باآواز بلند یہ شور مچائے کہ منشی اعتماد کی لڑکی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

اس نے اس سلسلہ میں اپنی ہمراز منور سلطانہ سے بات چیت کی کہ آپا میں کیا کروں۔ ایک طرف خالد کا پیار بھرا اصرار ہے، دوسری طرف ماں باپ کی عزت۔

منور سلطانہ نے دوستی کا حق ادا کرنے کی غرض سے مخلصانہ مشورہ دیا کہ خالد کے ساتھ فرار ہو جاؤ اور محبت کے اس تاج محل کو تکمیل تک پہنچا دو جس کی بنیادیں تم نے اپنے ہی ہاتھوں سے رکھی تھیں اور اس کا قطعاً خیال مت کرو کہ یہ تاج محل تمہارے ماں باپ کی بوڑھی ہڈیوں پر تعمیر ہو رہا ہے یا خاندان کی عزت وناموس پر۔

رہا تمہاری بدنامی اور رسوائی کا سوال تو وہ انشاءاللہ قطعاً نہیں ہوگی۔ لوگ تم پر لعن طعن نہیں کریں گے۔ میں اسکی ذمہ دار ہوں۔

منور سلطانہ انتہائی چالاک لڑکی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ منشی اعتماد علی جلاہے ہیں اور انھوں نے آج سے بیس برس پہلے رشیدہ نام کی ایک پٹھان لڑکی کو عشق کی ڈوری میں باندھ لیا تھا۔ اور پھر اسے نکاح کی مضبوط زنجیر میں جکڑ کر اپنے گھر لے آئے تھے۔

رشیدہ آج بھی ان کے گھر میں موجود ہے اور نسرین اسی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ رشیدہ شرفو کی پھوپی زاد بہن تھی جب اعتماد علی صاحب نے رشیدہ سے خفیہ طور پر نکاح کیا تھا تو شرفو اور اس کے چند حواریین نے گرجدار آواز میں کہا تھا کہ ہم اپنی برادری کی اس ذلت وہتک کا انتقام ضرور لیں گے۔ جو حرکت تم نے ہماری لڑکی کے ساتھ کی ہے وہی حرکت تمہاری لڑکی کے ساتھ بھی کریں گے۔ آج جو رسوائی اور بدنامی ہمارے حصہ میں آئی ہے کل اس کا مزا تمہیں بھی چکھنا پڑے گا

منور نے نسرین کو سمجھایا کہ اگر تم بھاگ جاؤ اور دنیا کو اس کا علم ہو جائے کہ تم خالد کے ساتھ فرار ہوئی ہو تو بلاشبہ بدنامی کا طوق تمہارے اور تمہارے ماں باپ کے گلے میں پڑ کر رہے گا لیکن اگر تم فرار ہو گئیں اور تمہارے فرار ہونے کے بعد یہ افواہ پھیلا دی جائے کہ نسرین کو اغوا کیا گیا ہے۔ اسے سر راہ چلتے کچھ غنڈے اٹھالے گئے تو پھر نہ تمہیں سخت سست کہا جائیگا اور نہ ہی تمہارے ماں باپ کو۔ بلکہ تمہارے لئے ان کے

دلوں میں نفرت وحقارت کی بجائے محبت وہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوگا۔

بات چونکہ معقول تھی اس لئے نسرین کی کھوپڑی میں آگئی منور ہی نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ فرار ہونے سے دو ماہ قبل ایک پرچہ کسی طرح منشی اعتماد علی کے نام ڈلوا دینا۔ اس میں ظاہر کرنا کہ یہ پرچہ شرفو کی طرف سے ہے اور وہ بیس سال پرانی حرکت کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا پرچہ کسی اور کی تحریر میں لکھوا کر منشی اعتماد علی کی خدمت میں پہنچا دیا گیا تھا جس میں صاف الفاظ میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

منشی اعتماد علی صاحب! آداب عرض!!

میں شرفو بول رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے بیس برس قبل آپ سے ایک گناہ سرزد ہوگیا تھا۔ میں نے چیلنج کیا تھا کہ میں آپ کو اس گناہ کی سزا ضرور دوں گا۔

سنا ہے کہ آپ کی بیٹی جوان ہوگئی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو میری گزارش ہے کہ آپ اسے کسی تہہ خانے میں چھپا کر رکھیں۔ وہ اب جس دن بھی باہر قدم نکالے گی میرے قبضہ میں ہوگی۔ اور پھر آپ میرے سامنے ناک رگڑنے پر مجبور ہوں گے۔ تمہارا بدخواہ۔ شرفو۔

بیچارے منشی اعتماد علی کو اس بات کا علم کہاں تھا کہ شرفو اب کافی حد تک بدل گیا ہے۔ مولانا مودودی کی کتابیں پڑھنے کے بعد اب اس کے اندر نمایاں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے وہ اب سچ مچ کا مسلمان محسوس ہوتا ہے۔ اسے تو اب صرف اپنی آخرت کی فکر ہے۔ نہ اب اسے منشی اعتماد علی سے کوئی عداوت ہے اور نہ ہی وہ کسی بات کا انتقام لینا چاہتا ہے اس نے کسی کتاب میں یہ بھی پڑھ لیا تھا کہ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ وقت ہر بات کا انتقام لے لیتا ہے۔ جو دوسرے لوگوں کی عزت پامال کرتے ہیں ایک دن ان کی بھی عزت پامال ہوجاتی ہے

تاریخ بہرحال خود کو دہراتی ہے۔ چونکہ دنیا گول ہے لہٰذا ہر اچھائی اور برائی گھوم پھر کر اپنے ہی پاس لوٹ آتی ہے

—— اس بات کا علم ہوجانے کے بعد شرفو کے دل سے انتقامی جذبہ نکل چکا تھا۔

بہرکیف شرفو کے دل میں اب کوئی برا جذبہ موجود نہیں تھا۔ لیکن منشی اعتماد علی اب بھی یہی سمجھتے تھے کہ شرفو ان کا دشمن ہے نسرین اور منور کے پرچہ پر دھوکا کھا جانا نفسیاتی اعتبار سے خلاف حیرت نہیں ہے۔

نسرین اور منور سلطانہ کا مدعا پورا گیا تھا۔ راہ ہموار ہوچکی تھی۔ دو مہینے کے بعد خاص شب برات کو نسرین اور اسکی سہیلی سیرۃ النبی کے جلسہ میں شرکت کا بہانہ کرکے گھر سے نکلیں اور یہ جا وہ جا۔

پھر پروگرام کے مطابق منور سلطانہ نے یہ افواہ پھیلادی کہ نسرین کو آٹھ غنڈے اٹھا کر لے گئے۔

حیرت مجھے اس بات پر ہوئی تھی کہ منور سلطانہ جب اندھیرا شدید ہونے کے باعث ان غنڈوں کی شکل تک نہیں دیکھ سکی تھی تو پھر اس نے ان کی تعداد کیسے معلوم کرلی تھی۔ جس اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ تک نہ سجھائی دے رہا ہو وہاں منتشر آدمیوں کو گن لینا بہرحال حیرتناک ہے۔

مجھے شک اسی وقت ہوگیا تھا جب منور سلطانہ یہ بتانے سے ہچکچا رہی تھی کہ تقریر کس کی ہوئی۔ وہ دونوں جلسہ گاہ تک پہونچی ہی کب تھیں جو انھیں معلوم ہوتا کہ تقریر شب برات کو کن صاحب کی ہے۔

اور میرا شک یقین میں اس وقت تبدیل ہوچکا تھا جب تحقیقات کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ شب برات کو بجلی ایک منٹ کے لئے بھی نہیں بھاگی تھی اور جب بجلی بھاگی ہی نہیں تو پھر اندھیرا و سخت اندھیرا ہونے کا کیا مطلب بلکہ واقعہ چاندنی اُن تاریخوں کا ہے جنمیں ماہتاب اپنے پورے شباب اور آن بان کے ساتھ جلوہ گر رہتا ہے ان میں اندھیرا و تاریکی اول تو رہتی ہی نہیں تو کمیاب ضرور رہ جاتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ جھنٹہ کے موڑ پر کلیم بک۔ ڈپو۔ واقع ہے وہاں رات بھر اس کے مالکان کام کرتے رہے۔ اگر جھنٹہ کے موڑ سے نسرین کو اٹھایا گیا تو ظاہر ہے نسرین نے اپنے دفاع میں تھوڑی بہت مزاحمت تو ضرور کی ہوگی اور اس کے نتیجہ میں چیخ و

تبصرے کیلئے کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں ورنہ تبصرہ نہ ہوسکیگا

زلزلہ در زلزلہ

تالیف :۔ نجم الدین احیائی ۔ صفحات ۔ (۲۱۰)
کتابت عمدہ ۔ قیمت چھ روپے پچاس پیسے ۔
ناشر :۔ ہلال بک ڈپو ۔ مبارک پور ۔ اعظم گڈھ ۔

حق تعالیٰ مولانا عامر عثمانیؒ کو غریق رحمت کرے ۔ انہوں نے زلزلہ کے حق میں تبصرہ کرکے انتہائی بیدار مغزی اور دانشوری کا ثبوت دیا تھا ۔ اگر وہ زلزلہ کی مدحت نہ فرماتے تو دیوبندی مکتب فکر کو اجاگر کرنے کے لئے بے شمار کتابیں جو زیادہ نہیں ہوسکتی تھیں ۔

دیوبندی تعطل اور جمود کو توڑنے کے لئے ناگزیر تھا کہ ارشد القادری کی تالیف کو عمدہ اور قابل مطالعہ قرار دیا جائے نتیجہ خاطر خواہ ثابت ہوا ۔ اِدھر سے اُدھر تک ، یہاں سے وہاں تک سیکڑوں قلم حرکت میں آ گئے ۔ غفلت و تساہل کے گہواروں میں سوئے ہوئے لوگ دفعتاً بیدار ہو گئے ۔ تعطل کی برف پگھلی اور زلزلہ کی رد میں دسیوں کتابیں منظر عام پر آ گئیں ۔ اگر مولانا عامر عثمانیؒ زلزلہ کو قابل التفات قرار نہ دیتے تو بتائیے کہاں ہمارے اب تم اس طرح لنگوٹی کس کر میدان میں کود سکتے تھے ۔

بعض کم سوادوں نے تو یہ بکواس بھی شروع کردی تھی کہ مولانا مرحوم بادہ خوار ہیں ، مدہوشی کے عالم میں قلم چلاتے ہیں ۔ بعض نے بہ انداز پیغمبرانہ یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ عامر عثمانیؒ نے دس ہزار روپے لے کر ارشد القادری کی کتاب پر تعریفی تبصرہ کیا ہے ۔

اس قسم کے بیہودہ حضرات خدا کے یہاں کیا جواب دیں گے ۔ ان کی وہاں کیا درگت بنے گی ۔ یہ منظر دیکھنے کے لئے تو میدان حشر میں جمع ہونے کا انتظار کیا جائے ——— مولانا عامر عثمانی کا تبصرہ اگر کسی کے پلے ہی نہ پڑا ہو ، وہ ان کی تحریر کا مطلب و مقصد ہی نہ سمجھ پایا ہو تو اس میں قصور اسی کوڑ مغز اور ناسمجھ کا ہے نہ کہ مولانا عامر عثمانیؒ کا ۔

کسی کی نیت کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی ظاہری باتوں کو دیکھ کر اندازے اور قیاس آرائیاں کی جاسکتی ہیں

لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ کسی کے ظاہری رجحانات دیکھ کر آپ اس کے بارے میں جو اندازہ کریں، جو تصور دل و دماغ میں جمالیں وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہو۔ بسا اوقات انسان کے ظاہر و باطن میں زمین و آسمان کا نمایاں فرق ہوتا ہے لیکن اس نمایاں فرق کا ہماری ظاہر بیں نظریں ادراک نہیں کر پاتیں۔

زلزلہ پر تبصرہ کرتے وقت مولانا کی نیت کیا تھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی نیت اچھی تھی یا بری ہمیں بہرحال زبردست فائدہ ہوا ہے۔ نہ وقت کا سب سے بڑا نقاد زلزلہ کو سراہتا نہ ہماری نیندیں حرام ہوتیں نہ ہم ریزائی موچھوں پر تاؤ دیکر میدان میں اترتے۔ اگر ہم واقعتاً اصلی دیوبندی ہیں تو ہم سب کا اخلاقی فرض ہے کہ ہم مولانا عامر عثمانیؒ کے بلندی درجات و مراتب کی دعا کریں جن کے قلم کی ایک ہی ضرب نے ہمیں چونکا دیا۔

کم از کم میں تو ایک دیوبندی ہونے کی حیثیت سے بیانگِ دہل یہ کہوں گا کہ مولانا عامر عثمانیؒ کے مدبرانہ اقدام کا ہزار بار شکریہ جس نے ہمارے دماغوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہمیں ہوشیار اور بیدار کر دیا۔ اور آج ہم دلائل و براہین کے معنوی ہتھیاروں سے لیس ہو کر زلزلہ جیسی گمراہ کن کتابوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ہیں۔

پیشِ نظر کتاب جناب نجم الدین احیائی کے علم و فکر کا نتیجہ ہے — یہ کتاب بھی زلزلہ کی رد میں قلم بند کی گئی ہے مؤلف نے اس کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ ارشد القادری نے اپنی کتاب زلزلہ میں جو واقعات نقل کئے ہیں وہ من وعن صحیح نہیں بلکہ ان میں من مانیوں کی ملاوٹ ہے۔ ارشد القادری نے تحریف، ترمیم، کانٹ چھانٹ اور کتربیونت سے کام لیا ہے اگر احیائی صاحب صرف یہ دعوی کرنے پر اکتفا کرتے کہ قادری صاحب دنیائے تحریف کے لاجواب سپہ سالار ہیں تو ہمیں کبھی یقین نہ آتا۔ لیکن انھوں نے بطور ثبوت چند نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ پھر بھی ہم نے احیائی صاحب کی باتوں پر اعتماد نہیں کیا بلکہ زلزلہ دیکھی۔ اس میں جن کتابوں کے حوالے دیئے گئے تھے پھر انھیں دیکھا۔ دیکھنے کے بعد حیرت ہوئی اور پھر واقعتاً ہم قادری صاحب کی فنکاری اور کلاکاری کے قائل ہو گئے اور اب ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ارشد القادری صاحب کو کتابوں میں تحریف و تلبیس کرنے کا مکمل استحقاق حاصل ہے۔

گستاخی معاف ہم قادری صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ فن انہوں نے کہاں سے سیکھا۔ وہ کونسا ادارہ ہے جہاں تحریف و تلبیس کا درس دیا جاتا ہے اور جس کی چہار دیواری میں کامیاب محرف بننے کے لئے مشق کرائی جاتی ہے۔ باقاعدہ اور باضابطہ مشق کے بغیر قادری صاحب کو دنیائے تحریف میں یہ اعلیٰ ترین مقام حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

بہتر ہوتا اگر ارشد القادری صاحب جاسوسی ناول لکھا کرتے۔ اس لئے کہ ان کے اندر معدوم کو موجود، جھوٹ کو سچ افسانہ کو حقیقت اور ظالم کو مظلوم ثابت کرنے کی اہلیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کی داد چاہنے کے لئے جس لائن کا انتخاب کیا ہے وہ غلط ہے۔ اس راستہ پر چل کر انھیں کیا مل سکتا ہے۔ یہ تو وہ پر خطر راہ ہے جہاں تنقید دل کی گہرائی سے ہوا کرتی ہے اور تعریف برائے نام جہاں تالیاں، بہت کم پٹتی ہیں اور از راہِ تنقیص زیادہ — اس لائن میں مکر و فن کی بھلا کیا قیمت ہو سکتی ہے ؟ —

کاش قادری صاحب اپنے انتخاب پر نظر ثانی کر لیں اور اس راہ کو ترک کر دیں جس پر چل کر نہ انھیں دنیا میں کچھ حاصل ہو سکتا ہے نہ آخرت میں۔

زلزلہ در زلزلہ میں صرف قادری صاحب کی غلط بیانی کا بھانڈا پھوڑنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ علم غیب کے بارے میں اصولی بحث بھی کی گئی ہے اور کتاب کے آخر میں انھوں نے علمائے دیوبند، عامۃ المسلمین وغیرہ کو مخاطب کر کے چند زریں نصیحتیں بھی کی ہیں۔ اور خطاب و گفتگو کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ خشک موضوعات میں بھی تھوڑی سی تری پیدا ہو گئی ہے۔ مجموعی اعتبار سے زلزلہ در زلزلہ ایک اچھی اور قابل تعریف کوشش ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان غلطیوں کی نشاندہی بھی کر دی جائے جو دوران مطالعہ میں ہم نے شدت کے ساتھ محسوس کی ہیں غلطیاں کتابتی بھی ہیں اور ادبی بھی۔ ان غلطیوں کی نشاندہی محض اس لئے کی جا رہی ہے تاکہ اگلے ایڈیشن میں انھیں دور کیا جا سکے۔ ہم کسی غلطی کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر نہیں کریں گے کہ یہ کتابتی ہے یا ادبی بلکہ مولف سے گزارش ہے کہ وہ خود ہی سوچیں اور فیصلہ کریں کہ غلطی کس قسم کی ہے اور کس فہرست میں شمار کی جانی چاہئے۔

ص۹ پر تحریر موجود ہے۔

"ہم نے زلزلہ کی صرف ان ہی خیانتوں کو چھیڑا ہے جو کھلی ہوئی ہیں اور جن کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ وہ خیانت جان بوجھ کر کی گئی ہے"

ظاہر سی بات ہے کہ آخری سطر میں "خیانتیں جان بوجھ کر کی گئی ہیں" ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ پہلی سطر میں خیانت کا لفظ جمع کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

اسی صفحہ پر یہ جملہ بھی دیکھا جا سکتا ہے:۔

"ہمارے نزدیک قبولیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں"

مفہوم کا نہیں معیار کا محل تھا

ص۱۳ پر تیسری سطر میں دو جگہ نون غنہ "ں" اڑ گیا ہے۔

ص۲۱ پر ہے:۔

"کون ہے اس کا پڑھنے والا"

سیاق و سباق کے اعتبار سے یہاں "کون ہے اس کا پڑھنے والا" ہونا چاہئے تھا۔ اس کا پڑھنے والا غلط ہے

ص۲۵ انھیں کیا خبر ہے کہ یہ کون ادارہ ہے۔

یہاں "کونسا ادارہ کر لیا جائے"

ص۳۵ ساتویں سطر میں لفظ "یہ" چھوٹ گیا ہے جس سے مفہوم کے اندر کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بھی ڈنکے کی چوٹ کہہ لیا جائے تو بہتر ہے۔

ص۳۶ پر۔ "حالانکہ اس کتاب میں مندرجہ ذیل عبارت" صحیح یوں ہوتا "حالانکہ اس کتاب میں عبارات مندرجہ ذیل طریقہ پر ہیں"۔

ص۳۸ "معافی مانگنا تو کجا انعام بھیجنا تو الگ رہا"

الگ رہا کی جگہ "درکنار" ہوتا تو مناسب تھا۔

ص۳۹ پر "اور پھر ایسی باتیں کرنے لگتا ہے کہ کہنے والا یہ نہ کہہ سکے اس آدمی کے پاس عقل نام کی کوئی چیز ہے بھی یا نہیں"۔

مفہوم الجھ کر رہ گیا ہے۔ جملہ یوں لکھا جاتا "اور وہ پھر ایسی باتیں کرنے لگتا ہے کہ سننے والا یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ اس آدمی کے پاس عقل نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔

ص۴۲ نگاہ ہو گی غلط ہے

"نگاہ پڑے گی" ہونا چاہئے۔

ص۴۳ "تصنیف و تالیف کی حالت میں مولوی قادری صاحب کا جرم اتنا گھناؤنا ہے کہ کوئی اگر یہ کہے کہ نقش حیات کے مصنف پر عظیم ترین افترا اور کھلی ہوئی زیادتی کی ہے تو کیا غلط کہے گا"

اس مفہوم کو الفاظ بدل کر نذر ناظرین کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس جملہ میں جھول اور سقم محسوس ہوتا ہے جو یقیناً مولف کو بھی محسوس ہوگا۔ اگر وہ گہری نظر سے دیکھنے کی زحمت گوارہ کریں۔

ص۴۳ "ص۳ کی عبارت بالکل آخیر میں نقل کیا"

"نقل کی گئی" ہونا چاہئے تھا۔

ص۵۸ "وہ اچھے آدمیوں کی طرح اپنی بات واپس لینے میں شرافت کا ثبوت دیں گے"

جملہ تھوڑی سی تبدیلی کے بعد اس طرح کر لیا جائے۔

"وہ اچھے اور انصاف پسند آدمیوں کی طرح اپنے الفاظ واپس لے کر سنجیدگی اور شرافت کا ثبوت پیش کریں گے"۔

ص۶۷ "بے خدا کے بتائے کسی کو چاہے وہ نبی ہو یا رسول ولی ہو یا قطب ذرہ بھر کا علم ماننا کفر ہے"

"ذرہ بھر کا علم" کی جگہ "عالم الغیب" ہوتا تو بات صحیح اور مناسب تر ہوتی۔ موجودہ صورت میں جملہ مہمل ہو کر رہ گیا

درجہ غلطی اس درجہ ظاہر و باہر ہے کہ عقلی گھوڑے دوڑائے بغیر بھی محسوس ہوتی ہے۔

ص۹۰ "انسان اسی کو سانپ دیکھنے لگتا ہے"۔ غلط
انسان اسی کو سانپ "محسوس" کرنے لگتا ہے۔ صحیح۔

ص۹۴ "پہاڑوں پر کود رہا ہے"۔ غیر درست۔
"پہاڑوں سے کود رہا ہے" درست۔

ص۹۶ "بریلوی جماعت نے آپ کو "فاتح بھیت پور" کا خطاب دیا تھا۔ اور آپ اتنی گری ہوئی بات کر رہے ہیں"۔

ہونا یوں چاہئے تھا کہ "آپ اتنی گری ہوئی بات کیسے کہہ رہے ہیں"۔ یا یوں ہوتا کہ "آپ اتنی گری ہوئی حرکت کیسے کر رہے ہیں" — کہہ رہے ہیں اور کر رہے ہیں کے فرق کو محسوس کیجئے۔

ص۹۸ پر۔ "صوفی کی جمع اصفیاء تحریر کی گئی"۔

ہمارے خیال میں صوفی کی جمع "اصفیاء" غلط ہے صوفی کی جمع "صوفیاء" آتی ہے۔ آئندہ اصفیاء کاٹ کر صوفیا کر لیا جائے۔

ص۱۰۴ "مزارات کی جائدادوں پر لات مار دیا"۔

"جائدادوں" کا لفظ بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ کوئی دوسرا مناسب لفظ ڈھونڈئیے۔ "لات مار دیا" کی جگہ "لات مار دی" کر دینا ضروری ہے۔

ص۱۳۷ "فَلَمَّا رَاٰی اَیْدِیْھِمْ" غلط ہے۔
"اَیْدِیَھُمْ" ٹھیک ہوتا ہے۔
یعنی ی پر زبر اور ھ پر پیش ہونا چاہئے۔

ص۱۴۹ "لَقَدْ لَقِیْنَا"
یہاں "ی" کے نقطے اڑ گئے۔
"لَقِیْنَا" ہے۔

ص۱۶۰ "وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ"۔
یہاں "ب" کا نقطہ غائب ہو گیا۔ "یَنْبَغِیْ" ہوتا۔

ص۲۰۵ "اس نئے دین کا پول کھولیں"
اس نئے دین کی "پول کھولیں" کیا جائے۔

اسی صفحہ پر "جو قبوری لٹریچر کا پردہ فاش کر دے" "کر دیں" ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ پچھلی سطر میں کتاب کا نہیں "کتابیں" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔
"تعویز گنڈے"۔
"تعویذ گنڈوں" کر لیا جائے۔

اب آئیے ایک سرسری نظر ان مقامات پر بھی ڈال لی جائے جہاں ہمیں بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

صفحہ ۱۴ پر فرمایا گیا کہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عبارت برہان کی ہے، مولانا مدنیؒ کی نہیں۔

نقش حیات ہمارے پاس نہیں ہے اور نہ جانے کتنے حضرات کے پاس نہیں ہوگی جو زلزلہ در زلزلہ کا مطالعہ کریں گے لہٰذا ضروری تھا کہ نجم الدین احیائی صاحب یہ واضح کر دیتے کہ برہان سے جو اقتباس نقش حیات میں منتقل کیا گیا ہے وہ کن صاحب کے علم و فکر کا نتیجہ تھا۔ برہان نہ کسی عالم کا نام ہے اور نہ کسی مشہور کتاب کا۔ بلکہ وہ ایک ماہنامہ رسالہ ہے اور ماہانہ رسالوں میں صرف ایڈیٹر ہی دماغ ریزی نہیں کرتا بلکہ دوسرے قلمکاروں کے مضامین بھی برابر اور بدستور شامل اشاعت رہا کرتے ہیں۔

پھر صرف کسی رسالہ کا حوالہ دے دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ دانشمندی تو اس وقت ہوتی جب یہ واضح کر دیا جاتا کہ برہان سے جو اقتباس اخذ کیا گیا ہے وہ کس کے فکر و شعور کی اولاد ہے۔ اور یہ بھی واضح کر دینا اشد ضروری تھا کہ مولانا مدنیؒ نے ان صاحب کے نظریات و مزعومات کی تائید کی ہے یا تردید۔ حیرت کی بات ہے کہ قادری صاحب نے صاحب مضمون کے نام کی نشاندہی کی اور نہ نجم الدین احیائی نے۔ اس سلسلہ میں اگر ابہام و اختفاء اور پردہ پوشی کسی خاص مصلحت کی بنا پر کی گئی ہے تو بات الگ ہے لیکن اگر صرف چوک ہو گئی ہے تو اگلے ایڈیشن میں اس کا ازالہ ضروری ہے۔

ص۵۶ پر یہ عبارت جلوہ گر ہے:۔
"کتاب کے پیش لفظ میں یہ صاف صاف لکھا ہوتا ہے کہ کتاب کے مصنف کتاب

لکھتے وقت صرف بی۔ اے تھے۔ وہ فاضلِ دیوبند تو الگ رہا کسی اسلامی درسگاہ کے بھی فاضل نہ تھے۔ بعد میں پھر انہوں نے ایم۔ اے کیا۔ بھلا ہو قادری صاحب کا کہ انھوں نے "مولانا محمد احسن نانوتوی" کے مصنف جناب محمد ایوب قادری ایم۔ اے کو فاضل دیوبند کی سند بھی عنایت فرما دی تاکہ قارئین پر اس کا اثر پڑے کہ دیکھتے کہ ایک فاضل دیوبند اپنی کتاب میں دارالعلوم دیوبند کو "معاون سرکار انگریزی" کہتا ہے"۔

ہم محترم نجم الدین اصلاحی سے گذارش کرتے ہیں کہ لمحہ بھر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ کتاب مرتب کرتے [وقت] ایوب قادری صاحب صرف ایم۔ اے نہیں فاضل دیوبند [بھی] تھے تو ہمارا کھس کیا جاتا ہے۔ فاضلِ دیوبند اور سند [کسی] علوم کو ئی معیار نہیں ہے۔ اگر آپ ان چیزوں کو حق [و باطل] کا معیار بنائیں گے تو آپ کو زبردست خسارہ اور [رسوائی] برداشت کرنی پڑے گی۔ فاضل دیوبند کچھ بھی کہتے [رہیں ہمیں] اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے اور نہ [ہمیں] فاضلین دیوبند کا دفاع کرنے کے لئے تاویلات [و توجیہ]ہات کے دفتر مرتب کرنے چاہئیں۔ ہمیں تو صرف [دیوب]ندی مکتبِ فکر سے غرض ہے اور اسی کا دفاع کرنا ہمارا [مقصو]د و مقصد ہونا چاہئے

ہم بے شمار ایسے حضرات سے واقف ہیں جو دارالعلوم [دیوبند] سے سند یافتہ ہیں لیکن اب قطعی طور پر اسلام سے [منحر]ف ہو چکے ہیں اور ظاہر و باطن ہر دو اعتبار ملحد بنکر [رہ] گئے ہیں۔ ایسے تمام حضرات کے رویوں اور کرتوتوں کی [وجہ سے] دیوبندی مکتب فکر سے بدظن ہو جانا اگر حماقت [ہے] تو پھر یہ بات بھی حماقت و جہالت سے کسی درجہ کم نہیں [ہو]گی کہ ہم ان حضرات کی حمایت کرتے پھریں جو دیوبندی [مکت]ب فکر کے چہرے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ تو کھل کر ارشد القادری اور ان کے حواریین سے کہہ دیجئے کہ دیوبندی مکتب فکر میں اگر کوئی بات خلافِ قرآن و حدیث محسوس ہو تو ہم سے رجوع کیجئے، ہم دلائل و براہین کی موجودگی میں گفتگو کریں گے اور دیوبندی عقیدے کو قرآن و حدیث کی روشنی میں برحق ثابت کر کے دکھائیں گے۔ رہے فاضلین دیوبند تو ان کی ہر بات قابل التفات نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ان کی ٹائیں ٹائیں فش اور لاف و گزاف کی وجہ سے دیوبندی عقیدے پر آنچ آتی ہے۔ اگر کسی مسلمان کے گھٹیا کردار کی وجہ سے اسلام سے بدظن ہو جانا بیوقوفی کی بات ہے تو کسی فاضل دیوبند کی نارروا اور خلاف عقیدہ باتوں کی وجہ سے دیوبندی مکتب فکر سے بدظن ہو جانا بھی بیوقوفی اور دیوانگی کی علامت ہو گی۔

فاضل دیوبند کی بات چھوڑئیے۔ اگر کبھی کسی دارالعلوم کے استاد کو کوئی خاص قسم کا دورہ پڑ جائے اور وہ دارالعلوم کے خلاف زہر افشانی کرنے لگے تب بھی دارالعلوم کی تقدیس و حقانیت میں ذرّہ برابر کمی واقع نہیں ہو سکتی۔

آپ نے خود بھی تو ایک جگہ مجملاً یہی ارشاد فرمانے کی کوشش کی ہے جو ہم نے اوپر عرض کیا ہے۔ آپ ص۱۰۶ پر رقمطراز ہیں:-

"پھر اگر مان لیا جائے کہ یہ برہان کا مقالہ نگار بھی کوئی دیوبندی ہوگا تو ہوتا رہے"۔

یہی بات اگر آپ ص۵۶ پر بھی عرض کر دیتے اور ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کر دیتے تو آئندہ کے لئے خلاصی نصیب ہو جاتی اور روز روز کی جواب دہی سے جان چھوٹ جاتی۔

ص۵ پر۔ "مولانا اسمٰعیل شہیدؒ ہوں یا مولانا تھانویؒ مولانا قاسمؒ ہوں یا قاری طیب مدظلہ، ان میں سے ہر ایک یہی کہتا ہے کہ معیار اصلی قرآن و حدیث ہیں۔ ان بزرگوں کے ماننے والوں میں الحمدللہ ایک بھی ایسا آدمی نہ ملے گا جو انھیں غلطیوں سے پاک سمجھتا ہو یا انھیں اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یا صحابہ کرام اور اولیاء اللہ عظام سے برتر تو
کجا برابر بھی سمجھتا ہو"۔

اس جملہ کا ہر لفظ منہ سے بول رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ یہاں مؤلف صاحب کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن کچھ اور کہنے کے لئے انھیں مناسب الفاظ نہیں مل سکے۔ اس لئے جملہ پھسپھسا ہو کر رہ گیا ہے ان کا مدعا واضح نہیں ہو سکا ہے۔ خیر یہ بات تو انتہائی رکیک ہے اسے ذہین و فہیم آدمی ہی محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن جملہ میں ایک ایسی خامی بھی موجود ہے جسے وہ حضرات بھی تاڑ سکتے ہیں جن کی نگاہِ بصیرت کمزور ہو ـــ آخری سطروں پر نظر ڈالئے اور ابتدائی سطروں کو بھی ملحوظ رکھئے یہ مطلب برآمد نکلے گا۔

"مولانا اسمٰعیل شہیدؒ ہوں یا مولانا تھانویؒ مولانا قاسمؒ ہوں یا قاری طیب مدظلہٗ ان بزرگوں کے ماننے والوں میں الحمدللہ ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جو انھیں غلطیوں سے پاک سمجھتا ہو یا انھیں اولیاء عظام سے برتر تو کجا برابر بھی سمجھتا ہو"۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ بزرگان دین بھی اولیاء عظام نہیں ہیں تو اولیاء عظام کا اطلاق کن حضرات پر ہوگا؟۔

ان حضرات کو کھینچ تان کر صحابہ کرام کے مساوی قرار دیدینا یا کسی نبی کے مقام تک پہنچا دینا تو بلاشبہ جرم ہے منجملہ نا زیبا ہے۔ لیکن انھیں اولیاء عظام سمجھنے میں کیا قباحت ہے، کونسا گناہ ہے۔ اگر مذکورہ حضرات اولیاء اللہ اور اولیاء عظام کہلانے کے مستحق نہیں ہیں تو پھر آخر کن حضرات کو اولیاء عظام اور اولیاء اللہ کا خطاب دیلئے جائے گا ـــ؟

ص۹ پر۔ "ہم قوم کے سامنے کھلے عام یہ اعلان کرتے ہیں کہ علماء دیوبند کا معاذاللہ یہ عقیدہ نہیں ہے کہ ان کے وفات یافتہ بزرگ ان معنوں میں زندہ ہیں جن معنوں میں عام طور پر زندہ کا لفظ بولا جاتا ہے اور نہ وہ صاحبِ اختیار ہیں اور نہ انھیں ہر طرح کے تصرف کی قدرت حاصل ہے"۔

اس جملہ سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیوبندی حضرات بھی کسی نہ کسی درجہ میں اس بات کے قائل ہیں کہ مرنے کے بعد بزرگوں کو تصرف و اختیار کی قدرت حاصل رہتی ہے۔ اگر قائل نہ ہوتے تو نجم الدین احیائی اتنی دھماکے ساتھ یہ اعلان کیسے کر دیتے جس کا پس منظر یہ ظاہر کر رہا ہے کہ مرنے کے بعد بزرگوں کو ہر طرح کے تصرفات کی قدرت حاصل رہے یا نہ رہے لیکن کسی نہ کسی قسم کے تصرف کی قدرت لازماً حاصل رہتی ہے۔

ص۱۰ کی عبارت سے بھی نجم الدین احیائی صاحب کے مذکورہ بالا خیال کی تائید ہوتی ہے۔

"علمائے دیوبند ہرگز یہ نہیں کہتے کہ اللہ کے علاوہ غیب کی کوئی بات کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح وہ اس بات کے قائل بھی نہیں ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں یا مرنے کے بعد سرے سے کوئی تصرف نہیں کر سکتا"۔

اس بات کو ہم ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک قرآن و احادیث سے ایسے نظائر نہ پیش کئے جائیں جن سے یہ ثابت ہو کہ مرنے کے بعد بھی بزرگان دین تصرفات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

محترم نجم الدین صاحب سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ وہ قرآن و احادیث سے یہ ثابت کر کے دکھائیں کہ مرنے کے بعد بزرگوں کو ادنیٰ درجہ کے تصرف کرنے کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ضروری بات گوش گذار کر لیجئے کہ بزرگوں کے واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی۔ معاملہ مسائل کا نہیں بلکہ عقائد کا ہے

س لئے قرآن واحادیث سے دلائل پیش کیجئے۔ دلائل
کے بغیر مذکورہ بالا تصور کوئی وزن نہیں رکھتا ـــــ خواہ
علقۂ دیوبند اس تصور کا قائل ہو یا حلقۂ بریلی۔

ص۱۰۲ پر ارشاد فرمایا:۔

"ہر انسان کو چاہے وہ اس دنیا میں ہو یا عالم
برزخ میں اسے اللہ کی اجازت اور اس کا
فیض ضروری ہے جب تک اجازت ہے
تب تک عالم برزخ سے بھی کچھ روحیں آکر
دنیا والوں کی مدد کرتی ہیں اور انھیں بعض
باتیں بتا دیتی ہیں"۔

قابلِ افسوس بات ہے کہ جو آدمی خود بھی صحیح العقیدہ
ہے اور صحیح العقیدہ جماعت کا ذ فارغ کر رہا ہے اسکے
لم سے ایسی واہی اور خام باتیں خارج ہو رہی ہیں جن کا
نقص اور بے بنیاد ہونا اظہر من الشمس ہے۔

ص۹۶ اور ص۱۱۱ پر جو واقعات زلزلہ کے حوالہ
سے نقل کئے گئے ہیں انھیں قبول کرنے میں ہمیں تردد ہے
بہتر تو یہ ہے کہ ان واقعات کو دیوار پر دے مارا جائے۔
س لئے کہ یہ ہمارے بنیادی عقائد سے متصادم ہیں۔ ان کو
ر کرنے کے لئے ارشد القادری صاحب نے جو ریمارک
یا ہے اس سے ہمیں کامل اتفاق ہے اور اس ریمارک
پ آپ نے جو لب کشائی کی ہے وہ خواہ مخواہ کی حیثیت
ی ہے اور اس پر ستنا یا ہٹ دھرمی کا اطلاق ہوتا
ہے۔ اپنی اور اپنے من پسند گروہ کی کسی بھی غلطی اور
معصیت کا اعتراف نہ کرنا ہٹ دھرمی نہیں تو
پھر اور کیا ہے ـــ؟

آپ نے اپنی تالیف میں ایک جگہ بھی تو یہ تحریر نہیں
مایا کہ یہاں ارشد القادری صاحب کا ریمارک عدل و
یانت پر مبنی ہے اور یہاں واقعتاً ہمارے بڑوں سے
بھول ہوگئی تھی۔ کاش سہواً ہی کہیں آپ نے اپنی
غلطی تسلیم کر لی ہوتی تو یہ سہو آپ کی انصاف پسندی
پر دلالت کرتا۔

گستاخی معاف میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں
کہ حلقۂ دیوبند میں عامر عثمانی رہ وہ آخری شخص تھے
جنھیں حق و صداقت سے محبت تھی جنھوں نے سچائی اور
صداقت سے کبھی راہِ فرار اختیار نہیں کی انھوں نے حقائق
سے روگردانی اس وقت بھی نہیں کی جب حقائق سے
چمٹے رہنے میں خسارہ ہی خسارہ انھیں نصیب ہو رہا ہو۔

اب دور دور تک ہمیں کوئی بھی ایسا آدمی نظر
نہیں آتا جو حقیقتاً حق پرست اور صداقت پسند ہو
اور جس کے اندر اپنی خامیوں کا اعتراف کر لینے کی
جرأت پائی جاتی ہو۔ اللہ ہمارے اوپر رحم فرمائے اور
ہمارے اندر حق پرستی کی اسپرٹ پیدا کر دے۔ آمین!

غلطیاں اور خامیاں تو کمی اور زیادتی کے ساتھ
تقریباً سبھی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ اگر زلزلہ در زلزلہ
میں بھی کچھ خامیاں محسوس ہوں تو کوئی قابلِ حیرت
بات نہیں)۔

ویسے یہ تو ہم عرض کر ہی چکے ہیں کہ کتاب مجموعی
حیثیت سے اچھی اور مفید ہے اور اس قابل ہے کہ اسے
خرید کر پڑھا جائے۔

مزاروں کی جھلکیاں

تالیف:۔ مولانا عبد المالک صابر الحسینی
صفحات (۱۰۴) کتابت۔ طباعت
کاغذ عمدہ۔
شائع کردہ:۔ مدرسہ ضیاء العلوم
گدڑی بازار۔ بلیا۔ یو۔ پی۔

اگر اس کتاب کو سفر نامہ کہا جائے تو خلاف واقعہ
نہیں ہوگا۔ مؤلف نے مختلف مزارات اور عرس گاہوں کا
بذاتِ خود مشاہدہ کیا ہے اور اپنی آنکھوں سے انھوں نے
حاملین قبوری شریعت کے جو مشرکانہ کرتوت ملاحظہ کئے
ہیں انھیں قلم بند کر کے "مزاروں کی جھلکیاں" کے عنوان
سے عوام کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے آپ اپنے گھر بیٹھے ہی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یار لوگ قبروں پر جا کر کن کن حرکات و سکنات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کی عقیدت میں کس درجہ دیوانے ہوجاتے ہیں اور کس طرح اپنے ایمان و اسلام کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

مزاروں کی جھلکیاں پڑھنے کے بعد آپ پر یہ واضح ہوجائے گا کہ خود کو مسلمان کہنے والے مزاروں کے اردگرد منڈلاتے ہوئے کیسے کیسے نازیبا بلکہ بیہودہ اعمال و افعال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور جوشِ عقیدت میں ان حدود کو پار کرجاتے ہیں جن کو پار کرنے کے بعد بلا شبہ آدمی احاطۂ کفر و شرک میں داخل ہوجاتا ہے۔

من حیث المجموع کتاب دلچسپ اور مزیدار ہے۔ مؤلف نے بڑے ہی دل کش اور پُر لطف انداز میں روداد سفر مرتب کی ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت کوفت اور کوفت نہیں ہوتی بلکہ اختتام پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

یہ تو ہوئی وہ اچھی تعریف جس سے روگردانی کرنا بددیانتی ہی پر محمول کیا جاتا۔ ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ صرف تعریف و تحسین پر اکتفا نہ کریں بلکہ ان غلطیوں کی بھی نشاندہی کردیں جن کی موجودگی میں کتاب بے غبار اور بہترین نہیں کہلائی جاسکتی۔

اصل کتاب شروع ہونے سے پہلے ایک فاضل دیوبند صاحب نے محترم مؤلف صاحب کا تعارف کرایا ہے — اس تعارف میں ایک جگہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باعثِ کون و مکاں بتایا ہے۔

ہم اس بات کو خوش فہمی اور شاعری سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے ہزار مرتبہ یہ سنا کہ :-

محمدؐ نہ ہوتے تو دنیا نہ ہوتی

لیکن تحقیق و جستجو کے بعد بھی کوئی ایسی مضبوط دلیل ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکی جس سے اس تصور کی تشفی بخش تائید ہوجاتی۔ اور جب تک حقائق اور دلائل کے ذریعہ تائید و تصدیق نہیں ہوجاتی اس وقت تک ہم مذکورہ بالا خیال کو خوش عقیدگی اور شاعری سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ان تعارف کرانے والے صاحب سے ایک زبردست چوک اور بھی ہوگئی ہے۔ انھوں نے ص۱۴ پر یوں تحریر فرمایا ہے :-

"انك لا تسمع الموتی وما انت بمسمع من فی القبور"

پڑھنے والا اگر حافظ اور عالم نہیں ہوگا تو یہی گمان کرے گا کہ یہ قرآن کی ایک ہی آیت ہے۔ حالانکہ یہ الگ الگ آیتیں ہیں۔ انك لا تسمع الموتی سورۂ روم کی آیت ہے اور سورۂ روم ۲۱ ویں سیپارہ میں ہے۔ اور وما انت بمسمع من فی القبور سورۂ فاطر کی آیت ہے اور سورۂ فاطر ۲۲ ویں سیپارے میں ہے۔ ان دونوں آیتوں کے مابین کسی بھی طرح فصل کرکے یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ یہ دو الگ الگ آیتیں ہیں جو قرآن حکیم میں جدا جدا مقام پر مذکور ہوئی ہیں۔

ص۲۶ پر مؤلف نے شاہ معین الدین چشتی کی رحمت بیان کرتے ہوئے فرمایا :-

"آپ کی ستانوے سالہ زندگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تریسٹھ سالہ زندگی کے مطابق تھی"۔

اسے مبالغہ آمیزی کے ماسوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ کسی بھی بڑے سے بڑے بزرگ اور قطب کی دینی جدوجہد اور اطاعت شعاری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی کاوشوں اور اطاعت شعاریوں سے تشبیہ دینا کم از کم افراط اور غلو کے قبیل سے ہے۔ واقعیت سے اس جوڑ ملانا نادانی ہی کی بات ہوگی۔

ص۲۶ اور ص۲۷ پر مؤلف نے ایک عبارت کی نسبت شاہ معین الدینؒ کی طرف کی ہے۔ حالانکہ لب و لہجہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ عبارت شاہ صاحب کی نہیں ہے۔ مؤلف نے کسی کتاب کا حوالہ دینے کی زحمت گوارہ نہیں کی — اگر

حوالہ دیا ہوتا تو ہم کتاب دیکھ کر اپنا وہم دور کر لیتے۔

ایک جگہ جناب احمد رضا خاں صاحب کے بارے میں یوں گل افشانی کی گئی :-

"حالانکہ ان کا مقام تصنیف و تالیف میں
تقریر و تحریر میں، خطابت و ولایت میں
ہندوستان کی ہر جماعت کے صاحب نظر
پر واضح ہے" ص۱۳

ہمارا خیال ہے کہ ولایت کا لفظ بے خیالی میں سپردِ کاغذ ہو گیا ہے۔ ورنہ ہندوستان کی ہر جماعت کے صاحب نظر کی بات تو چھوڑیے خود مؤلف صاحب بھی جناب احمد رضا خاں صاحب کو ولی گمان نہیں کرتے ہوں گے۔

ایک جگہ یہ عبارت نظر سے گذری :-

"میں نے خاں صاحب کی چند مشہور کتابیں طلب
کیں تو مجھے یہی جواب ملا کہ اس وقت زیر طبع ہیں۔
یہ حسن اتفاق ہے کہ جو کتابیں طلب کیں وہ سب
کی سب زیر طبع تھیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات
نے مجھ سے کوئی حیلہ نہیں کیا بلکہ ان کے پاس کتابیں
واقعی موجود نہیں تھیں" ص۱۴

مطلوبہ کتب کا موجود نہ ہونا حسن اتفاق پر کیسے محمول کیا گیا اسے تو سوء اتفاق ہی کہنا درست ہوگا۔ ممکن ہے کہ مولانا یہاں اپنی بزرگی اور کرامت کا اظہار کرنا چاہتے ہوں کہ خدا مجھے ان کتابوں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جو کتابیں میں نے طلب کیں وہ موجود ہی نہیں تھیں۔

خود پرستی اور بزعم خود کے اس دور میں یہ بات کوئی ناممکنات میں سے نہیں۔ لیکن پھر بھی ہمیں مولانا سے ایسی گھٹیا بات کی توقع نہیں کرنی چاہئے — خدا کرے یہ لفظوں کی غلطی ہو۔

ایک جگہ یہ عرض کیا گیا :-

"آپ تصور فرمائیں کہ کوئی ایسی جگہ ہو جس میں بمشکل
دو سو آدمی داخل ہو سکتے ہوں وہاں اگر دو ہزار
آدمی گھس جائیں تو لوگوں کا کیا حال ہوگا" ص۳

جس جگہ دو سو آدمیوں کی دخولیت بمشکل تمام ہو پاتی ہو وہاں دو ہزار آدمیوں کا ادخال بمشکل تمام بھی محالات اور ناممکنات کے قبیل سے ہے۔ دو ہزار کی بجائے اگر چار سو کہا جاتا تو بات عقلی اعتبار سے درست اور قرینِ فہم ہو سکتی تھی۔ اور اس صورت میں بھی بات کہنے کا مقصد و منشا پورا ہو جاتا۔ ثابت بس یہی تو کرنا تھا کہ جگہ افراد کی نسبت سے کم تھی۔ اور افراد جگہ کی نسبت سے زیادہ تھے۔ یہ بات مبالغہ آمیزی سے پہلو تہی کرتے ہوئے بھی ثابت کی جا سکتی تھی۔

ایک جگہ یوں لکھا گیا ہے :-

"ان کیفیات کا اندازہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا
کچھ بہتر وہی شخص اندازہ لگا سکتا ہے جو کبھی مزار کے
اندر سے گذر آیا ہو" ص۴

جملہ مضحکہ خیز ہو کر رہ گیا ہے۔ بہتر ہے کہ پورے ہی جملہ کی مرمت کر لی جائے۔ مفہوم میں کوئی خرابی نہیں الفاظ بدل دیجئے

اسی صفحہ پر آگے چل کر یوں ارشاد فرمایا گیا :-

"آدمیوں کے بدن کی گرمی اگربتی، لوبان وصندل
کے دھوئیں کے گیس دونوں نے مل کر لوگوں پر نیم
بیہوشی کا عالم طاری کر رکھا تھا۔ اس کے اندر
جیب تراش بھی گھسے ہوئے تھے اور جیبیں آسانی کے
ساتھ کتر رہے تھے۔ ہاتھوں سے گھڑیاں اتار
لیتے تھے۔ لوگوں کو محسوس بھی ہوتا تھا کہ جیبیں
اتر رہی ہیں"۔

اس جملہ کے اندر بھی ادبی کمزوریاں محسوس ہو رہی ہیں۔ لہٰذا اس میں بھی رد و بدل کیا جائے۔ بعض مقامات پر ادبی سقم دو اور دو چار کی طرح واضح ہو گیا ہے۔

مثلاً :-

"میں دو چار بار آگے بڑھا اور پیچھے ہٹا، یہ تسلسل اس
طرح رہا کہ بجائے خاموش ہونے کے اور کوئی سبیل
سمجھ میں نہیں آئی" ص۱۰

یا مثلاً :-

"جب بندہ سراپا تقویٰ اور سراپا شریعت کا پابند
ہو جاتا ہے تب مقام پر آتا ہے۔ اس کے بعد

معرفت حاصل ہوتی ہے" ص۸۰
تیسرا اور چوتھا نمونہ ملاحظہ فرمائیے :-
" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مقامات
اجابت دعا بتلاتی وہ یہ ہیں" ص۹۴
" میں نے زائرین کو دلی کی شاہجہانی مسجد کے
درو دیوار چومتے چاٹتے دیکھا۔ بادی النظر میں جتنا
عمدہ نظر آتا ہے اتنا ہی یہ برا ہے کیونکہ اس کے
جواز کے لئے نہ صاحب شریعت محمد صلعم کا کوئی حکم
موجود ہے اور نہ صحابہ میں اس طرح
کسی کو کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ لوگ مسجدوں میں
داخل ہوتے وقت پہلے دروازہ پر سجدہ کرتے ہیں
مسجد تو مقام عبادت ہے یہاں پہنچکر شریعت کے
احکام کے مطابق اللہ کو سجدہ کیا جاسکے گا۔ لیکن
مسجد کے درودیوار کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا
مسجدیں بت نہیں ہیں، اگر یہ جذبہ مسجد دری
حد تک محدود ہوتا تو کسی قدر تاویلات کے پردہ
میں چھپایا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ ذوق تو اتنا بڑھا
ہوا پایا کہ زائرین لال قلعہ کے اندر ہر چھوٹی بڑی
عمارتوں کو آنکھوں سے لگاتے تھے" ص۵۵

ان جملوں کے اندر جو ادبی سقم اور علت پائی جا رہی ہے
اس کا ادراک کرنے کے لئے قاری کا دوربین ہونا ضروری
نہیں ہے۔

مؤلف نے بعض مقامات پر طنز کرنے کی کوشش بھی کی ہے
لیکن کسی بھی جگہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں جہاں
جہاں انھوں نے طنزیات پر طبع آزمائی کی ہے، وہاں وہاں
بالکل ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی پرائمری اسکول میں پڑھنے
والا بچہ اپنے کسی حریف کو منہ چڑا رہا ہو۔

ہماری مؤلف سے کسی قسم کی شناسائی نہیں، نہ ہی کبھی
دیدار کی نوبت آئی۔ اس لئے ان کے بارے میں وثوق کے
ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس مزاج کے آدمی ہیں۔
لیکن چونکہ وہ کسی دینی مدرسے کے صدر مدرس ہیں۔ دوسرے
ان کا انداز تحریر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ یقیناً متشرع اور پرہیزگار
قسم کے آدمی ہوں گے۔ اور جو لوگ ذرا پرہیزگار اور صوفی ٹائپ کے
آدمی ہوتے ہیں۔ وہ جب کبھی کسی پر طنز کرتے ہیں تو انھیں خاطر
خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔

مؤلف محترم سے ہماری مؤدبانہ گذارش ہے کہ وہ تقدس
پرہیزگاری کے مورچوں سے خالص علمی انداز میں باطل اور
گمراہ فرقوں پر حملے کرتے رہیں اور طنز و تنقید کا محاذ ہم جیسے
نااہلوں کے لئے چھوڑ دیں۔ اس میدان میں آپ کی تشریف
آوری کسی اعتبار سے مناسب نہیں ہوگی۔ اور نہ ہی اس
محاذ پر آپ کو کامیابی نصیب ہونے کے امکانات ہیں۔ آپ کا
اپنا سیدھا سادا انداز تحریر مفید و مؤثر بھی ہے اور قابلِ
داد و تحسین بھی۔

ص۸۶ پر یہ حدیث نقل کی گئی ہے :-
"کنت نُهِیتُکُمْ عَنْ زِیَارَةِ الْقُبُوْرِ
فَزُوْرُوْهَا۔ الیٰ آخرہٖ۔

اس حدیث میں کتابت کی دو زبردست باقی رہ گئی
ہیں۔ نَهَیْتُکُمْ کوئی لفظ نہیں ہوتا" نُهِیْتُکُمْ ہونا
چاہئے تھا۔ فَزُوْرُوْهَا کی بجائے "فَزَوْرُوْهَا لکھا یا
گیا۔ ز پر زبر نہیں پیش ہونا چاہئے۔
ص۸۷ پر سَلَفْتُ کو سَلَفْنَا لکھا یا گیا ہے
ص۸۹ پر جو عربی عبارت نقل کی گئی ہے اس پر
نظر ثانی کر لی جائے۔

بس تبصرہ ختم ——— ہم توقع کرسکتے ہیں کہ
مزاروں کی جھلکیاں کا یہ پہلا ایڈیشن جلد یا بدیر ختم ہو جائیگا
اگر بفضل خداوندی دوسرا ایڈیشن چھپنے کی نوبت آئی تو
مندرجہ ذیل صفحات کی اشارہ کردہ سطروں کو بنظر غائر
دیکھ لیا جائے۔

ان سطروں میں کتابتی غلطیاں بھی موجود ہیں اور
ادبی بھی۔ ان غلطیوں کے ہوتے ہوئے کتاب کتابت
طباعت کی عمدگی کے باوجود دلکش اور بے داغ

کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔
ص۵ آخری سطر ص٦ تیسری اور چودھویں سطر
ص١٣ سولہویں سطر ص١٤ تیرہویں سطر ص١٥ چھٹی گیارہویں
اور آخری سطر ص١٦ پہلی دوسطر ص١٧ دسویں اور
بارہویں سطر ص١٨ چوتھی سطر ص٢٠ دوسری، آٹھویں
نویں دسویں اور گیارہویں سطر ص٢٣ گیارہویں بارہویں
سطر ص٢٤ دوسری سطر ص٢٦ ساتویں اور آٹھویں سطر
ص٢٩ نویں سطر ص٣٣ پندرہویں سطر ص٤٣ آٹھویں
سطر ص٤٧ پہلی سطر ص٤٩ چوتھی اور آٹھویں سطر ص٥٠
دوسری تیسری اور چوتھی سطر ص٥٤ پانچویں اور آخری سطر
ص٥٥ پانچویں اور دسویں سطر ص٥٧ چوتھی سطر ص٥٨
پندرہویں سطر ص٥٩ آخری سطر ص٦٣ بارہویں اور
آخری سطر ص٦٥ آٹھویں سطر ص٦٦ تیسری سطر
ص٦٨ آٹھویں اور نویں سطر ص٧١ تیرہویں سطر ص٧٢
گیارہویں سطر ص٧٥ آخری سطر ص٧٩ ساتویں سطر
ص٨٠ چھٹی سطر ص٨١ سولہویں اور سترہویں سطر ص٩٤
چوتھی اور پندرہویں سطر ص١٠٢ پانچویں سطر۔

تبصرہ کا حاصل یہ ہے کہ ہزاروں کی جھلکیاں جناب کتابتی خامیوں اور ادبی فروگذاشتوں کے باوجود ایک دلچسپ اور معلوماتی چیز ہے جسے خرید کر پڑھنے کے بعد انشاء اللہ پیسوں اور وقت کے ضائع ہونے کا احساس نہیں ہو پائے گا۔

ورق ورق روشن

تالیف :- سید شاہ قطب الدین حسن صابری
شائع کردہ :- دانش کدہ۔ محمد علی روڈ بمبئی ۸
صفحات ۷۰۸ - کتابت طباعت معیاری
کاغذ خاصا۔ قیمت مجلد تیس ۳۰ روپے۔

اس کتاب میں بڑی اور عظیم شخصیتوں کے اقوال جمع کئے گئے ہیں۔ ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔ کتاب کے شروع میں فہرست بھی دی گئی ہے تاکہ ناظرین کو کسی خاص موضوع پر اقوال تلاش کرنے میں الجھن اور دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

مثلاً "ت" کی تختی میں تصوّف، تاریخ، توبہ، تکلیف، تجربہ، تہذیب اور تھکن وغیرہ وغیرہ عنوانات متعین کئے ہیں اور ان عنوانات کے سامنے عمومی قاعدے کے مطابق صفحات کے نمبرات ڈال دیئے گئے ہیں تاکہ تلاش و جستجو کے وقت درد سر جنم نہ لینے پائے۔

اگر کوئی قاری تکلّف کے موضوع پر اقوال دیکھنے کا خواہش مند ہے تو پہلے وہ "ت" کی تختی نکال لے اس کے بعد لفظ تکلف کے سامنے دیا ہوا صفحہ نمبر دیکھ ڈالے۔ بعد معمولی سی ورق گردانی کے بعد اسے اپنا منتخب کردہ موضوع مل جائے گا۔ اور یہ مندرجہ ذیل اقوال اس کی نظروں کے سامنے آجائیں گے۔

"میری اور میری امت کے پرہیزگار لوگ
تکلّف سے بری ہیں" (حضرت محمدؐ)
"تکلف کی زیادتی محبت کی کمی کا باعث
بن جاتی ہے" —— (امام غزالیؒ)
"غریب مہمان آجائے تو قرض لے کر بھی تکلف
کردے" —— (امام غزالیؒ)
وغیر ذلک۔

بالکل اسی طرح ۳۷۹ موضوعات پر دس ہزار تین اڑتالیس اقوال اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ اقوال کے انتخاب و ترتیب میں اس بات کا خصوصی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر موضوع پر سب سے پہلے قرآن حکیم کی آیات کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ بعد بزرگان دین کے فرمودات و ملفوظات کو زیب قرطاس کیا گیا ہے۔ بعدہٗ درجہ بدرجہ فلاسفروں حکماء کے اقوال نوکِ قلم پر لائے گئے ہیں۔

عالی جناب محترم مؤلف صاحب کو اس کتاب کی تدوین و ترتیب میں جن الجھنوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ تو فہرست ہی پر نظر ڈالنے سے ہو جاتا

اتنے بہت سے موضوعات پر اقوال یکجا کر دینا کوئی آسان اور سہل کام نہیں ہے۔ توقع تو یہی ہے کہ ادب نواز اور علم دوست حضرات مؤلف مکرم کی عرق ریزی اور جاں فشانی کو سراہیں گے اور اس ذخیرۂ اقوال کی قدر کریں گے جو ان گنت اور گوناگوں مشقتیں اٹھانے کے بعد صاحب کتاب نے کاغذ کے ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر دیا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ورق ورق روشن "دانش کدہ" کی پہلی پیش کش ہے۔ کسی بھی ادارہ کی سب سے پہلی کتاب کا اس درجہ ضخیم اور طویل در طویل ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ادارہ کے بانی میاں انتہائی وسیع النظر اور باحوصلہ واقع ہوئے ہیں۔ کتاب اپنی نوعیت اور مخصوص طرز کے اعتبار سے بہر حال وسیع اور جامع کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے۔ مقررین اور واعظین کے لئے تو اس کتاب کی حیثیت تحفۂ دل آویز اور روح افزا سے کم نہیں۔

انسانی کارنامے کتنے ہی دلچسپ، متنوع اور احسن و اجمل کیوں نہ واقع ہوئے ہوں۔ وہ غلطیوں، خامیوں اور فروگذاشتوں سے مبرا نہیں ہوا کرتے۔

زیر نظر کتاب موضوع کی جدت اور انفرادیت کے اعتبار سے ایک کارنامہ ہی سہی لیکن بے داغ اور بے عیب نہیں ہے۔

ایک تبصرہ نویس کی حیثیت سے ہماری ڈیوٹی ہے کہ ہم ان اغلاط کی نشاندہی کر ڈالیں جو اپنے گھناؤنے وجود کی وجہ سے چہرۂ کتاب کو داغدار بنائے ہوئے ہیں۔

ان اغلاط کی موجودگی میں کتاب کی مثال دلکش اس دوشیزہ کی سی ہو گی جو بے مثال ناک نقشہ اور بے نظیر رنگ و روپ کے باوجود چند بدنما چیچک کے داغوں کی وجہ سے یا آنکھوں میں کھینگا پن آجانے کی وجہ سے اپنی وقعت کھو بیٹھی ہو اور ناظرین کی نگاہوں میں وہ مقام حاصل نہ کر سکی ہو جو لازمی طور پر اسے حاصل کر لینا چاہئے تھا۔

ممکن ہے کہ مؤلف اور ناشر دونوں ہی ہماری تنقید کو خیر خواہی اور ہمدردی پر محمول کریں اور اگلے ایڈیشن میں ان داغ دھبوں سے کتاب کو پاک و صاف کر ڈالیں جن کے ہوتے ہوئے کتاب اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر سکتی ——— دل و جذبات کا تقاضا ہے کہ غلطیوں کی نشاندہی سے قبل وہ اقوال نقل کر دیئے جائیں جو ہمیں بے حد پسند آئے۔ اور جو واقعتاً اس قابل ہیں کہ اپنی پرائیویٹ ڈائریوں میں نوٹ کر لئے جائیں۔

"جسے عمل پیچھے دھکیل دے اسے نسب اگلی صف میں نہیں لا سکتا" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

"خواہ کچھ بھی ہو جائے انصاف کے دروازے پر دستک نہ دو۔ ظلم برداشت کرتا۔ مشکلات میں گھر جانا بہتر ہے اس سے کہ عدالتوں کے چکروں پڑ کر صحت، وقت اور دولت تباہ کی جائے"

(سرجان ڈیلز)

"مصروف آدمی کے پاس آنسو بہانے کا وقت نہیں ہوتا" (بائرن)

"دو دفعہ پوچھنا ایک دفعہ غلط راہ اختیار کرنے سے بہتر ہے" (ونچل)

"ہماری آفتوں پر خوش ہونے والوں سے کہہ دو کہ آفتیں دنیا کا چکر لگاتی ہیں (ابن فرنی)"

"ایسی کوئی کیمیا نہیں ہے جو سیسہ کے جذبات سے سونے کا کردار پیدا کر دے"۔

"دوستی کا چراغ خود غرضی کی آندھی کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا" (تھاکرے سری چند جی)

"ہم اپنے دماغ کا استعمال بہتر ڈھنگ سے نہیں کر سکتے اگر جسم اناج سے ٹھسا ٹھس بھرا ہو" (سمرز)

"اگر تم نے اللہ کبھی زور سے کہا تو اس کی باز پرس ہو گی کہ خدا اتنا کہا تھا یا بہرے طور پر"۔

(شاہ عبدالقادر جیلانیؒ)

"عورت کی ہاں اور نہیں میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ اس میں سوئی بھی نہیں سما سکتی"۔

"قدیم دور کے شرفاء یہ کہا کرتے تھے کہ عورت کے نام کی اشاعت صرف دو مرتبہ ہونی چاہیئے ایک تو اس وقت جب کسی کے عقد میں آئے اور دوسرے اس موقعہ پر جب وہ دنیا کو خیرآباد کہے"

"وہ خوبصورت آدمی جو عقل نہ رکھتا ہو ایسے خوبصورت گھر کی مانند ہے جس میں صاحبِ خانہ نہ ہو" (جالینوس)

"بیوقوف کے ساتھ جنت میں بیٹھنے سے عقلمند کے ساتھ جیل خانہ میں بیٹھنا بہتر ہے" (اسپین)

"عمل سب سے بہتر تقریبا اور سب سے عمدہ پروپیگنڈہ ہے" (مہاتما گاندھی)

"قانون داں ایک ایسا تعلیم یافتہ انسان ہے جو آپ کی جائداد آپ کے دشمنوں سے بچا کر خود رکھ لیتا ہے" (پیٹر یا رکم)

"وہ قانون دانوں کے ہتھے چڑھا ہوا دیہاتی دو بلیوں کے درمیان پڑے ہوئے چوہے کی مانند ہے" (ڑنیکلن)

"گناہ کے ساتھ ہی سزا کے بیج بو دیئے جاتے ہیں۔ گناہ کے آغاز میں اتنی لذت نہیں جتنی اسکے اختتام میں تلخی ہے"

"اگر قانون کی زبان ہوتی تو وہ سب سے پہلے قانون دانوں کی شکایت کرتا"

"ہمدردی وہ عالمگیر زبان ہے جسے جانور بھی سمجھ لیتے ہیں" (جانسن)

"جو کوئی ہمیں اللہ کے نام سے دھوکا دیگا ہم اس کا دھوکہ کھا لیں گے" (معروف کرخی)

آیئے اب ان غلطیوں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں ان مطالعہ میں ہمیں شدت کے ساتھ کھٹکتی رہی تھیں

ص ۱۹ پر ایک جملہ نقل کیا گیا ہے :-

"اللہ کریم ہے اور کرم سے اسے محبت ہے۔ سخی ہے اور سخاوت سے اسے محبت ہے"۔

اس جملہ کو قرآن کی آیت قرار دیا گیا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ یہ قرآن کی کس آیت کا ترجمہ ہے۔ بہتر ہے کہ مؤلف ہی نشاندہی فرمائیں۔

ہمارا خیال ہے کہ مؤلف سے تسامح ہو گیا ہے۔ قرآن میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے جس کا ترجمہ مذکورہ بالا جملہ کی شکل میں کیا جا سکے۔

ص ۲۰ "لوگوں پر جب مصیبت پڑتی ہے تو ان کے اپنی ہی کرتوت سے"

اپنی ہی غلط ہے۔ "اپنے" ہی ہونا چاہیئے تھا۔

ص ۲۳ پر "خدا تعالیٰ کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے اور باپ کی رضامندی میں خدا کی ناراضی ہے بشرطیکہ باپ کی رضامندی یا نارضامندی احکام خدا کے خلاف ہو"

کتابت کی معمولی غلطی کی وجہ سے جملہ مہمل ہو کر رہ گیا ہے۔ جملہ کو یوں کر لیا جائے :-

"خدا کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے اور باپ کی ناراضگی میں خدا کی ناراضگی ہے بشرطیکہ باپ کی رضامندی یا ناراضگی احکام خدا کے خلاف نہ ہو"۔

ص ۸۷ "اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت رکھنے نالوں کے حوالہ کر دیا کرو"۔

رکھنے نالوں کی جگہ رکھوانے والوں ہونا چاہیئے تھا۔

ص ۹۱ "قانون سے لاقانونیت جنم لے رہی ہے اور سماج کی برائیوں سے گندہ عناصر"۔

"گندہ" نہیں "گندے" ہونا چاہیئے تھا۔ عناصر جمع ہے واحد نہیں۔ اس کا واحد عنصر آتا ہے۔

ص ۱۳۶ "جس کسی کام کا ارادہ کرو تو یہ سمجھو کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو"۔

"جس" کاٹ کر "جب" کر لیا جائے۔

ص ۱۳۷ "صرف اس ذات سے ڈرو جو تمہیں قتل

کرنے کے بعد جہنم میں ڈالنے کا اختیار رکھی رکھتی ہے"۔

"قتل" کرنے کے بعد کاٹ دیا جائے اور اس کی جگہ "مار ڈالنے" کے بعد لکھ دیا جائے۔

ص ۱۶۶ " وقت کی قدر کرو اور باقاعدگی کا اپنا اصول بناؤ"

"باقاعدگی کا" نہیں "باقاعدگی کو" ہونا چاہئے۔

ص ۱۷۲ "کتاب ایسے استاد ہیں جو بنا مارے۔ بنا مارے۔ بنا تلخ کلامی کئے اور بنا غصہ کئے ہمیں تعلیم دیتے ہیں"۔

جملہ میں تھوڑی سی تبدیلی کرنے کے بعد اس طرح کر لیا جائے:۔

"کتاب ایسی استاد ہے جو بغیر مارے بغیر تلخ کلامی کئے اور بغیر غصہ کئے ہمیں تعلیم دیتی ہے"۔

ص ۱۸۳ "جو بات معلوم نہ ہو اس کے اظہار میں شرم نہیں ہونی چاہئے"۔

"اظہار" کی جگہ "اعتراف" کیا جائے۔

ص ۲۶۳ "جہنم ان کے لئے ہے جو نافرمانبردار ہیں"۔

"نافرمانبردار" کی جگہ "نافرمان" لکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔

ص ۲۱۳ "نوجوانوں کا خیال ہے کہ بوڑھے بیوقوف ہیں اور بوڑھوں کا ——"

اس کے بعد کی عبارت اڑ گئی ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں اس نقص کو بھی دور کر دیا جائے۔

ص ۲۴۵ "خوبصورت یادیں۔ یادنغمہ میں۔ نغمہ گونج میں۔ گونج فضا میں۔ فضا لہروں میں اور لہروں کو کون مٹا سکتا ہے"۔

غالباً خوبصورتی ہوگا۔ لہروں میں کے بعد تبدیل ہو جاتی ہے الفاظ بڑھائے جائیں ورنہ بات ناقص رہیگی جملہ اس طرح کر لیا جائے۔

"خوبصورتی یادیں، یادنغمہ میں۔ نغمہ گونج میں۔ گونج فضا میں، فضا لہروں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور لہروں کو کون مٹا سکتا ہے۔

ص ۲۶۵ " یہ ایک گناہ ہے کہ تو ہمیشہ جھگڑتا رہے۔ تیرے عذاب کے لئے کافی ہے"

گناہ کے بعد جو لفظ "ہے" آرہا ہے یہ زائد ہے اسے کاٹ دیا جائے۔ ورنہ ہے کی بجائے "ہی" کیا جائے۔

ص ۲۷۴ "جاہلوں کی صحبت سے پرہیز رکھ ایسا نہ ہو کہ وہ تجھے اپنا جیسا بنالیں"

"اپنے" جیسا ہونا چاہئے تھا۔ رکھ کی مناسبت سے تجھے ہونا چاہئے ورنہ "تمہیں" کی مناسبت سے "رکھو" ہونا چاہئے۔

ص ۲۹۲ " یہ تین چیزیں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہیں۔ اسلام کرنا۔ الیٰ آخرہ"۔

الف کو قتل کر دیا جائے۔ "سلام" کرنا ہونا چاہئے

ص ۳۲۲ "مرض انسان کو بدبختی پر آمادہ پیدا کرتی ہے"

یہ "پیدا" کس مرض کی دوا ہے۔

ص ۳۳۴ " خاموشی عبادت ہے، بغیر محنت ہے"

بغیر محنت کے ہونا چاہئے۔

ص ۳۳۶ " ...... کہ خاموشی کب اختیار کرنا چاہئے"

اختیار "کرنی" چاہئے کر لیا جائے۔

" مجھے رونا آتا ہے جب میں دنیا کو عالم کے ساتھ کھیلتی دیکھتا ہوں"۔

"کھیلتی دیکھتا ہوں" غلط ہے۔ "کھیلتا دیکھتا" ہوں ہونا چاہئے۔

ص ۳۸۷ " دنیا کی زندگی تو ہزار کھیل تماشہ ہے"۔

لفظ "ہزار" خواہ مخواہ زائد حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن میں تو فقط یہ فرمایا گیا ہے اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ۔ دنیا کی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ نہیں۔ اس آیت میں لفظ "ہزار" کا لفظ کہاں ہے؟ ایسی کسی اور آیت میں بھی لفظ ہزار نہیں آیا —— بہرحال یہ زائد ہے۔ اسے حذف کیا جائے۔

ص ۴۱۹ " دماغ کی ایک خاص خرابی کے بغیر کوئی

شاعر بن سکتا ہے اور نہ ہی اشعار سے محفوظ
رہ سکتا ہے"۔

اشعار کا لفظ غلط تو نہیں لیکن اگر اس کو اگر شعر و شاعری کر لیا جائے تو جملہ کے اندر جمال پیدا ہو جائے گا"۔

ص ۴۴۳ "جب تک اطاعت اور ڈر نہ ہو علم پڑھنا
اور پڑھانا بیکار ہے"

"علم سیکھنا اور سکھانا" ہونا چاہیئے تھا۔

ص ۴۴۳ "ہم سے پہلے کسی رسول کے زمانہ میں مال
غلیمت جلال نہیں ہوا"۔

ہم نے بہت غور سے دیکھا کہ مکھی کی کارگزاری تو نہیں ہے بلکہ جلال ہی لکھا ہوا ہے۔ نقطہ کو ختم کر دینا ضروری ہے۔

ص ۴۵۸ پر "عیش کے بجائے عتیق لکھ دیا گیا"

ص ۴۷۸ "برے رواج، برے سماج کی پیداوار
ہے"۔

"ہے نہیں " ہیں" ہونا چاہیئے۔

ص ۴۸۱ "نیکی پر رغبت کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے
نیکی کرنے والا"

نیکی پر "رشک" کرنے والا لکھنا چاہیئے تھا۔ یا نیکی کی طرف "رغبت" کرنے والا۔

ص ۴۹۴ "علم اور خوف سے عزت اور زندگی ملتی ہے"۔

خالی "خوف" نہیں۔ "خوفِ خداوندی" درست ہوگا۔

ص ۵۵۳ "تم قرابت والے اور مسافروں کا انھیں
دیا دو"۔

"قرابت داروں" کر لیا جائے تو کیسا ہے؟ اس جملہ میں لفظ "حق" کی کمی محسوس ہو رہی ہے جو کتابت و طباعت کے کسی مرحلہ میں غائب ہو گیا ہے۔

ص ۵۳۴ "بے سفر اور قلت زادِ راہ سے ڈرتا رہ"

جملہ میں خرابی تو ضرور موجود ہے لیکن خرابی ہے کیا یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ لہذا یہاں مؤلف ہی کو زحمت گوارہ کرنی پڑے گی۔

ص ۵۵۸ "عورت اور شراب سب کو احمق بنا لیتے
ہیں"۔

عورت کے مؤنث ہونے میں تو کوئی تردد ہی نہیں لیکن شراب بھی بالیقین مؤنث ہی ہے لہذا "بنا لیتے ہیں" کی جگہ "بنا لیتی ہیں" صحیح تر رہے گا۔

ص ۵۵۸ "اپنی عصمت اور ناموس کی حفاظت
عورت کا سب سے اولین اور سب سے
پاکباز فرض ہے"۔

"پاکباز" غلط ہے "پاکیزہ" درج کیا جائے۔

ص ۴۶۸ "فضول خرچی مت کرو اللہ مصرفوں کو
پسند نہیں کرتا"

"مسرف" فضول خرچی کے معنی میں "صاد" سے نہیں "سین" سے آتا ہے۔

ص ۶۵۹ "اگر میں مر جاؤں تو میرے قاتل کو مار
ڈالنا"۔

اس فقرے کو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے ہمارا خیال ہے کہ مار ڈالنا کی جگہ "مت مارنا" ہوگا۔ کاتب صاحب سے سہو ہو گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے اندر انتقام کا جذبہ نہیں پایا جاتا تھا۔

ص ۶۶۲ "مال اور مسکین پر حکمراں ہوتا ہے اور قرضدار
قرض خواہ کا چاکر"

جملہ تبدیلی کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ لہذا مؤلف صاحب ایک بار پھر زحمت گوارہ کریں۔

ص ۷۰۵ "جو شخص کل کو اپنی موت کا دن سمجھتا ہے
موت کے آنے سے اسے کوئی محسوس نہیں
ہوتی"۔

کوئی اور محسوس کے درمیان اس لفظ کی کمی کا احساس ہو رہا ہے جسے سیدھی سادی اردو میں گھبراہٹ کہتے ہیں۔

ص ۷۰۷ "بدنامی ہی موت ہے"۔

"ہی" کا کیا مطلب "بھی" کیجیے۔

ص ۷ "حاسد کو موت ایسا دکھ بھوگنا پڑتا ہے"
یہاں کاتب صاحب کو جناب بھوگنا جی یاد آگئے میرے بھائی بھوگنا کو "بھگتنا" میں تبدیل کیجیے اور "ایسا" کو "جیسا" بنائیے۔

ص ۱۳ "پرہیز گاری اور نرمی انسان کی سیرت کو آہستہ کرتے ہیں"
غالباً "آراستہ" ہوگا۔ کاتب صاحب نے آہستہ کر دیا۔

ص ۱۴ "کبھی خشک کلامی نقصان ہوتا ہے اور کبھی ملامت سے اثر ہوجاتا ہے"۔
خوش کلامی کے بعد لفظ "سے" کا اضافہ کیجیے۔

ص ۱۹ "لو اپنی زینت نماز کے وقت"۔
قرآن حکیم میں تو یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:- یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اے بنی آدم ہر نماز کے وقت زینت اختیار کر لیا کرو) —— اس ترجمہ میں اور مؤلف کے دیے ہوئے ترجمہ میں کافی فرق محسوس ہو رہا ہے۔ اگلے ایڈیشن میں اس فرق کو ضرور رفع کر دیا جائے۔

ص ۱۹ "دو بھائیوں میں صلح کرا دینا نماز سے بہتر ہے"
"نفل نماز" ہونا چاہیے تھا۔

ص ۲۱ "پورا کرتا ہے نماز کو سجدہ سہو"
صحیح بات تو یہ ہے کہ اگر واجب چھوٹ جائے تو سجدہ سہو کر لینے سے نماز درست ہو جاتی ہے۔ مذکورہ بالا جملہ موجودہ صورت میں ناقص ہے۔

ص ۲۱ "بہتر ہے وہ نماز جو مسجد میں پڑھی جائے"
"فرض نماز" ہونا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بموجب نفل نماز کو تو گھر میں پڑھنا ہی بہتر اور افضل ہے۔

ص ۳۱ "دنیا کی تمام تر آفات اور مصائب کے مجموعہ کا نام ہے"۔

لفظ "کی" فالتو ہے۔ لہٰذا اڑا دیجیے۔

ص ۳۲ "خدا ایک ہے نام ہے بے شمار"۔
"نام ہیں بے شمار" ہونا چاہیے تھا۔

ص ۴۴ پر دوسری سطر میں "کراتا ہے" کی بجائے "کرائے" تحریر کر دیا۔

ص ۴۵ "اگر کوئی ایک آرزو نفس کی پوری کرے تو اس کو سیکڑوں خرخشے اللہ کی راہ میں پیدا ہو جاتے ہیں"۔
"خرخشے" تو کوئی چیز نہیں ہوتی۔ غالباً "خدشے" ہوگا

ص ۴۵ "خوراک بھوک سے کم کھاؤ"۔
تبصرہ نگار کے خیال میں خوراک کی جگہ "روٹی" یا "کھانا" فٹ کر لیا جائے تو مناسب رہے گا۔

ص ۵۹ "قیامت ایک وعدہ ہے جس کا پیدا کرنا ہم نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے"۔
"پیدا کرنا" صاف کرا دیجیے اور اس کی جگہ "پورا کرنا" تحریر کرا دیجیے۔

ص ۶۹ "جب کوئی قدم جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دیتی ہے"۔
قدم کا کیا تک؟ غالباً "قوم" ہوگا۔

ص ۱۹۰ پر ایک مقولہ نظر سے گذرا:-
"بدصورت یقیناً اندر سے خوبصورت ہوگا"۔
تبصرہ نگار کو اس خیال سے اس وقت تک اتفاق نہیں ہو سکتا جب تک تھوڑی سی تبدیلی کے بعد اسے مندرجہ ذیل انداز میں نہ لکھا جائے۔
"بدصورت بالعموم اندر سے خوبصورت ہوتا ہے"
یہاں "یقیناً" کا لفظ استعمال کرنے سے جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ قطعی طور پر ناقابل قبول ہے۔

ص ۲۳۲ پر یہ فقرہ دیکھا جا سکتا ہے:-
"ہر صوفی عالم ہوتا ہے، ہر عالم صوفی نہیں ہوتا"
خدا ہی جانے یہ کس زمانے کی بات ہے کہ جب ہر صوفی

الا زمًا عالم ہوا کرتا تھا۔ ہمارے دور میں تو ان گنت ایسے صوفیوں کی ریل پیل ہے جو الف کے نام ب نہیں جانتے۔ عالم ہونا تو بعد کی بات ہے۔

ص۲۹۶ کھولئے یہ قول نظر آئے گا:۔

"امرد خوبصورت کی طرف نظر کرنا مطلقًا ناجائز ہے خواہ بہ شہوت ہو یا بلا شہوت"

اس قول کو امام غزالیؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے قارئین اتنا تو جانتے ہی ہوں گے کہ جائز اور ناجائز ہونے کا فیصلہ خدا اور رسولؐ ہی کر سکتے ہیں، ان کے ماسوا کسی بھی ذات کو اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی معاملہ میں جائز و ناجائز کے فیصلے صادر فرمائے۔ قرآن و احادیث میں کہیں بھی یہ بات نظر سے نہیں گزری کہ امرد (وہ لڑکا جس کی ابھی ڈاڑھی مونچھ نہ آئی ہو) کی طرف بلا شہوت دیکھنا بھی ناجائز ہے۔ اگر اس کو قابلِ قبول تصور کر لیا جائے تو پھر تو ایک ناجائز کام سے محترز رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ کہاں تک آنکھوں کو بند کر کے زندگی بسر کی جا سکے گی؟ البتہ یہ درست ہے کہ بے ڈاڑھی مونچھ کے لونڈوں کی طرف شہوت کے ساتھ دیکھنا غلط اور ناروا ہے لیکن بلا شہوت دیکھنے میں کوئی حرج نہیں —— باقاعدہ اہتمام کے ساتھ دیدار کرنا بھی غلط ہی قرار پائے گا۔ ویسے شہوت کے ساتھ اور باقاعدگی و اہتمام کے ساتھ دیکھنا بالکل ایک ہی بات ہے۔ جب آدمی کسی خوبصورت لونڈے یا کسی خوبصورت لڑکی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے تو نگاہوں میں شہوت کی لہریں یقینی طور پر موجزن ہوتی ہیں۔ البتہ بلا شہوت اور اچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھنا جائز ہے۔ دورانِ گفتگو میں ضرورتًا کسی امرد کی طرف دیکھنے کو ناجائز قرار دے دینا عقلی اور نقلی کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔

ص۳۶۲ پر اردو لباس میں یہ حدیث دیکھنے کو ملی۔

"خوش نصیب عورت وہ ہے کہ جسے اس کا شوہر دیکھے تو خوش ہو جائے"۔

حدیث رسولؐ میں اچھی عورت کی چند صفات اور نشانیاں ذکر کی گئی ہیں۔ منجملہ ان میں سے ایک صفت اور نشانی یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ جب اس کا خاوند اس کی طرف دیکھے تو وہ (اپنی اداؤں اور مسکراہٹوں سے) اسے خوش اور مسرور کر دے۔

اس بات میں اور منقولہ بالا بات میں کتنا واضح اور کھلا فرق محسوس ہو رہا ہے۔ اس فرق کو دور کر کے صحیح بات پیش کرنا ضروری ہے۔

ص۳۷۸ دیکھئے:۔

"مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیونکہ وہ بہشت کے حقدار ہوں گے"۔

دل کے غریب، کا اطلاق تو ان حضرات پر ہوا کرتا ہے جو اس فلسفہ کے قائل ہوں کہ چمڑی چلی جائے لیکن دمڑی نہ جانے پائے۔ بھلا ایسے حضرات مبارکباد کے مستحق اور جنت کے حقدار کیسے قرار دیئے جا سکتے ہیں؟

ص۶۲۶ "روزہ رکھو مگر کھاؤ بھی۔ نماز پڑھو مگر سوؤ بھی یہ سب عبادت میں شامل ہے"۔

یہ ایک حدیث کا ترجمہ ہے اور یہ نظر ثانی کا محتاج ہے

ص۶۸۱ پر حضرت فضیلؒ کے اس قول پر نظر پڑی:۔

"جو ہم میں سے خدا کا زیادہ گنا ہگار ہے اس پر خدا کی لعنت"۔

بزرگانِ دین نے کبھی گنا ہگاروں پر لعنت نہیں بھیجی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقولہ حضرت فضیل ابن عیاضؒ کی طرف غلط طور پر منسوب کر دیا گیا ہے۔ کسی لفظ کی کمی بیشی کی وجہ سے مفہوم بدل کر رہ گیا ہے بہرحال اس کی تحقیق کر لی جائے۔

ص۶۹۹ پر شیخ سعدی کا یہ ارشاد جلوہ گر ہے:۔

"مذہب صرف لوگوں کی خدمت میں ہے عبادت میں نہیں"۔

غالبًا جملہ اس طرح ہوگا۔ "مذہب لوگوں کی خدمت میں بھی ہے صرف عبادت میں نہیں"۔

ص۷۲۴ پر قرآن کریم کی ایک آیت کا ترجمہ نقل کیا گیا ہے۔

"کھاؤ اور پیو اور پاکیزہ رہو"۔

یہاں مؤلف سے ترجمہ کرتے میں غلطی ہو گئی ہے —— قرآن کریم میں ایک آیت وارد ہوئی ہے:

یا ایھا الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقنکم (اے ایمان والو ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کر رکھی ہیں) غالباً مؤلف نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے بلاشبہ کھاؤ اور پیو کے الفاظ بھی قرآن میں کئی جگہ آئے ہیں لیکن وہاں ایھا الذین آمنوا کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ مثلاً:-

سورۂ البقرہ میں فرمایا گیا

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔

کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی میں سے اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرو۔

سورۂ اعراف میں فرمایا گیا:-

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔

کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی مت کرو ــــ وغیرہ۔

ان اور ان جیسی آیات سے قبل اے ایمان والو کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ہمارا خیال یہ ہے کہ مؤلف نے اسی آیت کا ترجمہ پیش کیا ہے جو ہم نے سب سے پہلے بیان کی ہے۔ لیکن اس آیت کا ترجمہ کرنے میں ان سے کوتاہی سرزد ہو گئی۔ آئندہ اس کی اصلاح کر لی جائے۔ قرآن کے معاملہ میں احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

صفحہ ۲۵۴ ملاحظہ فرمائیے:-

"جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو گا وہ آخرت میں بھی گمراہ ہو گا"۔

یہ بھی ایک آیت کا ترجمہ ہے اور یہاں بھی بلاشبہ ترجمہ کرنے میں مؤلف سے چوک ہو گئی ہے۔

بعض مقامات پر ہماری کم علمی آڑے آ گئی۔ مندرجہ ذیل اقوال ملاحظہ کیجئے:-

صفحہ ۳۷ "کسی کی حاجت پوری کرنے والا ایسا ہے جیسے تمام عمر خدا کی خدمت میں گزاری"

صفحہ ۴۵ "پانی نہار منہ مت پیا کرو، اس سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے"۔

صفحہ ۲۷۶ "جو کسی کی جان بچائے وہ بھی صدقہ ہے۔ مگر زبانی"۔

صفحہ ۴۶۲ "اگر میرے پاس دو روٹیاں ہوں تبھی ان میں سے ایک کے بدلے پھول خریدوں گا۔ تاکہ میری روح کو غذا مل سکے"۔

صفحہ ۵۶۲ "کچھ بھی کرو مگر شیطان کے وکیل مت بنو"۔

صفحہ ۶۰۲ "یہ عورتیں میری بنائی ہوئی ازتشیار ہیں۔ غیر لوگ جتنا ان کے پیچھے دوڑتے ہیں اتنا ہی یہ بھاگتی ہیں، مگر میری آواز پر چلی آتی ہیں تم درمیان سے ہٹ جاؤ میں خود انھیں ٹھیک کر لوں گا"

ان تمام اقوال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے لیکن ہماری نظروں سے کبھی اس قسم کی احادیث نہیں گزریں۔ چونکہ ہمیں اپنی کم علمی کا احساس ہے اس لئے ہم انھیں من گھڑت قرار دینے میں عجلت سے کام لینا نہیں چاہتے البتہ مؤلف سے اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ وہ از خود کسی صاحب علم سے تحقیق کریں کہ آیا مذکورہ اقوال واقعتاً رسول اللہ کے ارشادات ہیں یا آپؐ کی طرف خواہ مخواہ منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ مؤلف اتنا تو جانتے ہی ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی بات بغیر تحقیق کے منسوب کر دینا بدترین قسم کا جرم ہے جس کی پاداش عذاب الیم کے سوا کیا ہو سکتی ہے لہٰذا دل کا وہم دور کرنے کے لئے اگر تحقیق کر لی جائے تو کیا حرج ہے۔ زحمت تو بہر حال ہو گی لیکن دل کا وہم دور ہو جائے گا اور اگر کسی صاحبِ علم نے انھیں موضوع ہی قرار دیا تو پھر تھوڑی سی زحمت کے بعد کتاب من گھڑت احادیث سے پاک صاف ہو جائے گی۔

بعض مقامات پر ہماری کم فہمی ستم ڈھا گئی۔ اسے کم فہمی اور ناسمجھی کے سوا کیا کہیں گے کہ مندرجہ ذیل اقوال ہمارے پلے نہیں پڑے۔ پلے نہ پڑنے کی وجہ دو ہی ہو سکتی ہیں یا تو ان اقوال ہی میں نقص اور کمی موجود ہے ورنہ یہ ہماری حدود سمجھ سے بالاتر ہیں۔

ص۲۱ "اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ تو خدا کی بخشش اور مہربانی اس پر ہو گی"۔

ص۲۹ "اللہ کی محبت یہ ہے کہ دنیا اور آخرت ہر دو کو دوست نہ رکھے"۔

ص۳۰ "حق تعالیٰ کو حق تعالیٰ ہی سے پا سکتے ہیں نہ کہ تشکر و تخیل سے"۔

ص۳۱ "ایسے آدمی کے پاس مت بیٹھو کہ تم اللہ تعالیٰ کہو اور وہ کچھ اور کہے"

ص۴۱ "کونسی قاتل بیماری اور کہاں سے آتی ہے معلوم کیا وہ خدا کی طرف سے آتی ہے"۔

"اپنے خیالات کی بھی اچھی طرح سے حفاظت کرو اس لئے کہ خیالات جنت میں سُنے جاتے ہیں"۔

ص۳۲۲ "ہر ایک نظر جو عزت سے خالی ہو خون ہے"۔

ص۳۴۱ "قیمتوں کا خیال بھی یہی ہے کہ چوٹی پر کافی جگہ ہے"

ص۳۶۹ "خالق خلق میں ہے"۔

ص۳۷۰ "چھوٹے کی خطا کو اپنے سے کم جان کر اس کی عزت کرو"۔

ص۳۹۰ "طالبِ دنیا علم میں زیادتی کرتا ہے اور طالبِ دین عمل میں"۔

ص۴۱۸ "صبح کے آئینہ کو دن میں ہی دیکھا جاتا ہے"۔

"جسے رونے کی طاقت نہ ہو وہ رونے والوں پر رحم کرے"۔

ص۵۳۱ "انسان سرکنڈے کی مانند ہے کمزور و ضعیف تاہم یہ سوچنے والا سرکنڈا ہے"۔

ص۷۰ "موت بے دلی سے واقع ہوتی ہے"۔

بعض مقامات پر مؤلف نے کچھ اس قسم کی حرکات کا مظاہرہ بھی کیا ہے جسے فریب دہی کے ماسوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ لیجئے چند نمونے حاضر ہیں:-

ص۱۷۶ "وہ انسان کامل نہیں ہو سکتا جو خود تو پیٹ بھر کے کھانا کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہے"۔

—— یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے اور اس میں "مومن" کی جگہ "انسان" کا لفظ اس لئے فٹ کر لیا ہے کہ اسے مؤلف نے "انسان" کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

ص۱۸۱ "تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کا آئینہ ہے"۔

حدیث میں آیا ہے کہ "مومن، مومن" کے لئے آئینہ ہے مؤلف نے چونکہ اس حدیث کو "بھائی" کے ضمن میں بیان کیا ہے اس لئے تھوڑی بہت رد و بدل کر لی گئی ہے۔

ص۱۸۸ "دنیا میں کسی ایسے بھائی کی تلاش مت کرو جو بے عیب ہو"۔

بھائی کی جگہ دوست کا لفظ ہونا چاہئے۔ جملہ بات خود چغلی کھا رہا ہے کہ یہاں "دوست" ہی موجود تھا جسے المستر طور پر حسبِ دنا بوذ کر کے لفظ بھائی کو اس کا جانشین بنایا گیا ہے۔

"بوڑھے کتے بلا وجہ نہیں بھونکتے"۔

یہ فقرہ "بڑھاپے" کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے۔ خدا جانے کہ بوڑھے کا لفظ اصل فقرہ میں موجود تھا یا نہیں — بظاہر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے زبردستی اس فقرہ میں ٹھونسا گیا ہے۔ اگر ہمارا اندازہ غلط ہو تو خدا اور مؤلف ہمیں معاف کریں۔

ص۲۱۵ "اس چھت پر مت سویا کرو جس پر پردے نہ ہوں"

اس حدیث کو "پردے" کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے یہاں بھی مؤلف نے اپنے مفاد کو پورا کرنے کی خاطر حدیث کے الفاظ و مفہوم میں تغیر پیدا کر دیا ہے۔ حدیث میں اس چھت پر سونے کی ممانعت آئی ہے جس کے چاروں طرف منڈیر نہ ہو ایسی چھت پر سونا چونکہ خطرہ سے خالی نہیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ کھلی چھتوں پر سونے سے اجتناب کیا جائے۔ ایک حدیث میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص بے منڈیر کی چھت پر سوئے گا وہ اپنی موت کا آپ ذمہ دار ہو گا۔ یعنی دوران نیند میں وہ چھت سے گر کر مر گیا تو وہی اپنی مرگ مفاجات کا ذمہ دار ہو گا۔ یہ مضمون آپ نے توکل علی اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ منڈیر والی چھت پر سوؤ اور پھر اللہ پر بھروسہ

اور توکل کرو۔ بے منڈیر کی چھت پر سونا اور یہ دعویٰ کرنا کہ ہم تو توکل علی اللہ کے قائل ہیں، غلط ہے۔ غیر مناسب ہے۔

مؤلف نے منڈیر کی جگہ پردہ کا لفظ جما کر صرف حدیث کے الفاظ ہی میں نہیں بلکہ مفہوم میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

بے منڈیر کی چھت پر سونے سے اس لئے نہیں روکا گیا کہ ایسی چھت پر سونے سے بے پردگی کا اندیشہ ہے۔ بلکہ روکنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایسی چھت پر سونا خلاف احتیاط ہے جو بعض اوقات مہلک اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ آگے چلئے:-

ص۳۳ "دنیا میں اکڑ کر زمین پر مت چلا کرو"۔

یہ ایک قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے۔ لیجئے آیت ملاحظہ فرمائیے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (زمین پر اکڑتا ہوا مت چل)

ذرا دیکھئے اس آیت میں دنیا کا ذکر کہاں کیا گیا ہے۔ لیکن مؤلف صاحب کو چونکہ یہ آیت "دنیا" کے عنوان کی فہرست میں شامل کرنی تھی اس لئے انھوں نے لفظ دنیا کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا۔ مؤلف قرآن کے معاملہ میں جگہ جگہ بے احتیاطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مثلاً:-

ص۴۵ "اے رسول جب تم سے ہمارے بندے دریافت کریں تو ان کو سمجھا دو کہ ہم ان کے پاس ہیں"

یہاں "اے رسول" کے الفاظ اپنی طرف سے بڑھا لئے گئے ہیں۔ آیت قرآنی میں یہ الفاظ وارد نہیں ہوئے۔ آیت یہ ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ۔

(جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے پوچھا کریں تو فرما دیجئے کہ بیشک میں ان سے قریب ترہوں)

اے رسول کے الفاظ یہاں کہاں ہیں؟۔ ہم بتاتے ہیں کہ مؤلف نے ان الفاظ کا اضافہ کس لئے کیا ہے۔ دراصل مؤلف کو اس آیت کا تذکرہ ان اقوال کی فہرست میں کرنا تھا جن کے اوپر عنوان جمایا گیا ہے۔ "رسول"

یئے اور آگے بڑھئے:-

ص۵۱ "وہ لوگ جو برے کام کر رہے ہیں ان کی وجہ سے خشکی اور تری اور زمین میں خرابی پھیلی ہوئی ہے"۔

یہ بھی قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کرنے میں مؤلف سے کوتاہی سرزد ہو گئی۔ خیر اس کوتاہی کو تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن اس حرکت کو کیسے نظر انداز کریں کہ یہاں بھی انھوں نے زمین کا لفظ خواہ مخواہ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ آیت کریمہ میں لفظ زمین کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔ لیجئے لگے ہاتھوں یہ آیت بھی دیکھ ڈالئے۔ سورۂ روم میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:-

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔

اس آیت میں لفظ (ارض) "زمین" تلاش کرتے رہیئے قیامت تک نہیں ملے گا ——— واضح ہو کہ یہ آیت مؤلف نے "زمین" عنوان قائم کر کے اس کے ذیل میں نقل کی ہے۔

اس قسم کی کچھ اور آیات نظر سے گذریں جہاں مؤلف نے بے احتیاطی اور دیدہ دلیری سے کام لیا ہے۔ شاید وہ واقف نہیں کہ قرآن و حدیث کے معاملہ میں یہ طرز روش کس قدر گھناؤنی حرکت ہے۔ خدا انھیں معاف کرے۔

زیب دہی کی بس ایک مثال اور ملاحظہ فرما لیجئے:-

ص۱۲۰ پر انھوں نے ایک عنوان قائم کیا ہے "افلاس" اس کے تحت انھوں نے ص۱۲۱ پر ایمرسن کا یہ قول نقل کیا ہے:-

"تاریخ کی سب سے عظیم شخصیت مفلس تھی"۔

آگے چل کر انھوں نے تنگ دستی عنوان جمایا ہے۔ اس کے ضمن میں وہ ایمرسن کے مذکورہ قول کو دوبارہ یوں طور نقل فرماتے ہیں:-

"تاریخ کی سب سے عظیم شخصیت "تنگ دستی" اور مفلسی ہے"۔ ص۲۴۵

پہلے اس قول میں تنگ دستی کے الفاظ ناپید تھے۔ بعد میں ان الفاظ کو وجود بخش دیا گیا تاکہ ایمرسن کے قول کو تنگ دستی کے زیر عنوان بھرتی کیا جا سکے۔

یہ سب زیب دہی نہیں تو کیا ہے؟

بعض اس قسم کے اقوال بھی شامل کتاب کر لئے گئے ہیں کہ اگر انھیں قابل اشاعت تصور نہ کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ آمنہ

ان کا کتاب سے خارج کر دینا ہی دانش مندی کی دلیل ہے - اگر ان اقوال کو باعثِ رحمت جان کر یا تبرک کے طور پر داخلِ صفحات کیا گیا ہے تو ان کا خراج مت کیجئے البتہ ان کی مناسب مرمت ضرور کرا لیجئے۔ بصورت موجودہ یہ کھنڈرات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

ص۲۵ " آخرت کو اللہ کو چھوڑ دو"

ص۲۱۳ " ایک دو نہیں سب بے وقوف ہیں"۔

ص۲۲۱ " لمبی لمبی امیدیں باندھنے سے پرہیز کرو یہ خدا کی نعمتوں سے ناشکری ہے"۔

ص۲۲۸ " انسان ہی خدا کی پرستش گاہ ہے اسلئے اسکی پرستش کرو"۔

ص۲۲۸ " ہم جس کی پرستش کرتے ہیں اسی کے برابر ہو جاتے ہیں، پرستش کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں"۔

ص۳۰۷ " حق طاعون کی طرح ہے جسے چھوتا ہے تباہ کر دیتا ہے"۔

ص۲۶۳ " عشق کے علاوہ تو کسی کو خدا نہ جان"

ص۲۵ " نصیحت ایک احمقانہ فعل ہے، بلکہ بسا اوقات مہلک بھی"۔

اس قسم کے اقوال نے کتاب کی ادبیت اور چمک دمک کو ماند کر دیا ہے۔ ان کی مناسب اصلاح کی جائے ورنہ انھیں خارج از کتاب کیا جائے۔

ص۱۵۷ پر یہ حدیث نقل کی گئی کہ نکاح اتباعِ سنت ہے اور اسے عربی کہاوت قرار دیا گیا۔ اسی طرح الصلوٰۃ خیرٌ من النوم کو بھی عربی کہاوت لکھا گیا ہے۔

ص۲۱۵ " عورت کی آواز بھی عورت ہے" کو عربی کہاوت بنایا گیا ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف کے نزدیک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال صحابہ کرام کے فرمودات اور عربی کہاوتوں اور محاورات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انھوں نے کتنے ہی مقامات پر کہاوت کو حدیث اور حدیث کو کہاوت باور کرایا ہے۔

مشہور فارسی کہاوت "جواب جاہلاں باشد خموشی" کو انھوں نے امام غزالیؒ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اس قسم کی فروگذاشتیں اگر ازراہِ سہو ہوں تو انھیں پس انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف اسی ایڈیشن میں۔ آئندہ اس قسم کی فروگذاشتوں سے کتاب کا طاہر و طیب ہونا ضروری ہے۔

کتاب میں صحابۂ کرام کے اقوال کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ مؤلف نے صحابۂ کرام کے فرمودات بھی پیش کئے ہیں۔ لیکن ان کی مثال آٹے میں نمک کے برابر ہے اگر دشواری نہ ہو تو آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کو بھی دور کر دیا جائے۔

گوناگوں مصروفیات اور الجھنوں کی وجہ سے نالائق تبصرہ نگار کتاب کا مطالعہ دقتِ نظر کے ساتھ نہیں کر سکا۔ لہٰذا مؤلف کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ ذرا گہری نظر سے کتاب کا تنقیدی مطالعہ فرمائیں۔ ممکن ہے اسی قسم کی کچھ اور غلطیاں بھی انھیں محسوس ہوں جنکا ادراک تبصرہ نگار کی نگاہیں نہ کر سکیں۔

کتاب اپنی نوعیت اور موضوع کے اعتبار سے بلاشبہ وسیع اور ہمہ گیر حیثیت کی حامل ہے۔ غلطیوں سے پاک صاف ہونے کے بعد تو خیر اس کے اندر چار چاند لگ جائیں گے لیکن فی الوقت بھی یہ اس سلوک کی مستحق ہے کہ اسے خرید کر پڑھا جائے۔ اس کی قدر کی جائے۔

اس کے مؤلف جناب شاہ نظام الدین صاحب کو سراہا جائے جنھوں نے عرق ریزی، جانفشانی اور عظیم جد و جہد کے بعد اس کتاب کو مرتب کیا ہوگا۔

ادارہ "دانش کدہ" بھی بالیقین حوصلہ افزائی کا مستحق ہے جس نے پہلی ہی کاوش اس درجہ ضخیم و مطوّل پیش کر کے اپنی جرأت اور علم و ادب سے گہری وابستگی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ہمیں اس ادارہ سے اچھی امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں اور ورق ورق روشن کی نقاد اور عملی قدر افزائی کرنی چاہیئے تاکہ ادارہ اگلے اقدام کے وقت کسی قسم کی ناامیدی اور مایوسی کا شکار نہ ہو۔

٭ ٭ ٭

مانندِ حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں

کاغذ عمدہ۔ کتابت و طباعت دل کش۔

صفحات ۳۲۔

ملنے کا پتہ:۔ کمرہ نمبر (۱) ۔ احاطہ مولسری۔

دارالعلوم دیوبند۔

یہ ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے جسے دارالعلوم دیوبند کے چند باصلاحیت اور ہونہار طالب علموں نے وجود بخشا ہے۔

ان طلباء کے اسماء گرامی یہ ہیں:۔

عتیق احمد بستوی۔ ندیم الواجدی۔ عبدالستار سلام مرادآبادی ممتاز احمد اعظمی۔ محمد نعیم الدین بھاگل پوری۔ ظہیر الدین حیدرآبادی محمد فضل سیتاپوری۔

ان حضرات طلباء نے جن عنوانات کے تحت اپنے جذبات و تأثرات کا اظہار کیا ہے وہ علی الترتیب اس طرح ہیں:۔

سفالم را مدہ از جام جم کن
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
کیا کیا ترے کرم نے دیا آسرا مجھے
سلامت تو ترا میخانہ تیری انجمن ساقی
میکر ماضی نے تجھے چھوڑ دیا ہے یارو
تیرے در و بام پہ وادیِ ایمن کا نور
نقش رہ جاتے ہیں اور لوگ گذر جاتے ہیں

آخر میں "دردمند دلوں کا پیغام" عنوان کے تحت ان کو جوانوں اور نوعمروں سے خطاب کیا گیا ہے جو دارالعلوم دیوبند میں داخل ہیں یا آئندہ داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

غالباً کتابچہ کی اشاعت کا واحد مقصد محض اپنے تأثرات اور مافی الضمیر کا شیوع کرنا تھا اور ان احوال و حوادث کو الفاظ کا جامہ پہنا کر منظر عام پر لانا تھا جو ان حضرات پر طالب علمی کے زمانہ میں گذر چکے تھے۔

ممکن ہے کہ کوئی اور مقصد بھی رہا ہو لیکن تجارت بہرحال پیش نظر نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کتابچہ کو باقاعدہ کسی ادارہ کی طرف سے شائع نہیں کیا گیا۔ بلکہ خود ہی آپس میں مل ملا کر چھاپ لیا ہے اور قیمت صرف ۲۵ پیسے مقرر کی ہے جو خود اپنے اوپر ظلم و ستم ڈھانے کے مرادف قرار پاتی اگر کتاب چھاپنے کا مقصد تجارت اور جیب بھرنا ہوتا۔

ناچیز دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہے۔ لیکن اس کتابچہ کو پڑھنے کے بعد دل و جذبات کا تقاضہ ہوا کہ کاش ایک بار پھر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی جائے۔ ہر مضمون اپنے اندر اثر اور جاذبیت لئے ہوئے ہے۔ پورا کتابچہ ادب و احترام سے بھرا ہوا ہے۔ لفظ لفظ سے عقیدت ٹپکتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناشرین کے قلوب میں عقیدت دارالعلوم کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔

کتابچہ کے اندر کتابی اور ادبی خامیاں موجود ہیں۔ غلطیوں اور خامیوں سے تو کوئی بھی کتاب مبرّی نہیں ہوتی۔ لیکن جو کتابچہ صرف ۳۲ صفحات پر مشتمل ہو اس کے اندر خامیوں کا پایا جانا بری طرح کھٹکتا ہے۔ بعض باتیں ہمارے سمجھ میں نہیں آئیں۔ اس میں ظاہر ہے ہماری عقل و فہم کا قصور رہا ہوگا کتابچہ کا اور کتابچہ کے ہوشمند خالقین کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔

حاصلِ تبصرہ یہ ہے کہ ننھا منھا کتابچہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مؤثر بھی ہے۔ اور پچاس پیسے میں بھی کوئی برا نہیں۔

اس کتابچہ کے خالقین اور ناشرین سے ہمیں اچھی امیدیں وابستہ ہو گئی ہیں اور یقین ہے کہ مادرِ علمی کے یہ نونہال اقامتِ دین اور تحریکِ اسلامی کو مضبوط بنانے میں بہترین معاون اور جفاکش مبلغ ثابت ہوں گے۔ خدا کرے ان حضرات کا چلن اور نیتیں ٹھیک رہیں۔ آخرت اور خوشنودی رب ان کے پیش نظر رہے اور یہ ان مولویوں کا تتبع کرنے سے گریز کرتے رہیں جنھوں نے ریا و نمود کے لئے تقدس و پرہیزگاری کا ملمع اپنے چہروں پر چڑھا رکھا ہے جن کے پیش نظر دنیا ہی دنیا ہے۔ جو مذہب مذہب کی رٹ اس لئے لگائے رکھتے ہیں کہ مذہب ہی وہ کانٹا ہے جس میں مچھلی پھنستی ہی پھنستی ہے —— اور کانٹا کبھی ناکامی کا منھ نہیں دیکھتا —— ورنہ بباطن مذہب سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں —— کوئی تعلق نہیں۔

(بقیہ مسجد سے میخانے تک۔ از مث۵)

کا ہونا بھی ایک قدرتی فعل ہے۔ لیکن ان لوگوں کو کسی کے چیخنے کی آواز نہیں سنائی دی۔ حالانکہ وہ لوگ کانوں میں روئی ٹھونسے نہیں بیٹھے تھے۔

چند اور باتیں بھی تھیں جنھوں نے میرے شک کو تقویت بخشی اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ نسرین از خود بھاگی ہے اور اسکو بھگانے میں صرف خالد کا ہی ہاتھ نہیں بلکہ منور سلطانہ کا بھی ہاتھ ہے۔

قارئین کو بے چینی ہوگی کہ نسرین اور خالد ملے کہاں سے میں قارئین کی بے چینی دور کرنے کے لئے یہ واضح کئے دیتا ہوں کہ عشق کے مارے یہ دونوں ذی روح کا نپور کے ایک ایسے محلہ سے دستیاب ہوئے جہاں پہنچنا ہر انسان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ لیکن قارئین کی دعا سے ناچیز تو کتنی ہی بار جہنم کی سیر بھی کر آیا ہے۔ بھلا میرے لئے کانپور یا تاک نگر کے کسی آسیب زدہ محلہ میں جانا کیا دشوار ہو سکتا ہے۔

اس اثنا میں منشی اعتماد علی بھی واپس آگئے تھے۔ میری ان سے کافی جھڑپ ہوئی۔ میں نے ان سے کاٹ کھانے کے انداز میں کہا تھا کہ آپ لڑکیوں کو اتنی آزادی دیتے کیوں ہیں کہ پھر اس کا خمیازہ بھگتنے کی نوبت آئے۔ سیرت النبیؐ کے جلسوں میں جوان اور کنواری لڑکیوں کی شرکت کسی صورت میں جائز اور قابل تعریف نہیں ہو سکتی۔ ان لڑکیوں کو شیطان ورغلاتا ہے جب ہی تو ان کے دلوں میں جلسوں میں شرکت کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ مذہب اور اسلام سے انھیں جتنا تعلق ہے وہ کوئی ڈھکا چھپا نہیں۔

جو لڑکیاں بھول کر بھی دینی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتیں ان کا مذہبی اجلاس میں شریک ہونے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہونا معنی خیز اور قابلِ غور بات ہے۔ لیکن صرف ان ماں باپ کے لئے جن کی کھوپڑیوں میں عقل نام کی کوئی چیز موجود ہو۔

سوجھ بوجھ سے کورے ماں باپ اولاد کی کسی روش کا ایکشن نہیں لیتے۔ وہ اپنی اولاد کی نفسیات سے واقف نہیں ہوتے۔ انھیں قطعاً اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ ان کے لونڈے صفت اطفال انھیں کیسی کیسی دھوپ پٹیاں دے جاتے ہیں۔

میری اس عالمانہ تقریر سننے کے بعد انھوں نے آئندہ کے لئے چوکنا رہنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

میں نے انھیں اس بات پر بھی آمادہ کر لیا تھا کہ اب مصلحت اور سمجھداری کا تقاضا یہ ہے کہ آپ جلد از جلد نسرین کی شادی خالد کے ساتھ کر ڈالیں اور اپنی دوسری بچیوں کی طرف سے لمحہ بھر کے لئے غافل نہ ہوں۔ شرفو سے بھی اب ان کے تعلقات بحال ہو چکے ہیں۔

قارئین کو کچھ اور باتیں بھی ضرور سناتا لیکن اب اجازت دیجئے مجھے فوراً گھر پہنچنا ہے اور اس شریکِ زندگی کا تقرب حاصل کرنا ہے جس سے گذشتہ ہفتے میں بالکل اس طرح غافل رہا ہوں جس طرح صوفی معشوق علی نماز روزے اور دنیا و آخرت سے غافل ہیں۔

(ملاّ زندہ صحبت باقی)
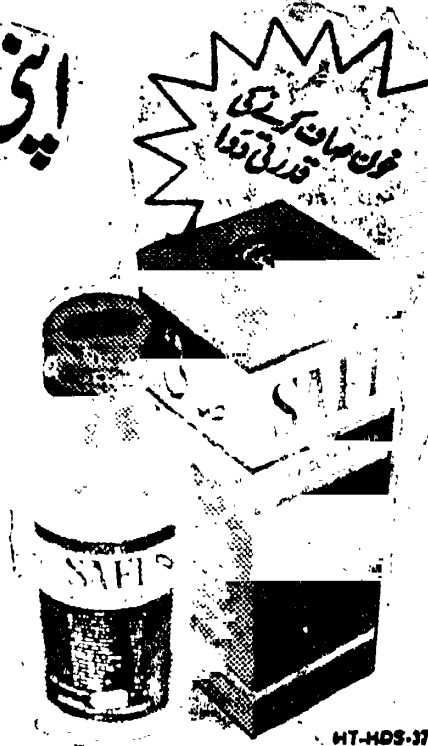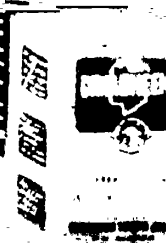
OCTOBERNOVEMBER
27(3)
ماہنامہ
تجلّی
دیوبند
خدا کی راہ میں خرچ کرنا
مدیر: حسن احمد صدیقی
فاضل دیوبند
تاریکیوں میں ایک چراغ
3/-

چلتے چلتے — مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر مولانا محمد میاں صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ حق تعالیٰ مرحوم کی بشری غلطیوں کو معاف فرمائیں اور انھیں جنت فردوس میں جگہ مرحمت فرمائیں (ادارہ)

نقادِ اعظم

دستک

دنیا ایک امتحان گاہ ہے، میدان آزمائش ہے۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے سَر دھڑ کی بازی لگا دو۔ جان و مال، عیش و آرام تج دو۔ چوٹیں اور زخم سہ جاؤ، جو کچھ بھی گذرے اس پر صبر کرو اور چند روز کی حیاتِ دنیاوی کا یہ نقصان اس اعتماد پر برداشت کر جاؤ کہ اس کا بہترین اجر اور بدلہ اور انعام مرنے کے بعد ملنے والا ہے۔ مرنے کے بعد جس دنیا میں جانا ہے وہ بیکراں اور لافانی ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ آج کی دنیا ایک شعلۂ مستعجل ہے، ایک حباب ہے۔ ایک جھونکا ہے جو آیا اور گذر گیا۔ ایسا طرزِ فکر اور ایسی ذہنیت رکھنے والی کوئی جماعت اپنے جہادِ مسلسل کے کسی مرحلہ میں اگر بُری طرح زخمی ہو جاتی ہے، پٹ جاتی ہے تو اس کے لئے اس ابتلاء میں کوئی مایوسی اور دل شکستگی نہیں۔ وہ تو اس ظاہری شکست کے عالم میں ذہنی طور پر سکون و طمانیت کے ٹھیک اس مقام پر ہو گی جس مقام پر فتح و کامرانی حاصل کرنے کی صورت میں ہوتی ہے بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ ظاہری اور دنیاوی کامیابیاں مجاہدینِ حق کے لئے نسبتاً بڑی ابتلاء ہیں۔ اور فتوحات ان کے لئے ذمہ داریوں اور آزمائشوں کا بہت بڑا لشکر ساتھ لاتی ہے آپ نے پڑھا تو ہو گا مسندِ خلافت پر تشریف فرما ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کا کیا عالم تھا۔ ہمہ وقت متفکر مضطرب۔ چوکنے۔ سرگرداں اور بے چین۔ کہا کرتے تھے یا عمر تیری شامت! - اگر فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی مر جائے تو خدا کے یہاں اس کی پوچھ تجھ سے ہو گی۔ بیت المال کا اونٹ گم ہو گیا تو عین دوپہر میں بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔

حق یہ ہے کہ جو جماعت صرف رضائے خداوندی اور نجاتِ اخروی کے لئے سرگرم کار ہو دنیاوی کامرانیاں اور اختیار و اقتدار کے مناصب اس کے لئے بال سے باریک اور تلوار سے تیز پلصراط کا حکم رکھتے ہیں۔ شاید سنا ہو گا آپ نے جب مولانا مودودی جیل میں ڈال دیئے گئے تھے تو انھوں نے کیا کہا تھا؟ انھوں نے کہا تھا۔ آج مجھ سے زیادہ مطمئن اور بے فکر آدمی روئے زمین پر کوئی نہیں — اس کا کیا مطلب ہوا۔ بہت سیدھا سا مطلب ہے بشرطیکہ ایک مردِ مومن کے قلب و ذہن کی کیفیات آپ سمجھ سکیں۔ جیل سے باہر وہ مختار تھے۔ ایک ایک پل کو اعلائے کلمۃ الحق کی جد و جہد میں صرف کرنا اور باطل سے مسلسل لڑنا ان کا وظیفہ تھا جس میں ذرا سی سستی اور غفلت بربادیٔ آخرت کا موجب بن سکتی تھی مگر جب جیل میں ڈال کر بے دست و پا کر دیئے گئے تو اب نہ آخرت کی باز پرس کا خطرہ ہے نہ فرض منصبی کی ادائیگی۔ کیونکہ لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ کسی متنفس پر اللہ نے اسکی استطاعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔

ستائیسویں سال تیسرا شمارہ

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کنیڈا۔ فرانس انڈونیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک پانچ پونڈ۔ بحرین۔ افریقہ۔ سعودی عرب۔ قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ دس شلنگ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ ؏

ماہنامہ

تجلّی

دیوبند

سالانہ چوبیس ۲۴ روپے فی کاپی ڈھائی روپے

ایڈیٹر
حسن احمد صدیقی

اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے یا منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں۔ یا وی۔ پی کی اجازت اجازت دیں — آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی۔ پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی۔ پی خرچ سے بچ جائیں گے ؏

فہرست

اس پرچہ کی قیمت تین روپے (اسلامی پریس دیوبند) کتابت: علی اکبر عثمانی دیوبند

دنیا کی نگاہوں میں نمایاں ہونے کے جہاں اور طریقے ہو سکتے ہیں وہاں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آدمی عام روش سے ہٹ کر ایک الگ لائن اختیار کرلے ـــــ بس پھر وہ نمایاں ہی نمایاں رہے گا۔ کالا رنگ قابل توجہ نہیں ہوتا لیکن اگر کسی جگہ دس گورے آدمی کھڑے ہوں اور وہاں صرف ایک ہی آدمی کالا ہو تو بتائیے سب سے پہلے نظر کس پر پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اسی کالے رنگ پر پڑے گی جو عام حالات میں قابلِ التفات نہیں ہوا کرتا

اسی طرح اگر کسی محفل میں پچاس آدمی صادق القول اور راست گو موجود ہوں لیکن ان میں ایک شخص انتہائی درجہ کا کاذب اور جھوٹا ہو تو خصوصیت اور انفرادیت اس جھوٹے شخص کے حصہ میں آئے گی وہ خصوصیت اور انفرادیت ان حضرات کے حصہ میں نہیں آسکتی جو سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

ہمارے ایک قابل احترام بزرگ ہیں مولانا عبدالماجد دریابادی۔ انھوں نے دنیا کی نگاہوں میں نمایاں ہونے کے لئے اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے کچھ اسی قسم کا طریقہ اپنایا ہے۔ وہ صحیح العقیدہ ہوتے ہوئے بھی قادیانی حضرات کو مسلمان تصور کرتے ہیں اور ان کی تکفیر کے قائل نہیں جن کی تکفیر پر دنیا کے تمام علماء متفق ہو چکے ہیں۔ ...... اور اب عالم یہ ہو چکا ہے کہ جب قادیانیوں کی ضلالت اور علمائے حق کی حقانیت کا تذکرہ ہوتا ہے تو مولانا عبدالماجد دریابادی کا ذکر خیر "بطورِ خاص" کیا جاتا ہے۔

مولانا دریابادی کا مقصد اور منشاء پورا ہو چکا ہے۔ قادیانیوں کی خاموش حمایت کر کے وہ نمایاں ہوگئے ہیں۔ انھیں تیسرے درجہ کی خصوصیت حاصل ہوگئی ہے۔

لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سستی شہرت قیامت کے میدان میں مولانا کو مہنگی پڑے ؛

* * *

احوالِ واقعی ———— !

آدمی حالات کے سامنے قطعی مجبور اور بے بس ہے، اس کا اندازہ ہمیں پہلے ہی تھا۔ لیکن تجلی کی ذمہ داریوں نے اس اندازہ میں تقویت اور تیقن کی روح پھونک دی۔

حرکت میں بلا شبہ برکت ہوتی ہے۔ بغیر ہاتھ پیر ہلائے کوئی شخص اپنے کسی مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا عزائم۔ لگن، جد و جہد بے شک ضروری بلکہ اشد ضروری، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اٹل اور ناقابل انکار ہے۔ اگر خدا کی مرضی نہ ہو تو نہ عزائم رنگ لا سکتے ہیں نہ لگن نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے اور نہ جد و جہد کا عروسِ کامرانی سے کوئی رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ جب خدا کی مرضی کے بغیر کسی درخت کا کوئی پتا نہیں ہل سکتا۔ کوئی کسان اپنی محنت کا صلہ نہیں پا سکتا۔ کسی میدانِ ادب یا میدانِ فلاں کے مزدور کو اپنی کاوش کا انعام نہیں مل سکتا تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر تجلی اپنے صحیح وقت پر چھپ چھپا کر روانہ ہو جائے۔

ایڈیٹر کے قلم نے ہرن کی طرح چوکڑیاں بھریں۔ کاتب کے قلم نے بھی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ ادارہ کے متعلقین پریس کا طواف کرتے کرتے تھک گئے لیکن حاصل وہی صفر بٹا ل‌ڈ تجلی نے اپنی پرانی ادائیں دکھائیں اور پریس کی مشین پر جمود طاری ہو گیا۔ اب نہ حرکت ہے نہ برکت۔ بیٹھے رہئے اور انتظار کیجئے اس نامراد کا جسے نامراد کہتے ہوئے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ دیوبند کی بجلی سے آپ بخوبی واقف ہیں اور اس کے اطوار و کردار کا حدود اربعہ دو اور دو چار کی طرح آپ سب پر واضح ہے۔ لہٰذا اس کے اوصاف و محاسن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔

شکر کیجئے کہ خدا نے صبر نام کی بھی ایک چیز پیدا کی ہے۔ اگر یہ چیز نہ پیدا کی جاتی تو آپ تجلی کو ایک سانس میں تین طلاق دے ڈالتے اور ایڈیٹر تجلی خود کشی کرنے کے لئے کسی اندھے کنویں کی تلاش میں نکل جاتا۔

جولائی و اگست کے شمارے میں اس بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ آئندہ تمام شمارے ٹھیک ٹھیک وقت پر منظر عام پر آتے رہیں گے۔ کسی قسم کا کوئی اختلال اور تاخیر پیدا نہیں ہوگا۔ اور قارئین کو انتظار کی زحمت اور کوفت برداشت کرنی نہیں پڑے گی۔ لیکن برا ہو گردشِ دوراں کا۔ اس نے تمام ولولوں پر پانی پھیر دیا۔ ارادے ٹھٹھر گئے۔ خواہشیں مرجھا گئیں۔ ستمبر کا شمارہ بھی کافی تاخیر سے شائع ہوا اور کافی تاخیر کے بعد اسے آپ کی خدمت میں پہنچنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

زیرِ ترتیب شمارہ کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تیار ہو اور کب روانگی عمل میں آئے۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی صحیح وقت پر دیوبند کی گلیاں نہیں چھوڑ سکتا۔ مؤخر اسے بھی ہونا پڑے گا۔ اس اختلال و تاخر کے پیشِ نظر ممکن ہے کہ ہمارے تمام قارئین یہ تصور جما لیں کہ تجلی کبھی پابندی کے ساتھ اپنے صحیح وقت پر تیار نہیں ہو سکتا۔ حالات اور اشاعتوں میں اختلال کے پیشِ نظر یہ تصور کرنا غلط بھی نہیں ہوگا۔ امید اور آس کی بھی کچھ حدیں ہوتی ہیں قارئین بیچارے کہاں تک امید کا دامن پکڑے رکھیں۔ مایوسی کو کب تک پاس نہ آنے دیں۔ قارئین کا مایوس ہو جانا کوئی حیرتناک بات نہیں بلکہ دانشمندی سے ہمکنار بات ہے۔ اور اسے دیوانگی کے ماسوا کیا کہیں گے

(باقی صـ ۱۰)

آغازِ سخن

شمس نوید عثمانی

تجلی کے ان کالموں میں ایک بار مولانا عامر عثمانی مرحوم نے مجھے اپنی زندگی میں کچھ کہنے کی دعوت دی تھی اور دوسری بار ان کی موت نے   لیکن تیسری بار ان ہی صفحات میں میری پکار کا عنوان فکر اس قدر اہم ہے کہ اتنی اہمیت نہ مرحوم کی زندگی کو حاصل تھی اور نہ ان کی رحلت اور موت کو   اور وہ ہے کشتۂ ادا سنت و توحید کے علمی کام کے روحانی ورثہ کا مسئلہ   ایک کام کہ جس کی موت اور زندگی عامر عثمانی مرحوم کے حقیقی وجود کی موت اور زندگی کے ہم معنیٰ ہے۔

مادّی دولت کے وارث خون کے رشتہ دار ہوا کرتے ہیں اور وہی مرنے والے کے خون پسینے کے برگ و بار سے اپنی جھولیاں بھر کر اس سرمایہ کو نت نئے مادی کاروبار میں لگا کر زندہ رکھتے ہیں۔ اور اس طرح مرنے والے کی گردشِ خون رک جانے کے بعد بھی اسکی دولت کی گردش کو رکنے نہیں دیا جاتا۔

لیکن انسانوں میں ایسے اولوالعزم کتنے ہیں جو اہلِ علم کے ورثہ کے سلسلہ میں ٹھیک ایسا ہی معاملہ کرتے ہوں؟

نجانے کتنی بار ایسا ہوا کہ ذہنی تاریکی اور قلبی ویرانی میں علم و تحقیق کے زود آتش لہو سے فکر و نظر کے چراغاں کرنے والوں کے ہاتھوں میں اس لازوال دولت کا حسین ترین ورثہ سونپا لیکن وہ ورثہ ان ہاتھوں میں ہی رہ گیا۔ اور آگے بڑھ کر تقسیم نہ ہو سکا۔ کام کتابوں میں رہ گیا اور کام کے قدرداں دھیرے دھیرے یا غفلت کی نیند سو گئے یا موت کی   جی چاہتا ہے کہ مولانا عامر عثمانی مرحوم کے سلسلہ میں یہ انتہائی المناک حادثہ نہ ہو۔

مجھے اگرچہ مرحوم سے خون کے لحاظ سے بھی رسمی تعلق حاصل تھا۔ لیکن ہمارے مخصوص تعلق کی بنیاد خون نہیں کچھ اور چیز تھی۔ یہ وہی چیز تھی جس کی راہ سے آپ لوگوں کے دل و دماغ آں مرحوم کے ساتھ گہری اور غیر معمولی وابستگی تک پہنچے۔ کیا عجب ہے کہ میری طرح آپ کے روح و دل کو بھی وہی آرزو شعوری اور غیر شعوری طور پر بےچین کر رہی ہو جس نے مجھے آج سطور کی شکل میں دردِ دل منتقل کرنے کے لئے مضطرب کر ڈالا ہے۔ کیا خبر ہے کہ آپ کے بے شمار قلوب بھی نجانے کہاں کہاں اس بات کے لئے تڑپ

ہے یوں کہ مرحوم نے دینی اور فقہی مسائل پر تجلی کے صفحات
یں اعلیٰ ترین انداز کی ریسرچ اور تحقیق کا جو کام سر انجام
یا تھا وہ قبر میں ان کے جسم کی طرح محض تجلی کے فائلوں
ہی میں سمٹ کر اور آخر کار مٹ کر نہ رہ جائے ــــ توحید اور
سنت اور فقہ کے عنوانات مرحوم کے قلب و قلم کے لئے
محبوب ترین عنوانات تھے ۔ اور یہی عنوانات ایک طالبِ حق
کے لئے جسم و جاں کی اہمیت رکھتے ہیں ۔ دل تڑپنا ہی چاہئے
کہ کس طرح اس ذہن و روح کے ورثہ کو پوری دنیا کے
ایک ایک مسلمان مستحق اور غیر مسلم طالب علم تک پہونچانے
کے لئے ہمارا خونِ جگر بھی کام آ سکتا تا کہ پھر بجا طور پر یہ
توقع کی جا سکتی کہ جس دن خدا پوری مخلوق کو جزا و سزا اور
آخری ہار جیت کے لئے زلزلۂ محشر کے بعد اکٹھا کرے گا
اس دن ہم لوگ بھی مرحوم کے اجر و ثواب میں شرکت
کے لئے ان کے دوش بدوش نہ سہی تو ان کے پیچھے کھڑے
کئے جا سکیں ۔ مرحوم سے مخصوص تعلق خاطر اور ان کی زندگی
کے آخری ایام میں ان کے شعلہ شوق ایثار اور حرارت
ایمان کی التہاب آمیز تجلی نے ہی ان کی بظاہر حال
فی سبیل اللہ غریب الدیاری کی مرگ ناگہاں پر مجھ سے مندرجہ
ذیل اشعار میں یہی بات کہلوائی تھی :-

وہ جس کی چوٹ سے مخلوق دیدۂ تر ہے
وہ موت موت کہاں، زندگی سے بڑھ کر ہے
تری جدائی سے سمجھے ہیں ہم تری قیمت
ترا حجاب تجلی سے بھی حسین تر ہے
ہو زادِ راہ میسر تو تجھ سے ملنے کو
خدا گواہ ہمیں انتظارِ محشر ہے

اور

دل یقین کی پوری لذت و لطافت کے ساتھ کہہ رہا ہے
کہ دنیا کے کروڑوں مسلمانوں تک اگر ہم مرحوم کی ان عظیم
علمی و دینی تحقیقات کا آبِ حیات انگریزی میں منتقل
کرنے کے لئے نیز اسلام پر اعلیٰ ترین تحقیقاتی ادارہ قائم
کرنے میں کامیاب ہو گئے تو خدا کی رحمت سے یہ آس لگائی
جا سکتی ہے کہ ہم سب کو اس حسین منزل کا "زادِ راہ" عطا
فرما دے گا ــــ سچ بتلائیے کہ اپنے عامر مرحوم سے
بارگاہ خداوندی میں اس طرح ایک بار پھر ملنے کی یہ آرزو
کتنی پر کیف اور جاں نواز ہے ؟ کیسی دو آتشہ آرزو
ہے یہ !

اس سے ایک طرف یہ حلال و پاکیزہ "خود غرضی"
پوری ہو سکیگی علم دین کی راہ میں جگر کاوی کرنیوالے
کے اس لازوال ورثہ میں ہمارا بھی دردِ دل اور خونِ جگر
شامل ہو جانے سے ہم بھی ان کے متوقع عظیم اجر و ثواب
میں کتنے سستے داموں شریک ہو گئے تو دوسری طرف اسی
دنیا میں یہ ایمان افروز منظر سامنے آگیا کہ مرحوم کا یہ کام
ان کے لئے کتنا بڑا صدقۂ جاریہ ہے کہ کتنی روحوں کے لئے
روشنیٔ فکر اور حرارت ایمانی کا ذریعہ بن گیا ۔

میں مستقل طور سے دیوبند میں نہیں رہتا ــــ البتہ
یہ مرحوم کا دائمی معمول تھا کہ تعطیلات میں بڑے اصرار
کے ساتھ مجھے اور میری بیوی خدیجہ ثریا کو (جو مرحوم کی حقیقی
چھوٹی بہن ہیں) اپنے پاس بلا لیا کرتے تھے ۔ اس نسبت
سے ان کے بعد ان کے پسماندگان نے یہ روایت جاری
رکھی ۔ لیکن اب جب یہاں پہنچا تو خوفناک آثار نظر آئے
کہ ایک طرف تجلی سے اس کے دیرینہ تعلق رکھنے والوں کے
تعلق میں ایک گونہ سستی و اضمحلال پیدا ہو چلا ہے ــــ
پسماندگان مرحوم کے بعد معاشی مسائل سے دوچار رہیں
اور ان سب کے نتیجہ میں اس کے امکانات دور تر ہوتے
جاتے ہیں کہ مولانا عثمانی کی تحقیقات علمی کا یہ سمندر رسالے
کے فائلوں سے باہر نکل کر افادیت اور نشر و اشاعت
کے نت نئے ساحلوں کو چھو سکے ۔

یہ نت نئے ساحل کیا ہو سکتے ہیں آخر ؟

غالباً یہ عنوان فکر ہر اس ہستی کے شعور و در د لاشعور میں
شعلہ زن ہونا چاہئے کہ جو محبت کی موت کا قائل نہیں
اور جس کی اصولی روش یہ ہے کہ محبوب دوست کی موت
کے بعد اس سے بھی زیادہ وفا کرنی چاہئے جتنی اسکی

زندگی میں کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں تجلی کے تمام چاہنے والوں اور مولانا مرحوم کے فیضان، فقہ، علم و تحقیق کے "دیوانوں" کو اظہار خیال کی دعوت دیتے ہوئے میں اپنے ذہن میں آنے والے خیالات ان کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

میرے خیال میں فقہی اور علمی و دینی مسائل میں مولانا عثمانی مرحوم کا تحقیقاتی کام ایسا کام ہے جس کی شدید پیاس پورے کرۂ ارضی کے مسلمانوں میں ہے، لیکن تمام دنیا میں مولانا کے ارادت کیشوں کے موجود ہوتے ہوئے یہ کام صرف اردو تک بلکہ اردو میں بھی محض تجلی کے صفحات تک محدود رہا۔ اس کی اردو میں باقاعدہ کتابی ترتیب و تدوین ہو اور انگریزی جیسی بین الاقوامی زبانوں میں ان کا شایانِ شان ترجمہ ہو۔ یہ کام ایک کارِ گراں ہے۔ لیکن اگر اسے تعاون علی البر و التقویٰ کی بنیادوں پر اشتراکِ تعاون کے ساتھ شروع کیا جائے اور اسے دین کی تبلیغ و خدمت کے ایک وقف فی سبیل اللہ کی شکل دیکر ایک باقاعدہ ادارے میں ڈھال دیا جائے تو للہیت اور اجتماعیت کی برکت سے ایسے نجانے کتنے ہفت افلاک پہلے بھی طے ہوئے ہیں اور اب بھی ہو سکتے ہیں۔

اس ادارے میں مالی تعاون کی تین بنیادیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عطیات کی شکل میں ہوں جنکا کوئی صلہ مخلوق سے لینا پسند نہ کیا جائے۔ ایسے عطیات کو اس وقف کی کتابیں شائع کرنے اور اس کے انتظامی امور پر ہی لگایا جائے گا۔

دوسری شکل کاروباری شرکت اور اس رقم سے ادارے کے نفع میں شیئر ہولڈنگ اور مضاربت کی ہو سکتی ہے جس کا نفع ان سرمایہ کاروں کو دیا جاسکے گا اور تیسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مولانا سے تعلق خاطر کی راہ سے کچھ لوگ ایسے سامنے آئیں جن کے لئے ادارے میں رقوم لگا کر خود اس کا نفع لینا بارِ خاطر ہو۔ لیکن ان کی خواہش ہو کہ یہ نفع مرحوم کے پس ماندگان کو دیا جاتا رہے۔ لیکن خلوص اور للہیت کے رشتوں سے ملنے والے ان میں سے ہر ایک تعاون کا یہ پہلا فریضہ ہم پر

ہے کہ ادارہ کچھ ایسی مضبوط و محکم اصولی بنیادوں پر قائم ہو کہ ہماری زندگی اور ہماری موت میں کسی خود غرضی کے عنصر کو اس میں نقب زنی کا راستہ نہ مل سکے اور جس نیت اور جس مقصد سے اس میں جان و مال لگانے والوں نے جان و مال لگائے ہیں وہ اسی اور صرف اسی راہ میں ہماری امکانی کوشش کی آخری حدود تک لگے رہیں۔ اس سلسلہ میں یہ آخری اور سب سے اہم بات ہرگز نہ بھولئے کہ جب تک ان صفحات میں ہم آپ کو یہ اطلاع نہ دیں کہ ایسا محکم و مضبوط ادارہ قائم ہو گیا، آپ ہرگز ہرگز کوئی رقم بھی کو اس سلسلہ میں دستی دیجئے اور نہ ہمیں روانہ کیجئے۔ ورنہ ان کے ضائع ہونے کی ذمہ داری آپ پر ہو گی ہم پر نہیں۔

البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ اپنے خطوط سے مجھے اس تجویز کے بارے میں اپنے خیالات سے ضرور باخبر کیجئے۔ اگر آپ نے چاہا کہ میں خود آپ تک پہنچکر اس پر زبانی گفتگو کروں تو انشاء اللہ مجھے دنیا کے کسی کونے بحر و بر طے کر کے پہنچنے میں بھی دریغ نہ ہو گا بلکہ اس شکل میں تو یہ آرزو بھی پوری ہو سکے کہ قلم کی جگہ زبان سے ہم کیا ہم مقام پر کچھ رو دھو سکیں ۞

(بقیہ احوال واقعی از صـ)

کہ ہم آج بھی مایوس نہیں ہیں۔ ہم نے اب بھی امید اور آس کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور نہ چھوڑنے کا ارادہ ہے۔ آج بھی اپنے پروردگار پر بھروسہ ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گا۔ حالات کروٹ لیں گے۔ تجلی کو وفاداروں کی توفیق نصیب ہو گی۔ گردشِ دوراں کو مرحلہ پڑے گا اور آپ کا محبوب تجلی پابندی کے ساتھ ٹھیک ٹھیک وقت پر آپ کی خدمت میں پہنچا

دعا کیجئے کہ اللہ ہماری مدد کرے اور ہمارے حوصلوں میں استقلال پیدا فرمائے۔

والسلام

ایک ایسا معاشرہ ظہور میں لانے کے لئے جس کے افراد ایک دوسرے کے مونس و غمگسار اور رنج و راحت کے شریک اور معاون و دمساز ہوں اسلام نے بہترین تعلیمات دی ہیں۔ ان میں سے ایک بیحد اہم اور بنیادی تعلیم صلہ رحمی ہے صلہ رحمی کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خون کے رشتے سے ہمارے قرابت دار ہیں ہم ان کے حقوق ادا کریں۔ ان کی ضرورتوں اور مصیبتوں میں کام آئیں۔

صلہ رحمی کا معاملہ صدقۂ و خیرات جیسا نہیں ہے۔ صدقۂ و خیرات کا درجہ نوافل کا ہے۔ لیکن صلہ رحمی واجب ہے۔ اس سے لاپرواہی برتنے والا عند اللہ گناہگار ہوگا۔ جو صدقات فرض و واجب ہیں ان میں بھی اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کا خصوصی خیال رکھنا چاہیئے۔ بعض حالتوں میں زکوٰۃ کا دوہرا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً آپ زکوٰۃ ایک ایسے رشتہ دار کو دیں جو محتاج و مسکین ہے اور ادائگی زکوٰۃ میں صلہ رحمی کی بھی نیت رکھیں تو انشاء اللہ ثواب و اجر میں اضافہ ہوگا۔ اگر زکوٰۃ کسی اور کو دے چکے یا زکوٰۃ آپ پر فرض نہیں ہے۔ لیکن کوئی رشتہ دار بے حد ضرورت مند ہے تو یہ مت سمجھئے کہ اپنی استطاعت بھر اس کی مدد کرنا محض ایک مندوب و مستحب نیکی ہے جسے نہ کیا جائے تو آخرت کی بازپرس کا خطرہ نہیں۔ یہ مدد آپ پر شرعاً واجب ہے اور غفلت برتیں گے تو گناہگار رہیں گے۔ صلہ رحمی کا وجوب کس طرح پورے معاشرے کو اخوت و مؤدت اور رفق و موانست سے لبریز کر دیتا ہے اس کا اندازہ معمولی سے غور و فکر سے ہر شخص کر سکتا ہے۔

عن ابی هريرة :- اتى رجل النبى صلى الله عليه وسلم فقال :- يا رسول الله ان لى قرابة اصلهم و يقطعون واحسن اليهم ويسيئون الىّ ويجهلون علىّ واحلم عنهم :- قال لئن كان كما تقول كانما تسفهم المل ولا يزال معك من الله ظهير عليهم ما دمت على ذلك (اخرجه مسلم واحمد وابو عوانة وابن حبان)

ترجمہ :-

"ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا" اے اللہ کے رسولؐ میرے عزیز و اقارب کا حال یہ ہے کہ میں تو ان سے حسن سلوک سے پیش آتا ہوں مگر وہ بدسلوکی سے جواب دیتے ہیں اور

ان کے حق میں بھلائی کرتا ہوں مگر وہ میرے حق میں برائی کرتے ہیں اور میرے ساتھ جاہلانہ طرز پر پیش آتے ہیں جبکہ میں ان کے ساتھ حلم و بردباری کا برتاؤ کرتا ہوں۔"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ تم کہتے ہو اگر صورت حال یہی ہے تو سمجھ لو کہ تم گویا ان کو راکھ پھنکا رہے ہو جب تک تم اپنے طرز عمل پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے ان کے ان کے بالمقابل تمہارے لئے ایک مددگار معین رہے گا۔

نوٹ:۔ ہم نے یہ روایت امام بخاری کی الادب المفرد سے لی ہے۔ مسلم میں یقطعون کی جگہ یَقْطَعُوْنِیْ ہے صاحب مشکوٰۃ نے بھی مسلم ہی کا اتباع کیا ہے۔ مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

تفہیم:۔

مَلّ گرم راکھ (کھوبل) کو کہتے ہیں کَاَنَّمَا تُسِفُّھُم الملّ کا مفہوم امام نووی نے یہ بیان کیا ہے کہ گویا تم انھیں گرم راکھ کھلا رہے ہو۔

ملا علی قاریؒ نے اس تشبیہ کا مطلب یہ لیا ہے کہ جب قرابت دار شکر گزاری نہیں کرتے بلکہ الٹی بدسلوکی اور ناقدری کرتے ہیں تو تمہارا بطور امداد دیا ہوا مال انھوں نے اپنے حق میں خود مال حرام بنا لیا ہے اور اسے کھانے کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں۔

ایک اور انداز تعبیر بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہ احسان کرنا ایک برتر اور اعلیٰ وصف ہے جس سے نہ صرف آخرت کا اجر ملتا ہے بلکہ انسان کے کردار میں بلندی پیدا ہوتی ہے ۔۔ اگر احسان کرنے والا کبر و نخوت سے بلند ہو کر اللہ کی رضا کو مقصود بنائے تو ضرورت مندوں پر احسان کرنے سے اس کے قلب و روح میں انبساط و ابتہاج کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے نکوکاری کے رجحانات اور حسن اخلاق کے داعیوں کو جلا ملتی ہے۔ یقین کیجئے صرف اللہ کے لئے اس کے بندوں پر احسان و ایثار کرنے اور طبیعت کو دنیا و مال و منال سے مستغنی بنا لینے سے جو کیف و استہزاز روح و قلب کو میسر آتا ہے اس کے مقابلہ میں وہ احساس مسرت بالکل ہیچ ہے جو کسی دنیا پرست کو بہت بڑا خزانہ ملنے سے نصیب ہوتا ہے۔ تجربات اور مشاہدے اس حقیقت پر شاہد عادل ہیں کہ حقیقی راحت و طمانیت متاع دنیا سے استغناء اور رضاء الٰہی کی والہانہ لگن ہی میں ہے۔ ضرورتمندوں پر احسان کرنا بھی اسی لگن کا ایک پہلو ہے۔ غالباً اسی لئے اللہ نے فرمایا ہے:۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی	ہرگز نیکی کا مقام بلند نہ پا سکو
تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	گے جب تک اپنی پیاری چیز
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ	میں سے کچھ (اللہ کی راہ میں)
شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ	نہ خرچ کرو۔ اور جو کچھ تم خرچ
عَلِیْمٌ۔	کرتے ہو اللہ اس سے آگاہ
	ہے۔

احسان کرنے والے کے مقابلہ میں وہ شخص جس پر احسان کیا گیا ہے قدرتاً ایک نسبتاً نیچے مقام پر پہنچا ہوا ہے۔ اگر وہ احسان کے بدلے میں شکر گزاری کا ثبوت دیتا ہے جب تو خیریت ہے لیکن اگر ناشکری کرتا ہے تو اس کے باطن میں سیاہی اور قلب و روح میں کبیدگی کا اضافہ ہوتا ہے۔ مادیت کے اسیر تو ایسے نکتوں پر تمسخر ہی فرمائیں گے۔ لیکن جن لوگوں کے دل و دماغ میں مادہ پرستانہ طرز فکر نے پوری طرح نفوذ نہیں کیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ آدمی جس حد تک اخلاقی رذائل میں مبتلا ہو گا اسی نسبت سے اس کی قلبی طمانیت غائب ہوتی چلی جائے گی اور مادی نعمتوں کی فراوانی کے باوجود اس کی مسرتیں انتہائی بے وزن اور سطحی ہوں گی۔ اس کے برخلاف اخلاقی فضائل میں اضافہ احساس کے مراکز کو اضطراب و انتشار کی گرد سے پاک و صاف کرتے ہوئے طمانیت اور حقیقی مسرت کا ملجا و مامن بنائے گا۔

جو قرابت دار تمہارے حسن سلوک پر شکر گزاری کی بجائے بدسلوکیوں اور بدنہادیوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں تم اگر ان کے

ذہن قلب کی کیفیتوں کو دیکھ سکتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ان کے اندر رشک و حسد اور غم و غصّے کے اذیت ناک احساسات طوفان اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی محرومیوں پر بری طرح کڑھ رہے ہیں اور تمہارے مقابلہ میں خود کو ذلیل و حقیر محسوس کر کے جھلاہٹوں کا شکار ہیں۔ تم ان پر انفاق کرتے ہو تو اگرچہ اپنی احتیاج کے تحت وہ اسے قبول کرتے ہیں لیکن حسد کے مارے ان کے ملال و حزن میں اضافہ ہی ہو جاتا ہے۔ یہی وہ اندرونی کیفیت ہے جسے زبانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلی ہوئی تشبیہ قابل فہم بناتی ہے۔ ایک ایسے شخص کا تصوّر کرو جو بھوکا ہو۔ بھوک دور کرنے کے لئے اسے کچھ بھی نہ ملے تو فرطِ اضطراب میں بھوبل منہ میں بھر لے۔ ظاہر ہے کہ اس کے کام و دہن کیا بدمزگی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے اور پیٹ میں جتنی راکھ پہنچے گی وہ معدے کے لئے آفت بن جائے گی پھر اگر یہ راکھ گرم بھی ہو تو جلنے کی اذیت الگ رہی۔

ہاں اگر یہ قرابت دار شکر گذار ہوتے اور تقدیر کا سامنا حسنِ تدبیر اور حسن تفکر سے کرتے تو حزن و حسد کے کانٹے انکے دل و دماغ میں اس بُری طرح چبھتے اور قدر دانی و شکر گذاری ــــ جو فضائل اخلاق میں سے ہے ــــ ان کی اندرونی سیاہی میں اتنا اضافہ نہ ہونے دیتی کہ طمانیت اور سکون کا سایہ تک انھیں نصیب نہ ہوتا۔ خوب سمجھ لو اگر تم غریب و محتاج ہو اور حلال روزی کے حصول میں پوری جد و جہد کرنے کے باوجود اللہ نے کسی مصلحت سے رزق کا دروازہ تم پر تنگ ہی رکھا ہے تو اس پر جھلانے اور پیچ و تاب کھانے کی ضرورت نہیں۔ نہ یہ کوئی ذلّت اور گناہ کی بات ہے کہ تمہارا کوئی ذی استطاعت رشتہ دار تمہاری مدد کرے۔ لیکن ذلّت اور گناہ کا سرچشمہ یہ ہے کہ مدد کرنے والے کے احسان کو محسوس نہ کرو اور بجائے قدر دانی کے بدسلوکی اور بحیثی پر اتر آؤ۔

اس حدیث سے واضح ہوا کہ محسن کا احسان نہ ماننا اور شکر گذاری سے گریز کرنا بجائے خود ایک سزا ایک لعنت ایک آفت ہے جس کا نقصان دین اور دنیا دونوں میں پہنچیگا البتہ محسن کے حق میں یہ کچھ مضر نہیں بلکہ اس پر اللہ کی رحمت نازل ہوگی۔ یہ جو فرمایا گیا کہ :-

ولا یزال معک من اللہ ظہیرٌ علیھم۔

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ناشکرے تو ابتداً اگر تجھے نقصان پہنچانا چاہیں گے تو اللہ اپنی قدرت کاملہ سے تجھے بچالے جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیرے لئے اللہ ایک فرشتہ مقرر کر دے جو ان کے شر سے تیری حفاظت کرے۔

اس دوسرے مطلب پر ہمیں احساس ہے کہ آجکل کا فاسد ذہن گھٹن محسوس کرے گا۔ مادیت کے غلبے اور ایمان کے ضعف نے پڑھے لکھے لوگوں کا ذہن کچھ ایسا بنا دیا ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود جن و ملک کا وجود تسلیم کرتے میں ان کی آمادگی قہر درویش برجان درویش کی سی کیفیت رکھتی ہے۔ ان میں جو مادیت سے زیادہ متأثر ہیں وہ تو سرے سے مانتے ہی نہیں کہ اجنّہ و ملائکہ ہماری ہی طرح ایک جیتی جاگتی مخلوق ہیں، بلکہ لاطائل اور بارد تاویلات کے ذریعہ آیاتِ قرآنیہ کو مسخ کرتے ہیں اور جو کم متأثر ہیں وہ مان تو لیتے ہیں، لیکن انداز ایسا ہی ہوتا ہے جیسے اس بات سے بد دل اور کبیدہ خاطر ہوں کہ قرآن نے ہم سے ایسا کیوں منوا لیا انھیں شرم محسوس ہوتی ہے کہ اہل مغرب ہمیں تو ہم پرست کہیں گے۔ وہ حلق سے تسلیم کرتے ہیں مگر دل و دماغ ان کے اندر ہی اندر اِبا کرتے ہیں۔

لیکن ہمیں اعتراف ہے کہ جن معتقدات کی تفویض اللہ اور اس کے رسولؐ نے کی ہے۔ ان کے بیان و اظہار میں ہمیں ہرگز شرم نہیں آتی۔ ہمیں جس طرح اپنے وجود پر یقین ہے اسی طرح اس پر بھی یقین ہے کہ جن و ملک ہماری ہی طرح ایک مستقل مخلوق ہیں اور اپنی مرضیات کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں اللہ پہلے بھی فرشتوں سے کام لیتا رہا ہے، اب بھی لیتا ہے اور آئندہ بھی لیتا رہے گا۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ رشتہ داروں سے

حسن سلوک کا مدار اس پر نہیں کہ وہ بھی جواباً حسنِ سلوک ہی کا مظاہرہ کریں۔ قرابتدار بندوں پر لازم ہے کہ اسلامی تعلیم و ہدایت کی بجا آوری اور اجرِ آخرت کی خاطر صلہ رحمی کرتے رہیں۔ انسان کا طبعی تقاضا ہے کہ جس پر وہ احسان کرے اس سے قدر شناسی کی خواہش بھی اسے ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے حسنِ سلوک کو محسوس کیا جائے۔ لیکن جن لوگوں کے اعمال و افعال اللہ کے لئے خالص ہوتے ہیں اور ان کی نگاہیں آخرت پر گڑی رہتی ہیں وہ دنیاوی سود و زیاں کو حقیر سمجھتے ہوئے وہی کام کرتے ہیں جو اللہ کو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پسندیدہ قرار دیا ہے چاہے طبیعت پر کیسا ہی جبر کرنا پڑے۔ اسی کا نام ہے تزکیۂ نفس۔ مطلوبِ اللہ جلّ شانہٗ کو یہی ہے کہ مومن صرف رضائے الٰہی کو مقدم رکھے اور جب رضائے الٰہی اور رضائے نفس میں ٹکر ہو جائے۔ نفس کا سر کچل دے۔ نفس عموماً سرتابی سکھاتا ہے، اور بڑے بڑے عباد و زہاد بھی اس کی دسیسہ کاریوں سے بہمہ وجوہ مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے شریعت کی پابندی آخری سانس تک فرض ہے چاہے آدمی کتنا ہی مزکّٰی اور با اخلاق ہو چکا ہو۔

— ...(((۲)))... —

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:۔ الرحم شجنۃ من اللہ من وصلہا وصلہ اللہ ومن قطعہا قطعہ اللہ۔

(الادب المفرد۔ صحیح بخاری)

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رشتۂ قرابت ایک شاخ ہے اللہ سے جس نے اسے ملایا اللہ اسے ملائے رکھے گا۔ اور جس نے اسے قطع کیا اللہ اس کو قطع کر دے گا۔

تفہیم:۔

شجنہ (ش کے زیر، زبر اور پیش تینوں کے ساتھ) ایسی ٹہنی کو کہتے ہیں جس کی شاخیں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی ہوں۔ ہر ڈالی شاخ در شاخ ہو۔ یہی حال رشتہ داریوں کا ہے پیچ در پیچ رشتے دور تک پہنچتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافی دور کا رشتہ دار بھی ہماری امداد و اعانت کا مستحق ہے اگر وہ ضرورت مند ہو۔

رحم کا جوڑنا یہ ہے کہ قرابت داروں سے حسن سلوک برتا جائے اور قطع کرنا یہ کہ بدسلوکی کرے یا تغافل برتے اور باوجود استطاعت کے ان کی حاجتوں میں کام نہ آئے۔ صلہ رحمی کرنے والوں کو اللہ جوڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے تمام دنیاوی و دینی معاملات سے اللہ کے رحم و کرم کا ایک خصوصی رشتہ کسی نہ کسی نوع سے قائم رہتا ہے اور صلہ رحمی سے غافل ہونے والوں کو قطع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مخصوص نگاہ عنایت ایسے لوگوں سے پھر جاتی ہے، جس کا نتیجہ دینُ دنیا کا خسران ہوتا ہے۔

تنبیہ: بعض لوگ قطع رحمی کرتے ہیں۔ رشتہ داروں سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں یا دوسری طرح کے گناہوں میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ظاہری اعتبار سے خوب پھلتے پھولتے ہیں مال و اسباب خوب کماتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر کم سمجھوں کو تعجب ہوتا ہے کہ انھیں کیوں حرمان و نامرادی لاحق نہیں حالانکہ قطع رحمی اور گناہ و طغیان پر اللہ کی رحمت کا رشتہ ان سے کٹ گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بہت ہی زیادہ بدنصیب ہیں — انھیں اللہ نے عذاب آخرت کا سامان جمع کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اولاد اگر بُری راہ پر چلتی ہے تو باپ اسے ڈانٹتا ڈپٹتا ہے تنبیہیں کرتا ہے سمجھاتا ہے۔ لیکن اگر ساری کوششوں کے بعد بھی وہ راہِ راست پر نہیں آتا۔ باپ کے نصائح پر کان نہیں دھرتا اور برا اور سرکش ہوتا چلا جاتا ہے تو باپ تھک ہار کے کہتا ہے کہ جا نالائق جو تمہارا جی چاہے کرتے پھر مجھ سے کوئی تعلق نہیں پھر وہ اس سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ اللہ کا ہے جن بندوں پر وہ رحم کرنا چاہتے ہیں انھیں آزاد نہیں چھوڑتے۔ وہ گناہ کا ارتکاب

[کر]تے ہیں تو فوراً تنبیہہ کی جاتی ہے۔ انپر ابتلاء بھیجنے کا
[م]نشاء یہ ہوتا ہے کہ شاید اس طرح وہ عبرت پکڑیں اور بُرے
[ر]استے سے لوٹ آئیں۔ لیکن جب وہ باز ہی نہیں آتے اور
[ا]ن کا نفس حرص وہوا کی وادی میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
[پ]ھر اللہ تعالیٰ تنبیہہ وتذکیر کا سلسلہ ختم کرکے اسے کچھ روز
[ا]سے آزادی سے کھل کھیلنے کے لئے بے لگام چھوڑ دیتے ہیں
یہ بڑی المناک حالت ہے جس پر رشک کرنے کی بجائے مومن
کو پناہ مانگنی چاہئے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت
مروی ہے جس میں صلہ رحمی کی انتہائی اہمیت ظاہر کرتے
ہوئے ایک بہت ہی دلنشیں انداز اپنایا جاتا ہے۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
الرحم شجنۃ من الرحمٰن فقال اللہ تعالیٰ
من وصلک وصلتہ ومن قطعک قطعتہ (مشکوٰۃ
رواہ البخاری)

ترجمہ:۔

ابوہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا رحم رحمان کی شاخ ہے۔ پس ارشاد
کیا اللہ تعالیٰ نے (رحم کو خطاب کرکے) جو تجھے
ملائے گا میں اسے ملاؤں گا، اور جو تجھے کاٹے گا
میں اسے کاٹوں گا۔"

تفہیم:۔

رحمٰن اللہ جل شانہ کا بڑا ہی پیارا نام ہے
شجنۃ من الرحمٰن کا مطلب لفظی اعتبار سے تو
یہ ہے کہ لفظ "رحم" رحمٰن ہی سے نکلا ہے۔ نکلنے سے
مراد نحوی اشتقاق نہیں۔ نحوی قاعدے سے تو رحم خود
مادّہ ہے مراد صرف یہ ہے کہ رحم رحمٰن جیسے برتر و
مقدس اسم الٰہی کا جزو ہے۔ لہٰذا ہر مومن کو صلہ رحمی
ہمیشہ توجہ رکھنی چاہئے۔ ایک مسلمان اگر صرف اس فخر پہ
دنیا کے ہر فخر کو ہیچ اور کم سکتا ہے کہ اسے سیّد الابرار
النبی الامّی سرور انس وجن صلی اللہ علیہ وسلم سے
غلامی کی نسبت ہے تو جس لفظ کو باری تعالیٰ کے مقدس
ترین نام پاک سے نسبت خاص ہو اس کی عظمت و
تقدس کا کیا ٹھکانا۔

اور معنوی اعتبار سے شجنۃ من الرحمٰن کا
مطلب یہ ہے کہ کائنات میں اللہ رحیم وکریم کی رحمت
بے پایاں کے جو بے شمار مظاہر ہیں ان کا ایک بہت خاص
مظہر قرابتی تعلقات کا وہ سلسلہ ہے جو انسانوں کے
درمیان ایک شاخ درشاخ ٹہنی کی مانند پیدا کیا گیا ہو
یہ گتھے ہوئے رشتہ وپیوند رحمت باری سے اسی طرح
جڑے ہوئے ہیں جس طرح ایک تنے سے ٹہنیاں جڑی
ہوئی ہوتی ہیں۔ رشتہ وپیوند کا خیال رکھنے والے گویا
رحمت باری سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ وہ در نزدیک
قرابت داروں سے اچھا سلوک کرنا گویا رحمت خداوندی
کو اپنی طرف منعطف کرنا ہے۔

صلہ رحمی کا جو عظیم اجر آخرت میں ملیگا اس کی تو
کوئی حد ہی نہیں۔ دنیا میں بھی اس کا بہت بڑا نفع ہے
انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال:۔
من احب ان یبسط فی رزقہ وان ینسأ لہ اثرہ
فلیصل رحمہ (بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد)

ترجمہ:۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص یہ
پسند کرتا ہے کہ اس کی روزی میں اضافہ و برکت
ہو اور اس کی موت دیر سے آئے اسے چاہئے کہ
صلہ رحمی کرے۔

تفہیم:۔

قرآن وحدیث نے زکوٰۃ کے بارے میں بھی توضیح فرمائی
ہے کہ اس سے مال میں برکت ہوتی ہے۔ اسی طرح فرزندوں
قرابت داروں پر خرچ کیا ہوا مال بھی بظاہر تو خرچ ہوتا ہے
لیکن فی الحقیقت باقی ماندہ مال میں خیر وبرکت کا موجب
ہوتا ہے۔ ناصاف ذہنوں میں یہ بات مشکل سے سمائے گی

لیکن جو لوگ لِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ فلاح و خسران کے اسباب کی تخلیق اللہ ہی کرتا ہے ان کے لئے یہ کھلی حقیقت ہے کہ اللہ کی خوشنودی کے لئے خرچ کیا ہوا مال وہ تخم بارآور ہے جو بظاہر اگرچہ مٹی میں دبا دیا جاتا ہے مگر مآل کار اس سے ہری بھری کھیتیاں اور پھلدار باغ ظہور میں آتے ہیں۔

عمر کا بڑھنا اور موت کا مؤخر ہونا آجکل شاید کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ الا ماشاء اللہ۔ بے شک موت کا وقت معین ہے لیکن جن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں قرآن ملا ہے وہی یہ بھی بشارت دیتے ہیں کہ صلہ رحمی عمر میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ ان کی بشارت کے بعد کسی ریب و شک اور کسی این و آں کی گنجائش ہرگز نہیں۔ رہیں اس نوع کی آیتیں جیسے لَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا (جب کسی ذی روح کی موت کا وقت آجائے تو اللہ اس میں تاخیر نہیں کرتا) تو ان میں اور بشارت رسولؐ میں کوئی تناقض نہیں۔ صلہ رحمی کرنے والے کی عمر اگر دس سال بڑھائی گئی تو اللہ کی طرف سے اس کا وقت مرگ اس بڑھی ہوئی مدت کے اختتام ہی پر آئے گا یہ نہیں کہ وقت مرگ تو اس اضافے سے قبل ہی آچکا اور پھر اسے صلہ رحمی کی وجہ سے ٹلا دیا گیا۔

ویسے یہ مسئلہ باریک ہے کیونکہ اس کا جوڑ مسئلۂ تقدیر سے جا ملتا ہے۔ لیکن اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبر دیدی اس پر ایمان مجمل ہمارا فرض ہے چاہے تفصیل ہمارے دائرۂ ادراک و شعور سے باہر ہو۔

اسی مضمون کی روایت ترمذی نے بھی بیان کی ہے اور بعض اور کتب حدیث سے بھی اس کی توثیق و تائید ہوتی ہے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے اثر بھی اسکی تصدیق میں ملتے ہیں۔ ایک اور بات بھی ان آثار سے معلوم ہوتی ہے کہ اضافۂ رزق اور اضافۂ عمر کے علاوہ "بری موت" سے تحفظ بھی صلہ رحمی کے فائدوں میں شامل ہے۔ بُری موت مثلاً مرگ ناگہاں ہی ہے جیسے آجکل ہارٹ فیل کی وبا عام ہے۔ یا جیسے ہوائی جہازوں کے ہولناک حادثے آئے دن کا معمول بن گئے ہیں "بری موت" کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے جسے محاورے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا کہتے ہیں۔

ان آثار کی تقویت کے لئے محدث ابویعلیؒ کی ایک حدیث بھی موجود ہے جسے حضرت انسؓ سے روایت کیا گیا ہے۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایسی حدیث بھی مروی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کے نتیجے میں مال اور عمر کے اضافے کی بشارت توریت میں بھی مرقوم ہے۔

حاصل یہ کہ صلہ رحمی (برادر پروری، اقرباء سے حسن سلوک) دین و دنیا کے اضافے سے بھرپور ہے اور اسے ایک عبادت سمجھکر اختیار کرنا چاہئے۔

صلہ رحمی سے عمر میں اضافہ

عن ابن شہاب قال :- اخبرنی انس بن مالکؓ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال من احب اَنْ یُّبْسَطَ لَہٗ فِیْ رِزْقِہٖ وان یُّنْسأَ لہ فی اثرہ فلیصل رحمہ

(بخاری و مسلم۔ الادب المفرد۔ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ)

ابن شہاب کہتے ہیں ہمیں صحابی رسولؐ انس بن مالکؓ نے خبر دی کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص یہ چاہے کہ اسکی روزی میں اضافہ برکت ہو اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے تو اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے۔

تفہیم :-

بظاہر تو یہ حدیث اتنی واضح اور سادہ ہے کہ کسی تفہیم کی ضرورت نہیں۔ لیکن بگڑے ہوئے ماحول نے ذہنوں کا جو سانچہ بنا دیا ہے اس میں اس طرح کی باتیں آجکل ذرا مشکل ہی سے سماتی ہیں۔ عقل وسیسہ کار فوراً یہ منطق کھینچ کر لاتی ہے کہ موت کا تو ایک دن معیّن ہے۔ تقدیریں لکھی جاچکی ہیں۔ پھر کسی بھی فعل و عمل اور تجویز و ترکیب سے وقت اجل آگے پیچھے کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی منطق کا لحاظ کر کے بعض بزرگوں نے تاخیر مرگ یعنی طول عمری کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ موت میں تاخیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ صلہ رحمی کرنے والا تادیر نیک نام رہیگا اور مرنے کے بعد اسکی نیکوکار اولاد اسکے

لئے دعا اور ایصال ثواب کا سلسلہ جاری رکھے گی۔

دوسرے یہ کہ اللہ اس کے اوقات میں برکت دے گا بایں طور کہ وہ غیر نافع اور فضول کاموں سے بچا رہے گا۔ نافع اور نتیجہ خیز کاموں سے شغل رکھے گا۔ اس کی اولاد سعادتمند ہوگی جو اس کی خدمت کرے گی اور اپنے حسن عمل سے اسے فائدہ پہنچائے گی۔

اس طرح کی توجیہیں کوئی شک نہیں کہ ایک وزن رکھتی ہیں اور ان پر مادی منطق بھی حملہ آور نہیں ہوتی لیکن عاجز کا خیال یہ ہے کہ اس طرح کے امور میں ہمیں تعقل سے بالاتر رہ کر صرف ایمان و یقین سے رابطہ رکھنا چاہئے۔ عقل و استدراک کی تمام صلاحیتیں یہ تحقیق کرنے میں ضرور صرف کرنی چاہئیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں۔ واقعی اللہ کے رسولؐ نے ایسا فرمایا تھا یا نہیں۔ اگر تحقیق کے نتیجے میں اس کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے تو منطقی بحثیں اٹھائے بغیر ہمیں مان لینا چاہئے کہ صلہ رحمی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی معنی میں ہوتا ہے جو معلوم و معروف ہیں۔ تقدیر کی گرہ نہ کبھی عقل سے کھلی ہے نہ کھلے گی۔ ایمان علی القدر کی راہ ایمان خالص اور سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کی راہ ہے۔ آخر دیکھئے زید کو آپ منع کرتے ہیں فلاں جگہ نہ جاؤ خطرہ ہے۔ وہ نہیں مانتا۔ جاتا ہے اور قتل کر دیا جاتا ہے۔ اب آپ ہم نشینوں میں بایں طور اظہار تأسف کرتے ہیں کہ زید اپنی ضد کے نتیجے میں قتل ہوا۔ ہم اسے منع کر رہے تھے، اگر وہ کہنا مان لیتا تو مارا نہ جاتا۔

ظاہر ہے آپ مومن ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی شخص وقت معین سے قبل نہیں مر سکتا اور جو وقت معین کر دیا گیا ہے اسے ٹلایا نہیں جا سکتا۔ پھر بھی اس اظہار تأسف پر آپ کو بدعقیدہ اور منکر تقدیر نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا تعلق اسباب و علل اور علم ظاہری سے ہے۔ علم ظاہری کی حد تک مومن کو تقدیر کا حلقہ بگوش نہیں بنایا گیا اسے جد و جہد کی تعلیم دی گئی۔ اسے اسباب و علل پر نظر رکھنے کا سبق پڑھایا گیا۔ اس سے کہا گیا کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے تقدیر کیا ہے۔ انجام کیا ہوتا ہے۔ یہ سب اللہ کے علم میں ہے۔ علم باری کی نسبت سے کوئی چیز غیر معین، غیر یقینی نہیں۔ ہر وہ واقعہ جو پیش آتا ہے انسانی علم کے اعتبار سے چاہے کتنا ہی اتفاقی اور خلاف توقع ہو لیکن اللہ کے لئے ایک امر معلوم ہے ــ وہ سب کچھ مقدر کر چکا ہے اور اسے پہلے ہی علم تھا کہ زید فلاں جگہ جا کر قتل ہوگا اور اسی علم کو نوشتۂ تقدیر کی شکل دی جا چکی تھی لیکن خود زید کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ فلاں جگہ ضرور جائے۔ اسے عقل و بصیرت دیکر مختار بنا دیا گیا تھا کہ سوچے سمجھے اور ہلاکت سے بچتا رہے۔ اسی طرح اس کے احباب و اقرباء کو بھی ہدایت دی گئی تھی کہ اسباب و علل پر غور کر کے مناسب مشورے دے۔ انجام جو بھی ہو انسان کو تا بہ مقدور تدبیر سے نہ چوکنا چاہئے۔

اسی تفکر کی روشنی میں ہم اضافۂ عمر کے معاملہ پر غور کریں تو کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہ جاتی بلکہ صاف سی بات یہ ابھر کر آتی ہے کہ علم الٰہی کی نسبت سے تو بے شک کسی کی عمر میں ایک لمحہ بھی گھٹ بڑھ نہیں سکتا۔ تقدیر میں جو وقت لکھا جا چکا ہے وہ اسی طرح اٹل ہے جس طرح زندگی بھر کے تمام افعال و اعمال اور واقعات و حوادث۔ لیکن جس طرح ہمیں یہ یقین ہے کہ زہر پی لینے سے موت واقع ہو جائے گی اور آگ میں گر پڑنے سے بدن جل جائے گا، اسی طرح اس یقین میں بھی کوئی چیز حائل نہیں کہ جب اللہ کے رسولؐ صلہ رحمی کو اضافۂ عمر کا ذریعہ بتاتے ہیں تو ضرور اضافہ ہوگا۔ آخر بیماری میں ہم علاج کی طرف دوڑتے ہیں تو کیا اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہم تقدیر کے قائل نہیں۔ اگر منطق ہی سب کچھ ہے تو پھر ہمیں کسی بیماری کا علاج نہیں کرنا چاہئے کیونکہ موت کا وقت تو اٹل ہے۔ تکلیفیں اور راحتیں جو کچھ پیش آتی ہیں وہ بھی مقدر ہیں۔ کوئی ظالم کسی بے گناہ پر تلوار سونت رہا ہو تو اس منطق کی رو سے ہمیں کوئی پروا اس کی نہیں ہونی چاہئے نہ بے گناہ کو بچانے کی سعی کرنی چاہئے کیونکہ وقت سے پہلے وہ مر سکتا نہیں اور وقت ہی آگیا ہے تو کسی کے بچائے بچ سکتا نہیں۔ پھر کیوں ہم سعی لاحاصل کریں۔

مگر ایمان بالقدر کے باوجود اس منطق کو ہم کبھی عملی زندگی میں اختیار نہیں کرتے اور نہ اللہ اور رسولؐ نے بھی اسے اختیار کرنے

کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ تقدیر پر صابر و شاکر رہتے ہوئے مسلسل جد و جہد، تدبیر و تدبر اور اقدام و عمل ہی کی ہدایت فرمائی۔ فلہٰذا صلہ رحمی بھی اضافۂ عمر کے لئے ایسی ہی تدابیر کے زمرے میں ہے بس فرق یہ ہے کہ مادی طریقۂ علاج سے مہلک امراض کا اچھا ہو جانا اور قریب المرگ بیماروں کا صحت پا جانا جانے پہچانے اسباب و علل کے دائرے کی چیز ہے اور صلہ رحمی کے ذریعہ عمر میں اضافہ ہو جانا مخفی امور میں ہے جنھیں عقل و سائنس کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ ایمان بالغیب تو مومن کا طرۂ امتیاز ہے اسی ایک معاملہ میں کیوں اس ایمان سے گریز ہو جبکہ خبر دینے والے ہمارے صادق و مصدوق، معصوم و مطہر محبوب سبحانی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس تفہیم کا منشا یہ ہے کہ اکثر شارحین حدیث نے جو اضافۂ عمر کی توجیہیں کی ہیں اور حقیقتاً اضافے کو صرف احتمال کے درجے میں مانا ہے۔ عاجز کے نزدیک یہ انداز نظر اوفق و ارجح نہیں، بلکہ انسب و اولیٰ طریق یہی ہے کہ اضافے کو اس کے معروف و مروج ہی معنوں میں لیں۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے کہا تھا۔ عمرؓ! تم تقدیر الٰہی سے بھاگ رہے ہو؟ — حضرت عمرؓ نے جواب دیا تھا ہاں بھاگ رہا ہوں لیکن تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف۔

ٹھیک ایسا ہی نکتہ یہاں بھی ہے۔ وقت اجل بیشک تقدیر الٰہی ہی ہے لیکن یہ بھی تقدیر الٰہی ہی ہوگی کہ صلہ رحمی نہ کرنے کی صورت میں اگر ہماری عمر اسّی سال کی ہوتی ہو تو صلہ رحمی کرنے کی صورت میں نوّے کی ہو جائے۔ اللہ کو تو بہرحال علم ہوگا کہ ہم صلہ رحمی کریں گے یا نہیں اور اسی اعتبار سے ہمارا وقت مرگ بھی معین فرما دے گا۔ لیکن دنیا کے اور تمام معاملات میں اگر منفی و مثبت وسائل اختیار کرتے ہوئے ہم اللہ کے علم بسیط پر نہیں بلکہ اپنے محدود علم و مشاہدے پر نظر رکھنے کے مکلف ہیں تو اسی معاملہ میں صلہ رحمی کو اضافۂ عمر کا ایک وسیلہ مان لینے میں کیوں ہم منطقی الجھاؤ پیدا کریں۔

ویسے "اضافۂ عمر" سے وقت میں خیر و برکت مراد لیں تو یہ بھی کوئی غیر واقعی بات نہ ہوگی۔ ہم میں سے کتنوں ہی کو تجربہ ہوگا کہ بعض اوقات تھوڑے سے وقت میں اتنا کام ہو جاتا ہے کہ بعد میں خود کام کرنے والے کو تعجب ہوتا ہے یہ کیسے ہو گیا۔ اسلاف میں ایسے بزرگ گذرے ہیں جن کے تصنیفی کارناموں کو ان کی عمر پر پھیلایا جاتا ہے تو فل اسکیپ کے اسّی صفحات یومیہ کا اوسط بنتا ہے۔ ذرا تجربہ کر کے دیکھئے عام حالات میں کیا یہ ممکن ہے؟ تصنیف تو در کنار فل اسکیپ کے اسّی صفحے روز تو خالی نقل کرنے بھی دشوار ہیں۔ لیکن یہ خیر و برکت ہی تھی کہ یہی امر دشوار ارباب عزیمت کے لئے آسان ہو گیا۔ کون جانے وہ کتنی صلہ رحمی کرتے تھے۔ دور کا نہیں۔ ماضی قریب ہی کا واقعہ ہے کہ اسمٰعیل شہیدؒ نے عصر سے مغرب تک پورا قرآن ختم کر کے دکھلایا تھا۔ اس واقعے کے شاہد ایک دو نہیں سیکڑوں ہیں۔ خود عاجز بھی جو ہر درجہ سیاہ کار و نابکار ہے کسی نہ کسی درجے میں اس کا تجربہ رکھتا ہے کہ وقت میں خیر و برکت ہونا ایک امر حقیقی ہے۔ اب فرض کیجئے ایک گاڑی فی گھنٹہ تیس میل چلتی ہے اور دوسری چالیس میل تو دونوں اگرچہ مساوی وقت تک چلیں مگر دوسری ہر گھنٹہ میں دس میل زیادہ طے کرے گی آدمی کی عمر پچاس سال مقدر ہو، لیکن صلہ رحمی کے انعام میں اس کے اوقات کو برکت عطا کر دی جائے تو یہی پچاس سال ساٹھ اور ستر سال کا کام دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر فضول کاموں سے بچنے کی توفیق اسے مل جائے تو اس سے وہی فائدہ پہنچے گا جو اضافۂ عمر سے پہنچتا ہے۔

حاصل یہ کہ اضافۂ عمر کو کسی بھی مصداق میں لیجئے مگر یہ بہرحال طے ہے کہ صلۂ رحمی اضافۂ عمر کا وسیلہ ہے۔ اب رہی روزی میں اضافۂ و برکت کی بات تو اس پر طول سخن کی ضرورت نہیں۔ جو مومن اللہ کی اس بشارت پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا اضاعتِ مال نہیں بلکہ مال میں اضافے اور خیر و برکت کا موجب ہے وہ محیط وحی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر بھی دل سے یقین رکھے گا کہ صلہ رحمی کے طور پر خرچ کیا ہوا مال ضائع نہیں ہوا۔ بلکہ بقیہ مال میں اضافۂ و برکت کا ذریعہ بنا اور اس کے اجر میں اللہ سرمایہ مال دے گا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ

کیا نوٹوں پر زکوٰۃ نہیں ہے؟

نوٹوں کو جو بخواہ قابل زکوٰۃ بنانے کا تصور نہ کیا جائے شرع نے جو احکام صاحبِ نصاب کے لئے رکھے ہیں اس کی روشنی میں اسے سمجھا جائے۔

محض مالداری یعنی عرف عام میں جسے مالدار سمجھا جاتا ہے اس قسم کے آدمی کو شرع نے صاحبِ نصاب یعنی مالدار قرار نہیں دیا ہے۔ جیسے جواہرات رکھنے والا صاحب نصاب نہیں ہے۔ دیہاتوں میں سوائے سونے چاندی کے کسی دھات کو شرع نے صاحب نصاب بنانے والا نہیں بتایا ہے۔ اس لحاظ سے مثلاً لوہا ہی اگرچہ (مثال تمام) اتنی مقدار میں ہے جسے فروخت کر کے اتنا سونا خریدا جا سکتا ہے جو صاحب نصاب بنا دے یا وجود اس کے اتنی مقدار کا لوہا بھی موجب زکوٰۃ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے نوٹ چاہے وہ کتنے ہی روپیوں کے ہوں مگر وہ کاغذ ہونے کی حیثیت سے بے قیمت ہیں اور سونا چاندی سے بڑھ کر

اس کی حیثیت نہیں، چاہے ان نوٹوں سے اتنا سونا جو آدمی کو صاحب نصاب بنا دے۔ لہذا نوٹوں کی وجہ سے زکوٰۃ لاگو نہیں ہوتی کیونکہ نقد نہیں ہے بلکہ نوٹ کی طرح ہے۔

آج سے بہت پہلے چونکہ روپیہ چاندی کا ہوا کرتا تھا اس لئے روپیوں کی تعداد کو اس کی چاندی کے مجموعہ کی وجہ سے جو چاندی کے نصاب کو مکمل کر دے سابقہ فقہی کتابوں میں روپیوں پر زکوٰۃ کے نام سے لکھ دیا گیا تھا جس سے چاندی مقصود تھی نہ کہ اس کے نوٹ حتیٰ کہ تانبے کے سکے جو پیسے کہلاتے تھے تانبہ کی دھات کے ہونے کی وجہ سے وہ صاحب نصاب بنانے والے نہ ہوتا معتبر کتابوں میں درج ہے۔ جب تانبہ بادانہ نوٹ کے کاغذ سے زیادہ قیمت رکھتا ہے مگر موجب زکوٰۃ نہیں ہے تو نوٹوں کی زکوٰۃ دینے کے لئے نصاب بنانا فقہی اعتبار سے ہرگز جائز نہیں ہو سکتا:

سونا اور چاندی کا نصاب صراحتاً ہونے کے یا دونوں زیور کی تشکیل ہونے کی صورت میں جب امام شافعیؒ کے نزدیک موجب زکوٰۃ نہیں تو نوٹوں کو جو کاغذ کی حیثیت رکھتی ہیں اگر موجب زکوٰۃ نہ مانا جائے تو کسی طرح برا نہ ہوگا۔

کیا ایسے اصحاب جو نوٹوں پر زکوٰۃ لاگو کرنا چاہتے ہیں وہ پوسٹ کے ٹکٹوں کی مقدار نصاب زکوٰۃ کے برابر ہونے کی صورت میں زکوٰۃ دینے کو لازمی سمجھتے ہیں؟ جب نہیں سمجھتے تو نوٹ بھی بالکل یہی حیثیت رکھتا ہے اس لئے موجب زکوٰۃ نہیں۔

سونا چاندی بذاتہ دنیا کے ہر گوشہ میں اپنی قیمت رکھتے ہیں اس لئے موجب زکوٰۃ ہیں بخلاف نوٹوں کے وہ ہر حکومت میں کم و بیش قیمت رکھتے ہیں بلکہ رائج ہی نہیں رہتے۔ سوائے مخصوص بینکوں کے متوسط حکومتی متعلقہ اسلئے بھی نوٹ سونے چاندی کی تعریف میں نہیں آسکتے۔

جواب :-

اللہ تعالیٰ بزرگان سلف پر رحمت فرمائے انھوں نے اجتہاد کے لئے جو کڑی شرطیں تجویز کی ہیں وہ اسی لئے کی ہیں کہ ہر ایرا غیرا بغیر علم و تفقہ کے قانون شریعت کو بگاڑنے نہ بیٹھ جائے۔

جن صاحب نے بیٹھے بٹھائے یہ شوشہ پیدا کیا ہے انھیں کم سے کم یہ تجسس تو کرلینا چاہئے تھا کہ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں کیا کوئی اور بھی معروف و مستند اسلامی ماہر قانون اور مجتہد و فقیہ ایسا ہے جس نے یہ رائے قائم کی ہو۔ کچھ صدیوں پہلے نوٹ نہ چلتے ہوں لیکن سکے تو چلتے ہی تھے اور یہ سکے جہاں چاندی اور سونے کے ہوتے تھے وہیں دوسری دھاتوں کے بھی ہوتے تھے۔ کیا کبھی کسی اسلامی قانون داں یا مفتی شریعت نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ رائج الوقت سکہ کسی کے پاس کتنا ہی جمع ہو اس پر صرف اسی صورت میں زکوٰۃ عائد ہو سکتی ہے جب وہ چاندی یا سونے کا ہو۔ اگر ان دونوں میں سے کسی کا نہیں تو اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔

اگر اس قسم کا فیصلہ مستند علمائے دین و شریعت کی طرف سے کبھی صادر نہیں کیا گیا تو وہ شخص کس قدر خیرہ درائے برخود غلط اور جری قرار پائے گا جو محض ایک قیاسی استدلال سے متفق علیہ مسئلہ کو چیلنج کرتا ہے اور دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ چودہ سو سالوں کے تمام فقہاء و مجتہدین قانون اسلام کا وہ شعور نہیں رکھتے تھے جو میں رکھتا ہوں اور زکوٰۃ جیسے اہم ترین مسئلہ میں بھی انھوں نے شریعت کے صحیح حکم کو نہیں سمجھا۔

دنیاوی قانون میں تو ہم سب کا روزمرہ یہ ہے کہ اوپر کی عدالتوں سے اگر کسی قانون کے سلسلہ میں کوئی رولنگ آجاتی ہے تو وکلاء اور جج صاحبان اس کا بھی لحاظ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں "نظائر" کا ایک مستقل مقام قانون میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر اونچی عدالتوں نے ایک قانون کی تعبیر میں کوئی نیا نازک پہلو نکالا ہے تو اسے بھی غیر معمولی اہمیت اس لئے دی جاتی ہے کہ فعل مستند ماہرین قانون سے صادر ہوا ہے۔

تو کیا شرعی قانون میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ فلاں مسئلہ میں اسلام کے بڑے بڑے قانون داں اور مفتیوں نے کیا فیصلے دیئے ہیں اور اعلیٰ پائے کے مجتہدین کیا رائے ظاہر کرتے آئے ہیں۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کی تاکید قرآن میں جس قدر آئی ہے کسی بھی عبادت کی نہیں آئی۔ نماز کو جو اساسی اہمیت جسمانی عبادات میں حاصل ہے وہی زکوٰۃ کو مالی عبادات میں حاصل ہے۔ ناممکن تھا کہ قانون شریعت کے بلند پایہ عالمین اور اسلام کے مستند شارحین اس اساسی اہمیت کے قانون کی کسی بھی باریکی کو نظرانداز کر جاتے یا اس کے سلسلہ میں کسی خاص فیصلہ پر خواہ مخواہ بلا دلیل شرعی اتفاق کر لیتے۔ اگر تمام فقہائے امت کا اس پر اجماع رہا ہے کہ سکۂ رائج الوقت کی صورت میں جو دولت جمع ہو اس پر بھی زکوٰۃ لازم آتی ہے تو ہمارے فاضل مجتہد کو خود سوچ لینا چاہئے کہ وہ کس مقام پر کھڑے ہیں۔

ہر قانون کے کچھ مصالح اور مفادات ہوا کرتے ہیں زکوٰۃ کی یہ مصلحت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ جن لوگوں کو اللہ نے ان کی ضرورت سے زیادہ رزق دیا ہے وہ اپنے رزق کا کچھ حصہ ان بندگان خدا کی طرف منتقل کریں جنھیں رزق کم ملا ہے اور مزید رزق کے وہ محتاج ہیں۔

نوٹ کی حیثیت آئینی حیثیت خواہ کچھ ہو دیکھنا یہ ہے کہ اس پر مال و دولت کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں۔ آج ہی نہیں ہمیشہ سے یہ اصطلاح زبان زد خاص و عام ہے کہ فلاں شخص مالدار ہے۔ اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے یہ شوشہ کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا کہ اس شخص کے پاس لازماً سونا چاندی جمع ہے بلکہ صرف یہ بات ذہن میں ہوتی ہے کہ یہ شخص پیسے والا ہے۔ آپ لکھ پتی اسے کہتے ہیں جس کے پاس لاکھ روپے جمع ہوں خواہ نوٹوں کی شکل میں خواہ چاندی کے سکے کی شکل میں۔ آجکل تو کم سے کم ہمارے ملک میں چاندی یا سونے کے سکوں کا سوال ہی نہیں — دولت یا تو جائداد کی شکل میں ہوتی ہے یا نوٹوں کی شکل میں۔ نوٹ ہی وہ چیز ہے جس سے آپ بازار کی ہر شئے خریدتے ہیں۔ خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان یہ بحث نہیں اٹھتی کہ یہ اصل دولت ہے یا اس کی رسید۔ سونے اور چاندی سے بڑھ کر ان کاغذوں میں تاثیر ہے مثلاً ایک ماشہ سونا لے کر آپ سبزی فروش کی دوکان پر چلے جائیں کہ لاؤ دو کلو گوبھی دیدو اور باقی پیسے لوٹا دو۔ تو وہ آپ کی صورت دیکھ کر ہنسے گا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوں گی۔ لیکن نوٹ لے کر آپ جائیں تو کسی بحث اور تاخیر کے بغیر آپ کو ترکاری اور بقیہ ریزگاری مل جائے گی اسی کا نام ہے دولت۔ یہی ہے وہ چیز جس کی غربت کو حاجت ہے۔ فاقہ کش آدمی کو پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے آپ کا دیا ہوا نوٹ ہی بالکل کافی ہو جاتا ہے اور نان بائی اس سے یہ بحث نہیں کرتا کہ تم دولت نہیں بلکہ صرف رسید لئے پھر رہے ہو۔

سونا اور چاندی کو خصوصیت قانون شرعی میں صرف اس لئے دی گئی کہ پوری دنیا میں وہی معیار زر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھیں کھایا نہیں جا سکتا۔ اوڑھا نہیں جا سکتا بچھایا نہیں جا سکتا۔ ان کی اہمیت فقط یہ ہے کہ ان کے بدلے دوسری ضروریات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ایک تولہ سونا دیکر آپ دو کوئنٹل گیہوں خرید سکتے ہیں۔ دوسری کوئی بھی ضرورت کی چیز فراہم کر سکتے ہیں اور نوٹ ہی دیکر آپ چاندی اور سونا بھی مول لے سکتے ہیں۔ لہٰذا نوٹ کی قانونی حیثیت جو بھی ہو وہ مسلمہ طور پر مال اور دولت ہے۔ محض ظاہری شکل و ہیئت نے اس کی افادیت میں کوئی فرق واقع نہیں کیا۔

آئیے ایک نظر قرآن پر بھی ڈال لیجئے۔

قرآن میں دسیوں جگہ اللہ تعالیٰ نے رزق کا ذکر فرمایا ہے۔

(۱) وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔

(اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے)

(۲) یَرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

(تمہیں رزق دیتا ہے آسمان اور زمین سے)

اَللّٰہُ یَرْزُقُھَا وَاِیَّاکُمْ

(اللہ اسے بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی)

ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ ایسی تمام آیات میں رزق سے مراد محض دکھا ہوا کھانا یا اناج یا چاندی سونا یا جائداد نہیں بلکہ وہ چیز ہے جسے محاورے میں "مال و منال" کہا جاتا ہے۔ کسی شخص کے پاس سونا چاندی نہ ہو مگر ایک کروڑ روپے نوٹوں کی شکل میں جمع ہوں تو اسے مفلس نہیں مالدار کہیں گے۔ ان نوٹوں پر "رزق" کا اطلاق ہوگا کیونکہ یہ کاغذ کی بے فائدہ رسیدیں نہیں بلکہ اپنی لیشت پر حکومت و قوت کی ضمانت لیے ہوئے سکے ہیں جن سے ہر چیز پلک جھپکتے خریدی جا سکتی ہے۔ سونا اور چاندی بھی ان کی کنیزیں ہیں۔ زندگی گزارنے کا ہر سامان یہ چٹکی بجاتے مہیا کر سکتے ہیں۔

غرض آجتک کوئی مفسر اور فقیہ ایسا نہیں گزرا جس نے قرآن کے لفظ رزق کو دولت کی کسی خاص نوع تک محدود قرار دیا ہو بلکہ کھلے طور پر اس لفظ کا اطلاق "مال و دولت" پر ہی ہوتا ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔

اب ان بعض آیات پر نظر ڈالئے جن میں زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی کے سلسلہ میں لفظ "رزق" ہی استعمال ہوا ہے۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ (بقرہ)

(اے اہل ایمان جو رزق تمہیں اللہ نے دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو)

(۲) يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ (رعد)

(نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)

(۳) يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (انفال)

ان آیات سے دو اور دو چار کی طرح یہ بات صاف ہو گئی کہ زکوٰۃ ہر اس مال میں ہے جس پر "رزق" کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بنیادی قانونِ الٰہی کی تفصیل اور تشکیل اللہ کے رسولؐ نے وحی کی روشنی میں فرمائی اور متعین کیا کہ کم سے کم کتنے مال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور مال کی کونسی قسم میں کس کس اوسط سے زکوٰۃ نکالنی چاہیئے۔

مزید دیکھئے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا۔

اَلَّذِينَ يُنْفِقُونَ	جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا
أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ	مال دن رات چھپے اور کھلے
وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً	خرچ کرتے ہیں ان کے لئے
فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ	اللہ کے پاس ان کا اجر ہے
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	اور ان کے لئے کوئی خوف نہ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔	غم نہیں۔

کیا آدمی دن رات غرباء کو سونا چاندی بانٹے گا۔ کیا اس آیت میں مال کا اطلاق سوائے ان سکوں کے بھی کسی چیز پر ہوتا ہے جن سے ہر چیز خریدی جاتی ہے۔ آدمی زکوٰۃ کے طور پر کسی غریب کو کپڑا پہنا دے یا مکان دیدے تو اگرچہ آیت کا مصداق وہ بھی ہے لیکن اصلاً آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو معمولاً ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کی کوششیں کرتے ہیں اور ان کے لیل و نہار میں انفاق فی سبیل اللہ کا شغل کثرت سے موجود ہوتا ہے اس کا اہم ترین مصداق وہ سکہ ہی ہے جو کسی بھی مقام پر کسی بھی شکل میں رائج ہے۔ زید کو بچوں کے لئے کتابوں کی ضرورت ہے۔ بکر کو لڑکی کے بیاہ کے لئے سامان چاہیئے۔ عمرو کو بیمار بیوی کا علاج کرانا ہے۔ اس طرح کی گوناگوں ضرورتوں کی دواء کنجی پیسہ ہی ہے۔ آپ اول الذکر کو کتابیں۔ ثانی الذکر کو ساز و سامان اور ثالث الذکر کو دوائیں لاکر نہیں دیں گے بلکہ پیسہ دیں گے تاکہ ان میں سے ہر شخص اپنی ضرورت کی شے مہیا کرلے۔ یہی وہ مسلسل معمول ہے جس کی طرف آیت نے اشارہ کیا ہے۔ پھر بتائیے کیا نامعقولیت کے سوا اور بھی کوئی نام اس اجتہاد کو دے سکیں گے کہ اس نوٹ پر زکوٰۃ عائد نہ ہو جو تمام ضروریات کی شاہ کلید ہے۔

قرآن بار بار لفظ "اموال" بھی استعمال کرتا ہے۔ اموال مال ہی کی جمع ہے۔ مال ہر وہ شئے ہے جس کے بدلے آپ کوئی ضرورت زندگی حاصل کر سکیں۔ نوٹ سے بڑھکر مال اور کیا ہوگا جسے کسی بھی ملک کے اس سرے سے اس سرے تک ہر فرد بلا تامل قبول کر کے بدلے میں مطلوبہ چیز دیدیتا ہے ہندوستان کا نوٹ پاکستان میں یا پاکستان کا امریکہ میں یا امریکہ کا چین میں نہ چلے تو اس سے اس کی اس حیثیت پر کیا اثر پڑا جو زکوٰۃ کا بنیادی موجب ہے۔ یعنی اہل حاجت کی حاجت براری۔ آپ یہ نوٹ ہندوستان میں بیٹھ کر کسی چینی غریب کو تو دے نہیں رہے ہیں جو اسے چین لے جاکر روٹی خریدنے کی کوشش کرے گا۔ آپ اپنے ہی ملک کے ان غرباء کو دے رہے ہیں جو اسی ملک میں اس سے اپنی ضروریات حاصل کریں گے۔

خوب ہے آپ کی عقلی گدے بازی جس میں آپ نے بالکل سامنے کی بات بھی نہیں سوچی۔ کیا یہ سامنے کی بات نہیں کہ اگر نوٹ پر زکوٰۃ نہ ہو تو عام غرباء پروری کا وہ سلسلہ ہی نہ ہونے کے برابر رہ جائے جو تعلیمات اسلامی کی جان ہے سونا چاندی کتنوں کے پاس زیادہ ہوتا ہے۔ پھیلاؤ اور کثرت

تو سکّے کی ہے۔ نوٹ کی ہے۔ اسی لئے ہر شہر و دیار میں زکوٰۃ کا پھیلاؤ ہے۔

خلاصہ یہ کہ قانون شرعی میں بیٹھے بٹھائے قیاس و منطق کے تیر تکّے چلانے سے توبہ کیجئے اور طے شدہ مسائل کو نزاعی بنانے کا مذموم فعل انجام نہ دیجئے۔

آخر میں ایک غلط فہمی رفع کر لی جائے۔

تانبے کے سکّے کے بارے میں فقہ کی معتبر کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے موصوف نے سمجھا ہی نہیں اور سمجھا اسلئے نہیں کہ ان پر اجتہاد کا بھوت سوار ہے۔

تانبہ معیارِ زر نہیں ہے لہٰذا وجوب زکوٰۃ کی وہ قانونی وجہ اس میں نہیں پائی جاتی جو چاندی سونے میں پائی جاتی ہے۔ لیکن تانبے کا جو سکہ بازار میں چل رہا ہو اسے کوئی بھی بڑی مقدار میں جمع کر کے نہیں رکھتا۔ کوئی مثال اس کی نہیں دی جا سکتی کہ کبھی کسی شخص نے اپنی دولت رائج الوقت تانبے کے سکوں میں منتقل کر کے جمع کر رکھی ہو۔ لہٰذا اس پر نوٹ کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے اور اسلام مفروضات کا مذہب نہیں حقائق و واقعات کا دین ہے۔ رہے وہ تانبے کے سکّے جنھیں اس مقصد سے جمع کیا جائے کہ کچھ نفع سے کر فروخت کریں گے تو ان پر مالِ تجارت کی حیثیت سے زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح تانبے کی کان پر زکوٰۃ ہے۔ خام تانبے کا کاروبار کیا جائے تو اس پر بھی مال تجارت کے قواعد سے زکوٰۃ ہے۔ غرض تانبے کے سکے پر صرف اس مخصوص و محدود حالت میں زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی جب وہ رائج الوقت سکہ کی حیثیت سے موجود ہو اور اسے جمع کر کے کسی نفع کی امید نہ کی جا سکے۔

پوسٹ کے ٹکٹوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ کوئی شخص اپنی دولت ان ٹکٹوں میں منتقل کر کے نہیں رکھتا۔ اگر یہ ٹکٹ رائج الوقت ہیں تو لوگ انھیں ضرورت کے مطابق ہی خریدتے ہیں خرید کر استعمال کر ڈالتے ہیں۔ ان پر سال گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر سال گزر بھی جائے تو یہ ضروریات میں شامل ہیں۔ انھیں اگر کاروباری مراسلت میں صرف کیا جاتا ہے تو ان کی زکوٰۃ فی الحقیقت اس زکوٰۃ میں شامل ہے جو کاروبار پر قواعد کے مطابق واجب ہوگی۔ اور اگر وہ ذاتی مراسلت کے لئے ہیں تو ان کا "ضروریات" میں شامل ہونا ظاہر ہی ہے۔ آخر غیر تجارتی کتابوں اور ذاتی رہائش کے مکانوں اور مصنوعات نکالنے والی مشینوں پر بھی تو زکوٰۃ نہیں ہے۔

رہے وہ پرانے ٹکٹ جنھیں بعض لوگ جمع کرتے ہیں تو اگر انھیں محض شوقیہ جمع کیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بے قیمت شے ہیں اور اگر فروخت کی نیت سے کیا ہے تو ان کی کوئی قیمت ہی متعین نہیں۔ محض چانس پر منحصر ہے کہ دو پیسے والا ٹکٹ دس روپے میں بک جائے یا سو روپے میں یا نہ بکے۔ لہٰذا ان پر فی الحال زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی کہ یہ مال ہی نہیں ہیں ہاں جب بک جائیں گے تو حاصل شدہ رقم پر سال بھر بعد اسی قاعدے سے زکوٰۃ واجب ہوگی جس قاعدے سے روپے پیسے پر ہوتی ہے۔

سونے چاندی کا نصاب زکوٰۃ

سوال :-

مجھے بڑی الجھن ہے کہ بچپن سے تو یہ سنتا آیا تھا کہ سونے کی وہ مقدار جس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے ساڑھے سات تولہ سونا اور چاندی کی ساڑھے باون تولہ ہے۔ مگر اب کئی جگہ مستند حضرات کے قلم سے یہ پڑھنے میں آیا کہ نصاب کچھ اور ہے۔ مثلاً احناف کے معروف عالم مولانا عبدالشکور فاروقی اپنی کتاب علم الفقہ جلد چہارم سونے چاندی کی زکوٰۃ کے بیان میں رقمطراز ہیں :-

"چاندی کا نصاب دو سو درم ہے جس کے ۳۶ تولہ ساڑھے سات ماشے ہوتے ہیں"

اور ــــ "سونے کا نصاب بیس مثقال ہے جس کے پانچ تولہ ڈھائی ماشہ ہوتے ہیں"۔

سنا ہے احناف کے مشہور مفتی مولانا عبدالحی کی بھی یہی رائے تھی اور بازار میں موجود بعض نئی کتابوں مثلاً آسان فقہ

اور اسلامی فقہ میں بھی اسی کے مطابق ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ جماعت اسلامی کے رسالے زندگی میں بھی ایسا ہی دیکھا تھا۔

میرے لئے یہ باور کرنا آسان نہیں ہے کہ زکوٰۃ جیسی عبادت کے معاملہ میں زمانۂ قدیم کے اتنے بڑے بڑے علماء غلطی کرتے چلے آرہے ہوں اور اسکی تصحیح اب بعد کے علماء نے کی ہو۔ مگر تحقیقی علم نہیں رکھتا۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ تجلی میں درج ذیل سوالوں کے جوابات شائع فرمائیں تاکہ جدید الطبع کتابوں سے جو الجھن میری طرح بہت سے اور لوگوں کو پیدا ہوئی ہوگی وہ دور ہو۔

(۱) حساب کا مسئلہ نظری مسئلہ نہیں ہے کہ اس میں ارباب نظر کے اختلاف رائے کی گنجائش ہو۔ دس اور دس بیس ہی ہوں گے کم زیادہ نہیں ہوں گے۔ اسی طرح چاندی اور سونے کا نصاب بھی ٹھیک وہی ہوگا جو قرآن و حدیث سے ثابت ہو۔ پچھلے علماء و فقہاء سے اتنی بڑی غلطی آخر کیسے ہوگئی کہ سونے چاندی کے نصاب کا صحیح وزن تشخیص نہ کرسکے بلکہ غلط وزن پر متفق ہوگئے

(۲) ہم لوگوں کو زکوٰۃ قدیم تحقیق کے مطابق نکالنی چاہیئے یا جدید تحقیق کے مطابق۔ بینوا توجروا۔

جواب :-

جہاں تک جدید الطبع کتب فقہ کا تعلق ہے ان کے مصنفین نے تو بہت سے مسائل محض نقل کردیئے ہیں اور ذاتی طور پر کچھ تحقیق نہیں کی ہے۔ مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ کافی مستند اور شہرت یافتہ علمائے حق کی صفوں میں شمار ہوتے ہیں اس لئے بعض جلد بازوں نے یہ خیال کیا کہ انھوں نے پوری تحقیق و تدقیق کے بعد ہی پچھلے فقہاء کی رائے کے خلاف نئی رائے پیش کی ہوگی اور پچھلے فقہاء سے سونا چاندی کا نصاب متعین کرنے میں کوئی ایسی چوک ہوگئی ہوگی جسے مولانا عبدالحی جیسے ثقہ عالم نے پکڑ لیا ہے۔

بس اسی اعتماد پر بعض لوگوں نے ان کی رائے کو قبول کرلیا اور مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بالغ نظر عالم بھی اسی مغالطے کا شکار ہوگئے۔

حالانکہ فقہائے سلف کی غلطی پکڑنے میں جو غلطی خود ان بزرگوں سے سرزد ہوئی اس کا ادراک ان حضرات کو ہوجاتا اگر وہ ٹھنڈے دل سے اس نکتے پر غور کرلیتے کہ ساڑھے باون تولہ چاندی اور ساڑھے سات تولہ سونے پر نصاب زکوٰۃ دینے کی رائے کسی ایک یا چند علماء کی نہیں بلکہ اس پر اجماع چلا آرہا ہے۔ حدیث کی رو سے چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ یعنی دوسو درہم ہے اور سونے کا بیس مثقال یعنی بیس دینار۔

یہ عربی اوزان تولہ اور ماشہ کی اصطلاح میں کیا اور کتنے ہوتے ہیں۔ تب سے یہ بات علماء و فقہاء نے طے کی برابر تمام علماء اس سے اتفاق کرتے چلے آرہے ہیں اور مولانا عبدالحیؒ سے قبل کسی معتبر مفتی اور فقیہ کا اس سے اختلاف منقول نہیں۔ اسی کا نام ہے اجماع۔ اس اجماع سے اختلاف کرنے کے لئے بڑے قوی دلائل کی ضرورت تھی اتنے قوی دلائل جو قطعیت کے ساتھ ثابت کردیں کہ عربی اوزان کو ہندوستانی اوزان سے مطابقت دینے میں علمائے سلف نے غلطی کھائی۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسے دلائل کے بغیر ہی محض کمزور دلیل اور سطحی تحقیق کے سہارے ایک نیا قول پیش کردیا گیا اور پھر پیش کرنے والے کی شہرت و علمیت کے اعتماد پر کچھ دوسرے لوگ اسے نقل کرنے لگے۔

تحقیق دقیق اور غور و تفحص کے بعد صحیح رائے یہی ثابت ہوتی ہے جو فقہائے سلف نے قائم کی ہے یعنی سونے کا نصاب ۷½ تولہ ہے اور چاندی کا ۵۲½ تولہ اس سے کم پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی

کبھی کبھی گمان ہمارے قلب میں بھی گزرا ہے کہ جدید نئی تحقیق احتیاط کے زیادہ قریب ہے۔ نسبتاً کم وزن پر اگر لوگ زکوٰۃ نکالیں تو بہرحال مفید ہوگا۔ نقصان اس

وقت ہوتا جب نئی تحقیق میں وزن گھٹانے کے بجائے بڑھا دیا جاتا یعنی یوں کہا جاتا کہ ساڑھے سات تولہ سونے یا ساڑھے باون تولہ چاندی پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی بلکہ اس سے زائد فلاں وزن پر عائد ہوتی ہے۔ اس صورت میں خطرہ تھا کہ اگر یہ رائے غلط ہو تو کتنے ہی لوگ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے مجرم ٹھہریں گے۔ بحالت موجودہ ایسا خطرہ نہیں ہے۔

لیکن اپنے اس گمان کو ہم صحت مند اور قابل تقلید نہیں کہہ سکتے۔ خصوصاً جب معاملہ تحقیق کا آپڑے اور گفتگو تھیوری قانون شریعت کی ہو تو اس مانی احتیاط کا مطلب یہ ہوگا کہ خدانخواستہ ہمارے معروف فقہائے سلف غیر محتاط تھے اور قوانین شرعیہ کی تحقیق و تنقیح میں انھوں نے احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا۔ ایسا تصور کرنا بڑی جسارت ہے اور اس سے فقہائے عظام کا اعتماد مجروح ہوتا ہے۔ اس لئے ہم بلا ابہام صاف کہیں گے کہ یہ جدید رائے غلط ہے اور سونے چاندی کا نصاب ہندوستانی اوزان میں وہی ہے جو قدیم سے چلا آرہا ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ ہم صرف فقہائے قدیم کی ساکھ قائم رکھنے کے لئے تقلیداً ایسا کہہ رہے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہم نے اپنی بساط کے مطابق خود بھی اس مسئلہ کی پوری چھان بین کی ہے اور جدید رائے کو غلط پایا ہے۔

زیادہ تفصیل میں یہاں ہم اس لئے نہیں جائیں گے کہ یہ بڑا دقیق اور پیچیدہ حسابی معاملہ ہے۔ عوام کے لئے اس کا سمجھنا مشکل ہوگا۔ ہاں جدید رائے کا کوئی حامی اگر ہماری رائے کو بادلائل چیلنج کرے تو ہم کھل کر گفتگو کرسکیں گے۔ ویسے مولانا عبدالشکور کی علم الفقہ چونکہ عام ہے مجموعاً مستند بھی ہے اور خود ہم بعض لوگوں کو اس سے استفادے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں اس لئے تھوڑی سی گفتگو اس حاشیہ پر کرنا مفید خیال کرتے ہیں جو علم الفقہ میں اس مقام پر دیا گیا ہے۔

اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ چاندی کا نصاب زکوٰۃ دوسو درہم اور سونے کا بیس مثقال ہے اور اس میں بھی اختلاف نہیں کہ درہم سے مراد وہ درہم ہے جس کے دس درہم سات مثقال کے برابر ہوتے ہیں۔ اسے اصطلاح فقہ میں وزن سبعہ کہا جاتا ہے۔

اختلاف جہاں سے واقع ہوا ہے وہ یہ پہلو ہے کہ مثقال یعنی دینار کا وزن تولہ ماشہ میں کیا ہوتا ہے۔ علم الفقہ کے مصنف مولانا فاروقی علیہ الرحمہ نے خدا جانے کس دلیل قطعی سے یہ لکھ دیا :-

• "اور مثقال بالاتفاق تین ماشے اور ایک رتی کا ہوتا ہے"۔

اگر ان کا یہ دعویٰ صحیح ہوتا تو پھر جملہ علمائے سلف آخر کس وجہ سے یہ کہہ سکتے تھے کہ چاندی کا نصاب ۵۲ ½ تولہ ہے۔ وہ بہرحال اس سے متفق تھے کہ چاندی کا نصاب دوسو درہم ہے اور دس درہم سات مثقال کے برابر ہوتے ہیں۔ ایک مثقال کو تین ماشہ اور ایک رتی کا مان لینے کی صورت میں وہ بھی لازماً یہی کہتے کہ چاندی کا نصاب چھتیس تولہ ساڑھے پانچ ماشہ ہے ایسا نہ کہنا دلیل ناطق ہے اس بات کی کہ وہ مثقال کو تین ماشہ ایک رتی کا نہیں مانتے تھے بلکہ ساڑھے چار ماشہ کا مانتے تھے جس کے نتیجہ میں دوسو درہم کا ہندستانی وزن ۶۳۰ ماشہ بنتا ہے اور اسی کا مختصر نام ساڑھے باون تولہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مثقال کے جس وزن کو مولانا فاروقی نے اتفاقی قرار دیا ہے وہ اتفاقاً ہرگز نہیں بلکہ بڑے بڑے علماء اور ماہرین اس سے مختلف رائے ظاہر کرتے ہیں۔

اجماع اس پر ہے کہ ایک مثقال بہتّر حبّہ کا ہوتا ہے۔ حبّہ ½ رتی کو کہتے ہیں، گویا ایک مثقال ۳۶ رتی کا ہوا۔ ۳۶ رتی کا مطلب ۳ ماشہ ایک رتی کیسے ہوسکتا ہے جب کہ ایک ماشہ آٹھ رتی کو کہتے ہیں ۳۶ رتی کو چار ماشہ اور چار رتی کہیں گے۔ جب ایک مثقال

(دینار) چار ماشہ چار رتی کا ہوا تو ۷ مثقال کا وزن لگائیے ٹھیک باون تولہ ۶ ماشہ رہے گا۔ یہ تو چاندی کا نصاب ہوا۔ سونے سے متعلق علم الفقہ کے حاشیہ میں لکھا گیا:-

"اسی طرح سونے کے نصاب میں بزرگوں نے غلطی کی ہے۔ تمام فقہاء لکھتے ہیں کہ سونے کا مثقالی حساب سے تین ماشہ ایک رتی کا ہے۔ پس تین ماشہ ایک رتی کو بیس سے ضرب دیا جائے تو پانچ تولہ ڈھائی ماشہ ہوتا ہے۔"

حالانکہ بیس سے ضرب چار ماشہ چار رتی کو دینی چاہئے جس کا حاصل ضرب ۲۰،۷ رتی ہوگا۔ اور اس کے تولے بنائیں گے تو وہی ۷ ½ تولہ ثمرہ نکلے گا۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے مثقال کے وزن کی تشخیص بنیاد اختلاف ہے۔ اس کا قطعی دستاویزی حقائق نے کر دیا ہے کہ فقہائے قدیم کی رائے مبنی برحق تھی۔ آثار قدیمہ کے طور پر قدیم زمانۂ اسلام کے جو دینار مختلف عجائب خانوں میں محفوظ کئے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی سوا چار ماشہ سے کم نہیں۔ گویا چار ماشہ تین رتی وزن کا استعمال میں گھس جانا قرین قیاس ہے لہٰذا وہی چار ماشہ چار رتی وزن نکلا۔ یہی فقہائے سلف کی اجماعی رائے تھی اور جن فقہاء نے مثقال (دینار) کو تین ماشہ ایک رتی کے ہم وزن قرار دیا ان کی غلطی دستاویزی ثبوت نے واضح کر دی۔

یہ بھی محققین نے صراحت کی ہے کہ درہم تو باعتبار وزن بدلتا بدلتا رہتا ہے مگر دینار باعتبار وزن وہی چلا آرہا ہے جو زمانۂ قبل اسلام اور عہد رسالت کے دیناروں میں رائج تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ صحابہ و تابعین کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ دس درہم سات مثقال کے برابر ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ نصاب میں اسی درم کا اعتبار ہوگا جو سات مثقال کے برابر ہو۔ بعد میں درم کا وزن بدلتا بدلتا رہا تو اس کا اعتبار نہیں اسی لئے بنیادی اہمیت درہم کے بجائے مثقال کی سمجھی چاہئے جس کا وزن تبدیلیوں سے بے نیاز رہا ہے۔ خلاصہ جواب یہ ہے کہ جن علماء نے نصاب قدیم کے خلاف نیا نصاب پیش کیا وہ اگرچہ مخلص اور قابل احترام ہیں لیکن نادانستہ طور پر ان سے قصور ہوا ہے اور کسی کو ان کی پیروی نہیں کرنی چاہئے۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

قدم قدم کتنے زخم کھا کر فا ہوئی فتحیاب لیکن
وفا کا پایا یا صلہ جو ہم نے وہ بیوفاؤں کے کام آیا
متاعِ بخیہ گری بھی ہم کو نہیں میسر کہ زخم سی لیں
بچا لیا تھا جو رہزنوں سے وہ رہنماؤں کے کام آیا

اُس کا ننھا سا قطرہ ہوں پھولوں میں تُل جاؤں گا
دولت کی میزان میں لیکن تول نہ پائے گا کوئی
شہر کے ہر شہ زور سے کہہ دو پوری کوشش کر دیکھے
میرے دستِ طلب کی مٹھی کھول نہ پائے گا کوئی

مولانا
عامر عثمانی
نور اللہ مرقدہٗ

کون کہتا ہے ہم سب کو بھی ہیرے کی کنی ملے تھے
میرے ساتھی ان ہیروں سے عادل کے شیشے کاٹ رہے ہیں
رنگیں خوابوں کا اک دفتر ہم سب نے تصنیف کیا تھا
میرے ساتھی اس دفتر کو دیمک بن کر چاٹ رہے ہیں
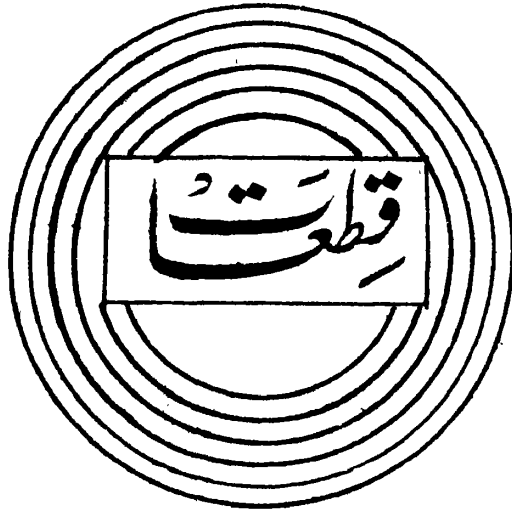
کانٹے تو کانٹے ہی ٹھہرے آگ بنے ہیں لالہ و گل
ایسے میں جینا ہی بہت ہے جیسے بھی جی لیتے ہیں
کرب و بلا کے صحراؤں میں پانی کی اک بوند نہیں
جب شدت کی پیاس لگے ہے آنسو ہی پی لیتے ہیں

بھیک

مولانا عامر عثمانیؒ

کل بصد عجز و ادب ایک بڑے تاجر سے — عرض کی میں نے تجلّی کی اعانت کیجیے
اس کا مقصد ہی کہ ہوں نیند کے ماتے بیدار — آپ اس مقصدِ زرّیں کی حمایت کیجیے
فرض ہے دین کی تبلیغ مسلمانوں پر — جتنا مقدور ہو مذہب کی اشاعت کیجیے
ہم ہیں نادار مگر عزم جواں رکھتے ہیں — آپ زردار ہیں دولت سے کفالت کیجیے

ہو اگر عذر کوئی خدمتِ اعزازی میں
صرف سالانہ خریداری کی زحمت کیجیے

ہنس کے فرمایا کہ اے عامرِ فرسودہ خیال — تو ابھی تک ہے اسیرِ غمِ فکر و اسلام
تیرے اعصاب پہ طاری ہی قدامت کا جنوں — ہیں تیرے دیدۂ و دل فرقہ پرستی کے غلام
اسپ تہذیب و ترقی تو کہاں تک پہنچا — تو لئے پھرتا ہے صدیوں کے پرانے اوہام
دیکھ اسوقت زمانے کے تقاضے کیا ہیں — کونسی چیز ہے جس چیز کے طالب ہیں عوام
آج دنیا کو ضرورت ہے رواداری کی — بامِ مسجد کی فصیلوں پہ سجا دے اصنام
صوتِ آذان کو ناقوس کی تانوں سے ملا — ہے یہ بے وقت کی شہنائی حلال اور حرام
آجکل ایک نجی چیز ہے مذہب و دھرم — وعظ و تبلیغ و ہدایت کے قضیوں کو سلام
متحد قوم کی تشکیل کا وقت آیا ہے — نشر ہوتے ہیں وسیع النظری کے پیغام

ہند کے دامن راحت میں اگر رہنا ہے
برسرِ عام نہ لے دین کی تبلیغ کا نام

عرض کی میں نے کہ قبلہ نے بجا فرمایا　　جانتا میں بھی ہوں اس دور کے تازہ حالات
میں بھی ہوں فتنہ و تفریق و تعصب کے خلاف　　بغض و کینہ سے بہت دور ہے مومن کی حیات
میں بھی ہوں معترفِ امن و اخوت لیکن　　مجھ سے ہو سکتی نہیں بندگیِ لات و منات
قیمتی چیز ہے دل جوئیِ اربابِ وطن　　خوب ہے متحدہ قوم کے پرچار کی بات
دین و مذہب کو مگر آپ غلط سمجھے ہیں　　دین و مذہب ہی میں پوشیدہ ہے قوموں کی نجات

وعظ و تبلیغ کا مفہوم نہیں دار و گیر
شورش و فتنہ و ہنگامہ نہیں جشنِ برات

بولے "بس خیر ہمیں بحث نہیں کرنی ہے　　پاسِ خاطر کیلئے کچھ تجھے دینا ہے ضرور
ویسے اچھا تو یہی تھا کہ رسالے کے عوض　　چھیڑتا کارِ تجارت کوئی حسبِ مقدور
آجکل دین کا بازار بہت مندا ہے　　ہو رسالہ بھی تو فلمی اسے ہونا ہے ضرور

دس کا اک نوٹ بڑھاتے ہوئے ارشاد کیا
"لے اسے خرچ میں لا جیسے تجھے ہو منظور"

نوٹ! وہ بخششِ زردار الٰہی توبہ　　جیسے بھٹی کا دہکتا ہوا انگارہ ہو
بھیک، احسان، کرم، داد و دہش لطف و عطا　　جیسے محتاج و گدا عامرِ بیچارہ ہو
میں نے چندہ کی جگہ بھیک نہیں مانگی تھی　　بھیک دو اس کو جو محتاج ہو ناکارہ ہو
ایسی ندرازِ نوازش پہ ہزاروں لعنت　　جس سے خود داریِ مفلس کا جگر پارہ ہو

لے لیا نوٹ مگر لے کے وہیں پھاڑ دیا
اپنے افلاس کی غیرت کا علم گاڑ دیا

کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کرنے کی والہانہ ریت جس ہستی نے سب سے پہلے ڈالی اس کا حسین نام خبیب بن عدی تھا۔ مدینہ کے اس مومن کو مکہ کے کافروں نے قید کیا اور ایک شخص نے احد کی جنگ میں مارے جانے والے عزیزوں کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اس مومن کو خریدا تاکہ اس کے خون ——— مقدس خون اور بے گناہ خون سے اپنے وحشیانہ انتقام کی پیاس بجھائے خبیب رض کو ماریہ کے گھر میں بند کیا گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ خبیب رض آدھی رات کو خدا کے آگے دست بستہ کھڑے ہو کر اس طرح رویا کرتے کہ ہم غیر مسلموں کے بھی دل بھر آتے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں۔ اسی ماریہ کا کہنا ہے کہ ہم نے خبیب سے اس گریہ کا سبب پوچھتے ہوئے کہا کیا تمہارے دل میں کوئی تمنا ہے جو اس طرح بیقرار کرتی ہے؟

"ہاں ——— صرف ایک تمنا! ——— خبیب نے جواب دیا"۔

وہ کیا ہے آخر ——— "اگر میں پوری کر سکتی ہوں تو ضرور کروں گی"۔ ماریہ نے تجسس اور تاثر بھرے انداز میں کہا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ خبیب رض کے چہرے پر ایک مقدس ترین جذبہ کی رنگینی بکھر گئی۔

"وہ تمنا نہ پوچھو" خبیب رض نے کہا۔ "لیکن اس کی تکمیل میں میری مدد اس طرح کر سکتی ہو کہ جس وقت مجھے قتل کیا جانے والا ہو پہلے سے بتا دینا۔"

اور ——— جس دن انھیں بتایا گیا کہ آج تمہاری جان لی جائے گی تو انھوں نے اپنی آخری تمنا یعنی دو رکعت نماز ادا کرنے کی تیاری میں پاکی اور صفائی کا اہتمام شروع کر دیا۔ وہ پورے اہتمام شوق کے ساتھ یہ دو رکعت نماز ——— زندگی کی آخری نماز پڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن ماریہ کے اختیار میں صرف اتنا ہی تھا کہ وہ خبیب رض کو اس نماز کی تیاری کا موقع دیدے۔ اس کے بعد وہ اپنے قاتلین کے بس میں تھے۔ لیکن یہاں بھی ان سے ان کی آخری تمنا کو پوچھا گیا اور انھوں نے کہا ——— دو رکعت نماز! اور بس!!"

اور جب وہ دو رکعت نماز پڑھ کر تختہ دار پر آئے جہاں نیزوں کی انیاں ان کے جسم میں گھس جانے کے لئے تیار تھیں تو دیکھنے والوں کو یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ خبیب رض کے چہرے پر اس پر ہول قتل کے خوف کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نظر نہیں آئی۔ وہاں تو کسی سے ملاقات کی پر شوق تیاری پر اسرار جذبات کی قوسیں قزح پھیلا رہی تھی۔

"تم اس وقت موت کے کنارے سے زندگی کی طرف پلٹائے جا سکتے ہو" ——— کسی نے کہا ——— اس کے لئے تمہیں صرف ایک کام کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ اسلام کو چھوڑ دو۔ بولو! کیا جان پر ایمان قربان کر کے نئی زندگی چاہتے ہو کہ نہیں؟

نئی زندگی، عیش وعشرت کی زندگی؟"

" نادانو!" خبیبؓ نے موت کی آنکھوں میں ڈالتی ہوئی جسارت اور جوش کے عالم میں کہا " تم جس چیز کو زندگی کہہ رہے ہو وہی میری نظر میں موت اور بدترین موت ہے اور میں جسے زندگی نئی، حقیقی اور دائمی زندگی سمجھ رہا ہوں وہی تمہاری نظر میں بیچارگی کی ماری ہوئی موت ہے۔ سن لو! کہ اس دنیا کی زندگی تو کیا ساری دنیا دیکر بھی تم مجھ سے میرا ایمان نہیں لے سکتے"۔

ایمان کا ایک نہتا سپاہی قربانی اور شہادت کے محاذ پر یہ کس طرح جان دینے آپہنچا تھا کہ دیکھنے والے مسلح طاقتور لوگ بھی اندر ہی اندر اس کی عظمت کو محسوس کرنے پر مجبور تھے مجبور تھے کہ اس کے سامنے طاقتور ہوتے ہوئے بھی اس سے کمزور خود کو محسوس کریں ایک شخص آگے بڑھا۔ یہ ابوسفیان تھے جن پر اس وقت کفر کا آخری درجہ کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ انھوں نے ایمان کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے خبیبؓ سے کہا:-

" سچ بتاؤ کیا اس وقت تمہیں محمدؐ کا ہونے پر ذرا سا بھی افسوس نہیں ؟ کیا تمہیں ذرا بھی یہ خیال نہیں آرہا کہ تم اس وقت خود محمدؐ کی طرح بیوی بچوں کے درمیان ہوتے اور محمدؐ تمہاری جگہ یہاں تمہاری طرح ہمارے نیزوں کی زد میں ہوتے ؟"۔

" نہیں ہرگز نہیں !! " خبیبؓ نے ایمان کی گرجدار آواز میں اعلان کیا اور پھر عشقِ رسولؐ کی سرمدی کیفیت میں کہنا شروع کیا " خدا کی قسم! ان کا مقدس جسم تو بہت بڑی چیز ہے۔ ارے ظالمو ہم میں تو اتنا سرچنے کی بھی تاب نہیں کہ ہم آرام سے بیٹھے ہوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہیں پیروں میں کانٹا چبھ جائے"۔

اہلِ کفر پر اس جواب نے سکتہ سا طاری کر دیا —— وہ ایک مومن کی صورت میں ایمان اور اس کی لامتناہی طاقت کی ایک جھلک دیکھ کر حیران تھے کہ کیا واقعی ایک مومن میں ساری غیر مومن دنیا سے بھی زیادہ طاقت ہوتی ہے ! وہ حیران تھے کہ آخر وہ کیا شئے ہے جو زندگی کی طرح نہیں، بلکہ زندگی سے بھی زیادہ موت کو ایک مومن کی نظر میں پرکشش بنا کر رکھ دیتی ہے نیزوں کے وار ہوئے انتقام کی آگ میں دہکتا ہوا آہن و فولاد مؤمن کے گوشت میں داخل ہوا تو جسم سے ابلتے ہوئے خون کے ساتھ ہونٹوں پر ایسی مؤمنانہ ہنسی کھیلنے لگی جیسے کہنے والا کہہ رہا ہو " ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا"۔

کبھی ایمان کا حال یہ تھا کہ مومن سر کٹاتے ہوئے بھی سر جھکانے کے لئے تڑپتے تھے۔ اور یہ نماز سکھلانے والی ہستیؐ ان کی نظروں میں ایسی عزیز و قیمتی تھی کہ خود تلوار کی دھار پر سر رکھنا گوارا کر لینا مگر یہ نہیں کہ اس ہستی کی کفِ پا کو بھی ذرا تکلیف پہنچے۔ لیکن آج ایمان کا یہ کیا حال ہے میرے معبود! کہ اسی ایمان کے کتنے ہی مدعی اس نماز کو قتل کئے ڈالتے ہیں کہ جو اس مقدس ترین محسن ترین ہستی کی نظر میں " ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک" تھی ؛ وہ مؤمن تو نبیؐ کے پاؤں کے بھی گھائل ہونے کا تصور با نے لئے سوہانِ روح سمجھتے تھے۔ مگر یہ " مؤمن" جنھوں نے غفلت میں نہیں جاگتے ہوئے نمازوں کا خون کر دیا۔ اپنے نبی کی آنکھوں میں کانٹے چبھو رہے ہیں ؟ سوچئے! کیا دونوں مسلمان ہیں ؟ ——

اور وہ ہستیؐ جس کی نظروں نے ایمان و یقین کی مقناطیسی طاقت سے خبیبؓ اور خبابؓ جیسے سیکڑوں ہزاروں انسانوں کو صدیوں کے باطل عقیدوں سے چھین کر حق و صداقت سے لبریز دینِ فطرت کی طرف کھینچ لیا تھا۔ خود ان کی راہ میں جب قدم قدم پر کانٹے بچھائے جا رہے تھے۔ جب خدا کے گھر کعبہ میں بھی خدا کی بے رنگی کی آواز لگانے والا بتوں کی پوجا کرنے والے انسانوں سے محفوظ نہ تھا اور اصل خدا کے آگے سجدہ ریز ہونے کے " جرم" میں جس کا گلا گھونٹ ڈالنے کی ظالمانہ حرکتیں کی جا رہی تھیں ان کو بھی تو اسی مکہ نے کبھی دنیا کی

بڑی سے بڑی بولی بول کر خریدنے کا زور لگایا تھا۔ کہا گیا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کے سر پر عرب کی بادشاہت کا تاج رکھ سکتے ہیں اور وہ سرکش قبائل جن کی گھٹی میں سرکشی اور بغاوت پڑی ہوئی تھی۔ ہاں وہ بھی آپ کی شخصیت کے محور پر غلامانہ والہانہ اطاعت کے ساتھ رقص کرنے کو تیار ہیں ـــــــ اور اگر آپ چاہیں تو عرب کا بچہ بچہ عرب کی ساری دولت سمیٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال کر خوش ہو سکتا ہے کہ یہ قدم اس کی نظر میں سچ مچ سونے چاندی کے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اور اگر آپ چاہیں تو ریگستان کی سب سے زیادہ دلربا حسینہ کو آپ جیسی ہستی کی کنیز بنا کر نذر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان تمام عقیدت کیشیوں کے صلہ میں آپ اسلام کی آواز لگانا چھوڑ دیں ـــــــ اور دنیا کی ان تمام للچائی ہوئی پیشکشوں کے جواب میں اس ہستی نے اس اعلان سے عرب کی فضاؤں میں زلزلہ سا دوڑا دیا تھا کہ "دنیا اور زمین کی ساری دولت دیکر مجھ سے میری جو چیز خریدنا چاہتے ہو اسے تو تم آسمانوں کی دولت فانی کے بدلہ میں بھی نہیں خرید سکتے خدا کی قسم! اگر تم آسمانوں کا سورج توڑ کر میرے داہنے ہاتھ میں رکھ دو اور چاند کو توڑ کر میرے بائیں ہاتھ میں رکھ دو تب بھی یہ ممکن نہیں کہ سچائی کی یہ آواز خاموش ہو جائے ـــــــ اس کے صرف دو انجام ہو سکتے ہیں، تیسرا کوئی نہیں ـــــــ یا تو یہ حق کی آواز فاتحانہ کامیابی سے ہمکنار ہوگی یا پھر اس حق کی راہ میں میرے خون حیات کا آخری قطرہ بھی قربان ہو جائے گا ـــــــ

کیسا عجیب و غریب تھا یہ بلا کشانِ راہِ حق کا قافلہ بھی اور میر کارواں بھی!۔

جنگلی طاقت سے جھومتے ہوئے انسانی درندوں کو پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ ظلم و ستم اور قہرمانیت کے بھیانک حملوں میں سچائی کا مقدس جنوں سیاہ گھٹاؤں میں برقِ تپاں بنا ہوا تھا ـــــــ اس ایمان و یقین کی بجلی کی لہریں ان سیاہ گھٹاؤں کا سینہ چیرتی ہوئی چاروں طرف بل کھا رہی تھیں ـــــــ یہ گھٹائیں گرج رہی تھیں مگر اس بجلی کی چمک کو بجھا دینا اس کے بس میں نہ تھا۔ ـــــ

اور راہِ حق کے ان جاں نثاروں میں بظاہر وہ لوگ نظر آ رہے تھے جن کے پاس مادّی طاقت کا ایک ذرّہ بھی تو نہ تھا۔ ان میں سماج کے کچلے ہوئے غلام تھے ـــــ پسے ہوئے پامال غلام تھے ـــــــ بے سر و سامانی سے کراہتی ہوئی کنیزیں تھیں۔ ان میں سمیّہ تھیں جن پر ابوجہل جیسا درندہ مسلّط تھا۔ مگر یہ درندہ اس بوڑھی ماں کو ایمان سے منحرف کرنے میں ذلیل ترین ناکامی سے دوچار تھا۔ اسلام کے یقین کے اس بوڑھے گوشت پر وہ ظلم و تشدد کے فولادی ہتھیاروں کی بوچھار کر چکا تھا۔ آتش بار ریگستان کی دھوپ کی بھٹی میں ڈال کر انھیں مسلسل بھوک پیاس کے شعلوں پر گھسیٹا جا رہا تھا ـــــــ لیکن جب بربریت کے ان تمام حملوں سے چور چور یہ زندگی مادّی طور پر وہاں تک پہنچا دی گئی جہاں ہوش و حواس ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ ہاں اس وقت بھی ابوجہل نے آسمان کی طرف اشارہ کرکے اپنا یہ سوال اسے سمجھانا چاہا کہ کیا اب بھی وہ آسمان کے واحد مالک اللہ پر ہی ایمان رکھتی ہے، تو اچانک اس کے خونِ حیات کا ایک ایک قطرہ تڑپ کر اس کے ہونٹوں پر لرزتے ہوئے یہ آخری الفاظ بن کر گونج اٹھا کہ "ہاں خدا کی قسم! میں اس ایک اللہ ہی کی بندگی پر قائم ہوں"۔۔۔۔۔ ایک زہر آلود خنجر کی بجلی سی فضا میں لہرائی اور سمیّہ بوڑھی کنیز نے اسلام کی تاریخ میں اللہ پر جان دینے والوں میں سب سے پہلے اپنا نام خون کے الفاظ میں تحریر کر دیا۔

خباب بن ارت بھی غلاموں کے پامال ترین طبقہ کے ایک فرد تھے۔ مگر ان کے سینہ میں محمدؐ کی نظروں نے نجانے کونسی مقدس آگ لگا دی تھی کہ آگ کے سرخ شعلے بھی اس اندرونی تپش سے ٹکرا کر راکھ ہو گئے انھیں ننگا کر کے سچ مچ انگاروں پر لٹا دیا گیا اور سینے پر

جھلسا دینے والا ایک بھاری پتھر رکھ کر کہا گیا کہ اسلام سے باز آجاؤ تو دنیا کے عیش و آرام کے خزانے تمہیں لٹا دیئے جائیں گے۔ لیکن ان شعلوں پر ان کے جسم کی پگھلتی ہوئی چربی نے ٹپک ٹپک کر آگ کو سیاہ راکھ میں تبدیل کر دیا اور آگ ان کے ایمانی جنون کو راکھ نہ کر سکی۔

ہاں اسلام کی تاریخ ایسے بلاکشان راہ حق کے ایسے ناموں سے آراستہ ہے۔ یہ نام تاریخ کی سیاہ رات میں رنگ و نور کے میناروں کی طرح آج بھی جگمگا رہے ہیں اور دنیا کو یقین دلا رہے ہیں کہ جس اسلام کو اس کے دشمن جھٹلا رہے تھے وہ حقیقت میں اگر سچائی نہ ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ آنکھوں دیکھی لٹتی ہوئی دیکھ کر یہ لوگ اس اسلام پر قائم رہ سکتے؟——

لیکن ایک طرف مومن تھے جن کے ایمان پر ظلم و ستم کی آخری برق پاشیاں ہونے کے بعد بھی انھیں ایمان کی راہ سے ہٹایا نہ جا سکا تو دوسری طرف ہم لوگ ہیں جو سکون و عافیت کے مسکنوں میں بیٹھ کر ایمان کی راہ سے میلوں دور نکل چکے ہیں۔ دونوں ہی ایک ایمان کے مدعی ہیں لیکن آج اسی زمین کی انسانیت کی نظر دونوں میں آکاش پاتال سے بھی زیادہ بڑا فرق موجود ہے تو کیسے ممکن ہے کہ کل جب ان حشر میں خدا اور اس کے فرشتے ان دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیں گے۔ جن لوگوں کو دیکھ کر آج اہل کفر بھی ہنستے ہیں کہ کیا یہ لوگ مسلمان ہیں، وہ آخر اس دھوکے سے کب نجات پائیں گے کہ کل خدا ان کو وہی اپنا بندۂ مومن تسلیم کر لیگا؟

ہر حال میں سچ بولئے، خواہ سچ بول کر آپ کے اپنے کسی مفاد کو ٹھیس پہونچتی ہو۔

خدائی فیصلوں پر تشکیک

سوال ۱: — از وصی محمد اقبال۔ کولوٹولہ شوکت علی روڈ کلکتہ

ایک الجھن درپیش ہے، آپ سے استدعا ہے کہ اسکو حل فرما کر شکریہ کا موقعہ دیں۔

زید نماز نہیں پڑھتا، روزے نہیں رکھتا، غریبوں کی اور مسکینوں کی امداد نہیں کرتا، جھوٹ بولتا ہے غیبت کرنے کا عادی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ شرابی اور رشوت خور بھی ہے۔ اس کے برعکس موہن کبھی جھوٹ نہیں بولتا کسی کی غیبت نہیں کرتا۔ کسی کا تمسخر نہیں اڑاتا۔ شراب اور رشوت کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ غریبوں کی مدد کرتا رہتا ہے۔ مساجد وغیرہ کی تعمیر میں دل کھول کر حصہ لیتا ہے۔

ظاہر ہے ان دونوں میں موہن کا کردار قابل تعریف ہے، لیکن انجام کار زید جنت کا مستحق قرار پاتا ہے اور موہن کو دائمی طور پر دوزخ میں ڈال دیا جاتا ہے — میری عقل اسے انصاف نہیں سمجھتی۔ امید ہے کہ آپ علم و عقل کی روشنی میں میری الجھن کو رفع فرمائیں۔

الجواب ۱: —

مریض اور مُردے کے درمیان جو نمایاں فرق موجود ہے۔ غالبًا اس فرق کو آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ اگر آپ نے اس فرق کو محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی تو اسے تجاہل اور تغافل کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر آپ اس کھلے فرق کو محسوس کرتے ہیں تو پھر مذکورہ معاملہ میں اس درجہ تحیّر اور تعجب کیا معنی رکھتا ہے۔

جو شخص ظلمت اور معدوم کی حقیقت سے واقفیت رکھتا ہو اس کو یہ بات قطعًا زیب نہیں دیتی کہ وہ کفر و ایمان اور عدم ایمان کے واضح فرق کو محسوس نہ کر سکے۔

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کھلے فرق کو پس انداز کرنے پر تل جائے بلکہ وہ اس مکافات اور پاداش کو منافی انصاف کہنے کی جسارت کر بیٹھے جو پروردگار کی طرف سے مومنین اور کافرین کو بخشی جانے والی ہیں جنھیں

مبنی براخلاص سمجھنا ایمان و اطاعت کا جز اور جنھیں مبنی براخلاص تصور نہ کرنا اعلیٰ درجہ کی ڈھٹائی اور باغیانہ قسم کا جرم ہے۔

اگر آپ اپنی عقل کو زحمت دینا گوارہ کریں گے تو اس حقیقت تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ زید اور موہن کے درمیان بالکل وہی فرق موجود ہے جو کسی مریض اور مردے کے درمیان ہوا کرتا ہے۔

یہ بات یاد رکھئے کہ جس طرح انسان کا جسم قسم قسم کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح انسان کی روح بھی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جس طرح انسان کے جسم پر موت طاری ہوتی ہے اسی طرح اس کی روح پر بھی موت طاری ہو جایا کرتی ہے۔ انسان کا جسم بالعموم اور بالخصوص جن بیماریوں کا شکار ہوتا ہے وہ ان گنت اور بے شمار ہیں۔ ان کی کوئی تعداد نہیں۔ بخار، چیچک، کینسر، برص، جذام وغیرہ وغیرہ۔

انسان کی روح بھی مختلف النوع امراض کا شکار ہوتی رہتی ہے اور یہ امراض بھی جسمانی بیماریوں کی طرح لاتعداد ہیں۔ انھیں بھی اکائیوں اور دہائیوں میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔

ترکِ صلوٰۃ، جھوٹ، غیبت، رشوت خوری، زنا، صلہ رحمی سے گریز، شراب نوشی، ظلم و استبداد وغیرہ سبھی مہلک قسم کے امراض ہیں اور یہ درجہ بدرجہ دردِ سر، بخار، دق، برص اور جذام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عاصی اور گناہگار مسلمانوں کی مثال ان اجسام کی سی ہے جو بھانت بھانت کے امراض میں مبتلا ہوں اور کفار و مشرکین کی مثال قطعاً ان اجسام کی سی ہے جو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے بے جان لاش میں تبدیل ہو گئے ہوں۔

زید کی بد اعمالیاں بلا شبہ قابل مواخذہ ہیں لیکن چونکہ اس کے قلب میں ایمان کی روشنی موجود ہے لہٰذا اسے صرف مریض سمجھا جائے گا۔ اور چونکہ موہن کا دل ایمان کی روشنی سے قطعی طور پر محروم ہے لہٰذا اس کے مزاج کی بہت سی خوبیوں اور اچھائیوں کے باوجود) اسے ایسی میت تصور کیا جائے گا جو دیکھنے میں حسین و جمیل بھی ہو اور بظاہر صحت مند بھی۔

اتنی بات تو آپ بھی یقیناً جانتے ہوں گے کہ بعض افعال و اعمال ازراہ عادت سرزد ہوا کرتے ہیں ازراہِ عبادت نہیں اور اس حقیقت سے بھی آپ ناواقف نہیں ہوں گے کہ جن افعال و اعمال کا صدور بربنائے عادت ہو انھیں اطاعت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ اطاعت کے مشابہ کیوں نہ ہوں۔ اگر ان افعال پر بھی اطاعت کا اطلاق ہوا کرتا جو محض عادتاً صادر ہو جاتے ہیں تو پھر یہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ جیسی نیت ہو گی ایسا ہی اجر مرتب ہو گا۔ اعمال دیکھنے میں کتنے ہی اچھے ہوں، اگر نیت بری ہے تو ان پر کسی قسم کی جزا ملنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ معیار چونکہ نیت ہے عمل نہیں، لہٰذا یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ اجر و ثواب کا ترتب عبادات پر ہو گا نہ کہ عادات پر۔

موہن کی عملی اچھائیاں اور خوبیاں چونکہ عادت سے متعلق ہیں لہٰذا ان پر اجر و ثواب کے مرتب ہونے کی ایک فیصد بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔

موہن اگر خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے برائیوں سے گریزاں اور اچھائیوں کی طرف راغب ہوتا تو اسے ایمان قبول کر لینے میں ایک منٹ کے لئے بھی تامل نہیں ہو سکتا تھا اس کا ایمان قبول نہ کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسے خدا کی رضا مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ خواہ مخواہ نیکیاں کرتا ہے اور خواہ مخواہ یعنی بے مقصد اور بے سوچے سمجھے کی گئی نیکیاں میزان آخرت میں اپنا کوئی وزن نہیں رکھتیں۔

زید کی بدکاریاں معیوب اور قابل مذمت سہی لیکن چونکہ وہ خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قائل ہے لہٰذا وہ جب کوئی نیکی کرے گا، محض خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے کرے گا۔ وہ نیکی خواہ کسی بھی درجہ اور کسی بھی حیثیت کی ہو اسے مقبولیت کا شرف حاصل ہو سکتا ہے اور اس پر اجر و ثواب کا ترتب عین ممکن ہے۔

اگر زید زندگی بھر بھی کوئی نیکی نہ کرے تب بھی اس کی بخشش کی امید کی جا سکتی ہے اس لئے ایمان کی دولت اسے بہرحال حاصل ہے اور یہ دولت ان اچھے اعمال و افعال سے لاکھ درجہ بہتر ہے جو فقط عادتاً کئے جاتے ہیں خدا کی رضا حاصل کرنے کی غرض سے نہیں۔

آپ نے کس قدر لاپرواہی کے ساتھ خدا کے بنائے ہوئے آئین اور جزا و سزا کے نظام کو منافیٔ انصاف قرار دیدیا ہے۔ آپ نے یہ تک سوچنا گوارہ نہیں کیا کہ آپ کی زبان سے نکلا ہوا یہ چھوٹا سا فقرہ خسارے اور بربادی کا موجب بن سکتا ہے۔ اس قسم کی سطحی باتوں سے بسا اوقات ایمان کی دولت چھین لی جاتی ہے اور ایمان کی دولت چھن جانے سے بڑا نقصان اور خسارہ کیا ہو سکتا ہے۔

ایک مثال سے بات سمجھئے۔ یہ مثال اس موضوع پر جامع اور مانع تو نہیں کہلائی جا سکتی لیکن پھر بھی کسی قدر مفید ضرور ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ سمجھئے کہ آپ کی دو بیویاں ہیں ایک قطعاً نافرمان ہے۔ آپ کا کہنا بہت کمی کے ساتھ مانتی ہے۔ کبھی آپکی کوئی خدمت نہیں کرتی۔ آپ کے اقارب و احباب سے بھی اسے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اکثر معاملات میں اسکی غیر ذمہ داریاں اور لاپرواہیاں حد سے بڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن اسے آپ سے والہانہ محبت ہے اس کے دل میں آپ کے تعلق اور احترام کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ اس کے دل میں لمحہ بھر کے لئے بھی کسی دوسرے مرد کا تصور نہیں آیا تا۔ وہ صرف آپ کو اپنا مجازی خدا اور محبوب سمجھتی ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ آپکے ماسوا دنیا میں کوئی مرد ایسا نہیں ہے جسے مجازی خدا اور محبوب کا مقام دیدیا جائے۔

دوسری بیوی نسبتاً نرم خو ہے۔ وہ آپ کے رشتہ داروں کے ساتھ ہمدردی اور حسن سلوک کا مظاہرہ بھی کرتی رہتی ہے بعض افعال و اعمال خواہ مخواہ بھی اسکی ذات سے ایسے سرزد ہوتے رہتے ہیں جو آپ کو بہت پسند اور مرغوب ہیں لیکن وہ دل کی گہرائی سے آپ کو اپنا مجازی خدا اور محبوب تسلیم نہیں کرتی بلکہ انتہا یہ ہے کہ وہ دوسرے مردوں کو بھی اس قابل سمجھتی ہے کہ انھیں مجازی خدا اور محبوب کا مقام دیدیا جائے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً وہ دوسرے مردوں کے دروازے کھٹکھٹاتی رہتی ہے اور ان کے ساتھ وہ سب کچھ کر گذرتی جو اسے صرف آپ کے ساتھ ہی کرنا چاہئے تھا۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ان دونوں بیویوں میں سے کونسی بیوی اس لائق ہے کہ آپ اسے دل کی گہرائی سے پیار کریں اور پرخلوص محبت اور ہمدردیوں سے نوازیں۔

ہمارا گمان ہے بلکہ یقین ہے کہ آپ اسی بیوی کو ترجیح دیں گے جو نافرمان اور لاپرواہ سہی لیکن ہے صرف آپ کی پرستار۔

آپ کی نافرمانی اور مسلسل نافرمانیوں سے شاید آپ کی کوئی توہین نہیں ہوتی لیکن اس بات سے آپ کی توہین اور تذلیل ضرور ہو گی کہ آپ کی شریک حیات دوسرے مردوں سے دلچسپی لے۔ انھیں غلط انداز نظروں سے دیکھے۔

آپ کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے مرد کی طرف مائل ہونا کسی نہ کسی حد تک یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ کامل مرد نہیں ہیں اور آپکی رجولیت اور مردانگی میں کسی نہ کسی قسم کی کوئی خرابی اور نقص موجود ہے۔ اگر آپ کامل مرد ہوتے تو قطعاً اس بات کی نوبت نہ آتی کہ آپ کی شریک حیات دوسرے مردوں کو غلط اور طمع آمیز آنکھوں سے دیکھے ۔۔ اس کا دوسرے مردوں میں دلچسپی لینا انھیں خاص نظروں سے دیکھنا آپ کی زبردست توہین ہے اور یقینی بات ہے کہ آپ ایسی بیوی سے نہ دلی محبت کر سکتے ہیں اور نہ اس کی ان نازیبا حرکات کو معاف کر سکتے ہیں۔

اب ذرا سوچئے کہ جو شخص ربِّ کامل کے ہوتے ہوئے دوسری چوکھٹوں پر سر جھکاتا پھرتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو اپنا معبود سمجھتا ہے۔ کیا وہ رب کامل کی توہین کا مرتکب نہیں ہوتا؟ کیا ایسا شخص اپنی نادانیوں سے یہ ثابت نہیں کرتا کہ خداوندِ قدوس کی ربوبیت میں کمال موجود نہیں ہے

اس میں نقص اور کمی موجود ہے۔ اسی لئے وہ دوسرے حضرات کو اپنا الٰہ تصور کرتا ہے اور ان کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے۔

بتلائیے کہ ایسا شخص اس قابل ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ اور کیا یہ شخص اس شخص سے اچھا ہو سکتا ہے جو گناہوں میں بھی غرق ہے لیکن جس کا سر ہوش اور بیہوشی کے عالم میں کبھی غیر اللہ کے سامنے جھکنے پر آمادہ نہیں ہو سکا۔

اگر اس گفتگو سے بھی بات سمجھ میں نہ آئے تو یہ مت بھولئے گا کہ ہماری عقلیں محدود ہیں۔ ہماری عقلیں خدا کے بنائے ہوئے ہر آئین اور نظام کا احاطہ نہیں کر سکتیں ضروری نہیں ہے کہ جو بات ہمارے پلّے نہ پڑے وہ بہر اعتبار مہمل ہی ہو۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ بات ذو معنیٰ ہوتی ہے لیکن یہ بات جس کے سامنے لائی جا رہی ہو اس کی عقل مہمل اور ناقص ہوتی ہے اس لئے وہ اس بات کو سمجھ نہیں پاتے۔ ایسے شخص کا اپنی عقل کے طول و عرض سے لاپرواہی اختیار کر کے یہ کہنا کہ یہ بات زینِ فہم نہیں ہے۔ حماقت کے سوا کیا کہلائے گا۔

دلائل و نظائر کے بغیر یہ یقین کر لیجئے کہ خدا کا بنایا ہوا ہر قانون اور ہر نظام مبنی بر انصاف ہے۔ اگر خدائی قانون اور خدائی فیصلے ہماری عقل کی گرفت میں نہ آ رہے ہوں تو سمجھ لیجئے کہ ہماری عقل کا دائرہ تنگ ہے۔ ورنہ خدا کے بنائے ہوئے کسی آئین اور کسی فیصلے میں رائی برابر بھی نقص موجود نہیں ہے۔

امامت اور بیوی کی بے پردگی کا مسئلہ

سوال :۔

ہمارے قصبہ کی جامع مسجد میں جو امام ہیں انھیں محض برادری کے ناطے سے امام مقرر کیا ہے۔ ان کی بیوی صاحبہ ہمیشہ سے بالکل بے پردہ رہتی ہیں۔ ان کی امامت پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا۔ کہ چونکہ ان کی بیوی بے پردہ رہتی ہیں اس صورت میں امام صاحب شریعت اسلامی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یعنی ایک طرح سے پردہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ اپنی بیوی کی اس بے پردگی پر معترض بھی نہیں ہیں۔ کیا اس صورت میں ان کے پیچھے نماز جائز ہوگی۔ برائے مہربانی اس کا جواب تجلی ہی کی کسی قریبی اشاعت میں شائع کریں اور شکریہ کا موقع دیں۔

الجواب :۔

امام کا متقی اور پرہیزگار ہونا انتہائی ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نماز کے جملہ مسائل سے واقفیت رکھتا ہو اور کم از کم قرآن کی اتنی قرأت صحیح طور پر کر لیتا ہو جتنی قرأت نماز میں واجب اور ضروری قرار دی گئی ہے کسی شخص کو محض اس بنا پر امامت کا منصب عطا کر دینا کہ وہ اپنی برادری اور اپنی قوم کا آدمی ہے انتہائی غلط اور نامناسب طرزِ عمل ہے۔ البتہ اگر برادری کے کسی شخص کے اندر وہ جملہ اوصاف اور خصائص موجود ہوں جن کا وجود کسی بھی نوع کی امامت کا استحقاق عطا کر دیتا ہے تو ایسے شخص کو اپنا امام مقرر کر لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

قباحت اور مضائقہ صرف اس صورت میں ہے جب کسی کے اندر امام بننے کی اہلیت تو موجود نہ ہو لیکن محض قوم پرستی اور قرابت داری کی بنیاد پر اسے عہدۂ امامت بخش دیا جائے۔ قصبہ والوں نے امام کا انتخاب کرتے وقت اگر کسی شخص کو اس واسطے ترجیح دی ہے کہ وہ اہل اور باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ برادری کا ایک فرد ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر صرف برادری اور رشتہ داری ہی پیش نظر رہی ہے اور ان اوصاف اور صلاحیتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے جن کا متحقق ہونا ہر امام کے اندر ضروری ہے تو وہ بلاشبہ بھاری غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

آپ نے خط میں یہ کہیں تحریر نہیں کیا کہ امام صاحب بذاتِ خود کس قسم کے آدمی ہیں۔ ان کا حلیہ شرعی ہے یا غیر شرعی، وہ مذہب پرست ہیں یا مذہب بیزار۔

بیوی کے بے پردہ پھرنے کی وجہ سے یہ شور مچانا کہ امام صاحب شریعت اسلامی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہیں صرف منافی انصاف ہی نہیں بلکہ حماقت اور جہالت بھی ہے۔

آخر بیوی کے کسی جرم کی وجہ سے امام صاحب کو مجرم تصور کر لینا اور مجرم باور کرانا کس قسم کا انصاف اور کیسی ہوشمندی ہے۔؟

بیوی کا بے پردہ ہونا اور وہ بھی عام سڑکوں پر مٹر گشت کرنا واقعتاً ایک معیوب اور قابل مذمت فعل اور تعلیمات اسلامی سے صاف انحراف ہے لیکن چونکہ بے پردگی کا قصور بیوی سے سرزد ہوتا ہے لہٰذا سزا کی مستحق بیوی ہی قرار پانی چاہئے نہ کہ حضرت شوہر۔

بیوی کے کسی جرم اور خلاف شرعی فعل کی بنا پر شوہر کو قطعاً مجرم اور خاطی نہیں گردانا جا سکتا۔ شوہر کو مجرم اور خاطی گردانا تو اسی وقت درست ہوگا جب یہ بات پایۂ تحقیق اور پایۂ ثبوت تک پہونچ جائے کہ شوہر صاحب از خود اپنی بیوی کو غیر شرعی حرکتیں کرنے کی تاکید کرتے ہیں اور ان ہی کی تاکید اور اصرار کے پیش نظر بیوی نے غلط راہیں اختیار کی ہیں۔

آپ کی یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ امام صاحب اپنی بیوی کی بے پردگی پر معترض بھی نہیں ہیں۔ یہ آپ نے کیسے کہدیا۔ کیا آپ کے نزدیک اعتراض ہی قابلِ اعتبار ہوتا ہے جو چیخ چیخ کر کیا جائے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ دن کی خلوتوں اور رات کی تنہائیوں میں امام صاحب اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوں، بے پردگی سے احتراز کرنے کی تاکید کرتے ہوں لیکن بیوی ہی سرکش اور ہٹ دھرم واقع ہوئی ہو، وہ کسی طرح اپنی حرکات سے باز آنے کے لئے تیار نہ ہو۔

ہمارا خیال ہے کہ امام صاحب نے لازماً اپنی بیوی کو سمجھایا ہوگا۔ پردہ کی تاکید کی ہوگی۔ اس لئے کہ یہ عموم یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ شوہر مذہب پرست ہے اور بیوی رسم و رواج کی غلام، شوہر سادگی کا پابند ہے اور بیوی فیشن کی متوالی ہے۔ شوہر اسلامی طور طریق پر عمل پیرا ہے لیکن زوجۂ محترمہ مغربی تہذیب کے آکاش پر آخری اڑان اڑ رہی ہیں۔ یہ گھر گھر کی کہانی ہے۔ اس گھر کو جنت ہی سمجھئے جس گھر کی عورتوں نے سادگی اور اسلامی روایات کو اپنا رکھا ہو اور وہ مغربی تہذیب کے سیلاب میں بے جان تنکوں کی طرح نہ بہہ رہی ہوں۔

عین ممکن ہے کہ امام صاحب نے اپنی بیوی سے پردہ کرنے کی فرمائش بھی کی ہو اور تاکید بھی۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی بیوی سے خفا بھی ہوئے ہوں۔ دونوں کے درمیان جھڑپ اور تکرار کی نوبت بھی آئی ہو۔ لیکن جھگڑوں اور تلخیوں کے باوجود بیوی اپنی روش پر قائم رہی ہو اور اس نے اس بے پردگی سے باز رہنے کا تصور بھی نہ کیا ہو جو ان دونوں کے درمیان باعث نزاع اور وجہ فساد بنا ہوا تھا۔

اب آپ ہی بتائیے کہ اس صورت میں امام صاحب کی کیا غلطی ہو سکتی ہے۔ انھیں قصوروار ٹھیرانا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

اگر کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ امام صاحب نے ہی اپنی بیوی سے بے پردہ رہنے کی گذارشات کی تھیں یا اپنی بیوی کی بے پردگی پر انھیں ذرہ برابر تامل اور اعتراض نہیں تو بلاشبہ ان سے امامت کا عہدہ واپس لے لیجئے جہاں تک نماز ہونے کا مسئلہ ہے تو وہ تو بہرحال ان کے پیچھے صحیح ہو جاتی ہے اس لئے کہ وہ خود فسق و فجور کے مرتکب نہیں ہیں۔ امام اگر خود فاسق و فاجر ہو تو بلاشبہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی لیکن اگر اس کی آل اولاد فسق و فجور میں ملوث ہے تو اس سے امامت پر کوئی اثر واقع نہیں ہوتا خواہ امام اپنی بیوی بچوں کو فسق و فجور سے محترز رہنے کی تاکید کرتا ہو یا نہیں۔ البتہ چونکہ امام اور اس کے گھر والوں کا اس پوزیشن میں ہونا ضروری ہے کہ انھیں دیکھ کر عقیدت و انسیت پیدا ہو نفرت و وحشت نہیں۔ لہٰذا

جو امام خود کو اور اپنے اہل خانہ کو ظاہری طور پر بھی نماز مہذب پرست نہیں بنا سکتا۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ امامت جیسے مکرم اور قابل احترام منصب پر فائز رہے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ نماز تو امام صاحب کے پیچھے ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ اپنی بیوی کو غیر شرعی کاموں پر اکساتے ہیں یا بیوی کی غیر شرعی حرکتوں پر بالکل مطمئن ہیں کبھی اعتراض ہی نہیں کرتے تو انھیں پہلی فرصت میں مصلے سے ہٹا دیجئے اور اگر وہ بیوی کی بے پردگی وغیرہ سے خود نالاں ہیں اور وقتاً فوقتاً اسے تنبیہ بھی کرتے رہتے ہیں لیکن بیوی ہی ضدی اور سرکش واقع ہوئی ہے تو بیچارے امام صاحب کو معذور سمجھئے اور ان کے پیچھے بلا وہم و کراہت کے نماز ادا کرتے رہئے۔

فاسق کی اذان و اقامت

سوال ۳:- از شیخ شبیر شیخ عثمان اسلام پور

ہمارے یہاں ایک شخص سود پر پیسے دیتا تھا۔ یہاں پر ایک مولانا نے تقریر اور وعظ کیا کہ سود کھانا بند کر دو اب وہ شخص پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتا ہے اور اذان و اقامت بھی۔ اس سے پہلے وہ شخص زانی بھی تھا۔ سود کا لینا اس نے بند نہیں کیا۔ وہ میرے خیال سے سود لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کسی شخص کو ۲ ہزار روپے کچھ دنوں کی مہلت سے دیکر اور اس کا بدلہ تین ہزار روپے لے تو یہ سود نہیں ہوا کیا ایسا شخص اذان اور اقامت پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:-

آپ کے سوال کے اندر زبردست الجھاؤ اور پیچیدگی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ہمارے یہاں ایک شخص سود پر پیسہ دیتا تھا... اور اس سے پہلے وہ زانی بھی تھا۔

یہ لفظ "تھا" یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ شخص زمانہ ماضی میں سود خوار و بدکار تھا۔ اب ایسا نہیں ہے لیکن آپ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ سود لینا انھوں نے بند نہیں کیا وہ میرے خیال میں سود لیتے ہیں۔

اگر وہ واقعتاً اب بھی سود خوری میں مبتلا ہیں تو پھر یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ سود پر پیسے دیتے تھے آپ کو صاف یہ لکھنا چاہئے تھا کہ وہ سود پر پیسے دیتے ہیں ایک بات یاد رکھئے اگر کوئی شخص اپنی زبان سے سود خوری کا منکر ہو یا وہ یہ کہتا ہو کہ پہلے میں سود کا کاروبار کیا کرتا تھا اب تائب ہو چکا ہوں تو اس شخص کا یقین کیا جائے اور بغیر تحقیق و تجسس کے اسے سود خوار سمجھنے اور سود خوار کہنے سے احتراز کیا جائے۔ محض قیاس آرائیاں مناسب نہیں ہیں۔ بعض اوقات قیاس آرائی غلط فہمی اور بدگمانی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور غلط فہمی و بدگمانی اثم و عدوان کی فہرست میں شمار کی گئی ہیں۔ قرآن حکیم نے سوئے ظن کو فعل مذموم قرار دیا ہے۔

ممکن ہے کہ انھوں نے سود خوری سے حقیقتاً توبہ کر لی ہو۔ اور اب وہ اس بدترین کاروبار کے قریب بھی نہ پھٹکتے ہوں۔ اگر اتفاقاً ہمارا یہ امکان درست ہو تو پھر آپ کی قیاس آرائی بدگمانی اور الزام تراشی کے سوا کیا کہلائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ ان صاحب کے بارے میں مکمل تحقیق کیجئے کہ آیا وہ اب بھی سود کا کاروبار کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ صحیح تائب ہو چکے ہوں تو ان کے ماضی کو فراموش کر دیجئے اور انھیں ایک اچھا مسلمان گمان کیجئے۔ لیکن اگر وہ اب بھی سود خوری یا دوسرے کسی کبیرہ گناہ میں مبتلائے عام ہوں تو انھیں اذان و اقامت کی اجازت مت دیجئے۔ اس لئے کہ مؤذن کا خدا ترس، متدین اور پرہیزگار ہونا بے حد ضروری ہے۔ مؤذن اسے بنائیے جو نیک فطرت اور متشرع ہونے کے ساتھ ذمہ دار طبیعت کا مالک ہو جو ممنوعات سے اجتناب کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہو۔ اور جس کے اندر کوئی ایسی برائی نہ پائی جاتی ہو جسے

کبیرہ گناہ سے تعبیر کیا جاسکے۔

جو شخص سود خوری کا عادی ہو یا زنا جیسے قبیح اور مذموم فعل کا مرتکب رہا ہو وہ قطعی طور پر اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اسے مؤذن مقرر کیا جائے۔ ایسا شخص فاسق ہے اور فاسق کی اذان بالاتفاق مکروہ ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ چار ہزار روپے پر تین ہزار کا معاوضہ سود نہیں کہلاتا۔ ظاہر ہے کہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آدمی کسی چار ہزار روپے قرض دے اور واپسی اور ادائیگی کے وقت صرف تین ہزار روپے لینے پر اکتفا کرے۔

آپ کے تحریر کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ قرض چار ہزار دیئے تھے اور وصول کئے سات ہزار۔ چار ہزار اصل اور تین ہزار معاوضہ۔ اگر یہی مطلب ہے تو پھر بغیر کسی تامل کے یقین کر لیجئے کہ اسے ہی سود کہا جاتا ہے۔ سود خور کچھ پر سینگ نہیں ہوتے۔ ایک پیسہ پر دو پیسہ اور ایک روپیہ دیکر دو روپے وصول کرنا ہی بیاج اور سود خوری ہے۔

چار ہزار روپے پر تین ہزار کا معاوضہ وصول کرنے کو سود قرار نہ دینا تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص چوراہے پر کھڑا ہو کر یہ شور مچائے کہ زید کا ہندہ کے ساتھ حالت برہنگی میں لیٹنا اور میاں بیوی والی پرائیویٹ حرکت کرنا زنا اور حرام کاری نہیں ہے۔ کیا ایسا شخص دانشمند کہلانے کا حقدار ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا شخص احمق اور خبطی نہیں ہے؟ آپ اگر اس شخص کو احمق اور جاہل تصور کرتے ہیں تو پھر اس شخص کو بھی احمق اور جاہل گمان کیجئے۔ جو چار ہزار روپے قرض دیکر سات ہزار وصول کرنے کو سود نہیں سمجھتا۔

نماز جمعہ میں عورتوں کی شرکت

سوال[۲۴]: — از: سید عبدالعزیز صاحب۔

جمعہ کی نماز عورتوں پر فرض نہیں ہے مگر یہاں کی مسجد میں لکھنؤ سے ایک مولانا سید داؤد الحق صاحب خاص رمضان المبارک اور ماہ محرم میں نماز پڑھوانے اور وعظ کرنے آتے ہیں۔ کیا عورتیں مولانا کے پیچھے جمعہ کی نماز باجماعت ادا کر سکتی ہیں یا انھیں محض خطبہ سنکر اپنی نماز ظہر علیحدہ پڑھنی چاہئے۔

الجواب[۲۴]: —

غالباً آپ واقف ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عورتیں مسجد میں آکر نمازیں ادا کیا کرتی تھیں۔ گویا کہ مسجد کے دروازے عورتوں کے لئے بھی اسی طرح مفتوح رہا کرتے تھے جس طرح مردوں کے لئے مفتوح ہوا کرتے ہیں۔ مسجد میں عورتوں کی حاضری پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ عورتیں مسجد میں آنے اور جماعت سے نماز ادا کرنے کیلئے کلیۃً آزاد تھیں۔

لیکن اسی زمانہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ عورتوں کے لئے مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھیں اور گھر کے کھلے صحن میں نماز پڑھنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ کوٹھری کے کسی گوشہ میں نماز پڑھیں۔

مردوں کی نماز جس طرح مسجد میں صحیح ہو جاتی ہے اسی طرح گھر میں بلاشبہ صحیح ہو جاتی ہے۔ گھر میں ادا کی جانے والی نمازوں کی صحت پر ذرہ برابر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مرد کی وہ نماز نسبتاً افضل اور اعلیٰ قرار دی گئی ہے جو مسجد میں ادا کی جائے اور گھر میں ادا کی جانے والی نماز کو باعتبار ثواب ناقص قرار دیا گیا ہے اگرچہ اس کی ادائیگی اور اسکی صحت میں کوئی نقص موجود نہ ہو۔ رسول خدا کی تاکید تھی کہ نماز باجماعت ادا کی جائے۔ مسجد میں آکر ادا کی جائے [illegible] حکم اور تاکید سے روگردانی کرنے کے بعد جو نماز بغیر کسی عذر کے گھر میں ادا کی جائے گی وہ خواہ کتنا ہی

خشوع و خضوع اپنے اندر کیوں نہ رکھتی ہو اسے باعتبارِ ثواب ناقص ہی کہیں گے اگرچہ بظاہر اس میں کوئی نقص محسوس نہ ہوتا ہو۔ کوئی کمی موجود نہ ہو۔

اسی طرح عورتوں کی نماز مسجد میں بھی درست ہو جاتی ہے اور گھر میں بھی۔ صحت ادائیگی دونوں جگہ مسلم اور بے غبار لیکن عورتوں کی اس نماز کو افضل اور اعلیٰ تصور کیا گیا ہے جو گھر اور گھر کی کوٹھری میں ادا کی جائے۔

عورتیں جو نماز مسجد میں آکر ادا کریں گی اگرچہ اسے نادرست اور غیر صحیح کہنا قرین صواب نہیں ہوگا۔ لیکن اسے افضل اور ارفع قرار نہیں دیا ہے جو گھروں سے نکل کر مسجدوں میں ادا کی جائے۔

جو عمل رسول خدا کے نزدیک افضل نہیں ہے وہ خدا کے نزدیک کیسے افضل ہو سکتا ہے۔ اور جو فعل و عمل رسولِ خدا کے نزدیک غیر افضل ہے وہ خدا کے نزدیک بھی یقیناً غیر افضل ہی ہوگا۔

جو عورتیں مسجدوں میں آکر نمازیں ادا کرتی ہیں وہ غیر افضل کو افضل پر ترجیح دیتی ہیں۔ وہ اس فعل و عمل کی طرف مائل ہیں جس فعل و عمل کی آنحضورؐ نے اجازت تو ضرور دی ہے لیکن اسے پسند کبھی نہیں کیا۔ اور اس فعل و عمل سے دامن بچانا چاہتی ہیں جو فعل و عمل آنحضورؐ کے نزدیک جائز تو تھا ہی مرغوب اور محبوب بھی تھا۔

موجودہ زمانہ چونکہ بے شرمی اور آوارگی کا زمانہ ہے۔ جگہ جگہ ہی فتنوں اور عیاریوں کے چشمے اُبل رہے ہیں گھر گھر میں خرابیاں اور بدکاریاں داخل ہو چکی ہیں۔ ہر دل آوارہ اور ہر نظر فاسد ہو کر رہ گئی ہے۔ مرد اور عورت دونوں ہی ان روایات کا گلا گھونٹ چکے ہیں جو شرم و حیا سے شروع ہو کر پاک دامنی اور خدا ترسی پر جا کر ختم ہو جاتی تھیں لہٰذا اس زمانہ میں عورتوں اور مردوں کا اختلاط اور اجتماع کسی بھی صورت اور کسی بھی مقام پر درست نہیں معلوم ہوتا، خواہ وعظ و تبلیغ سننے کے لئے ہو خواہ مساجد اور خانقاہوں میں ہو۔

عورت فی نفسہ فتنہ نہیں ہوتی اور مرد بھی فی نفسہ بدکار نہیں ہوا کرتا۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم اور شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ جب عورت مرد یکجا اور مجتمع ہو جاتے ہیں تو فتنے اور خرابیاں بالکل اسی طرح ابلنے لگتے ہیں جس طرح برسات کے زمانے میں حشرات الارض ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

آج ہر جگہ عورت اور مرد کی اجتماعیت عام ہے۔ بازاروں میں پارکوں میں ہوٹلوں میں یہاں وہاں ادھر اُدھر۔ لے دیکر ایک مسجد ہی ایسی جگہ ہے جہاں صرف مرد نظر آتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مساجد ابھی تک فتنوں اور خرابیوں کی غلاظت سے محفوظ ہیں۔ اگر مسجدوں میں بھی مرد اور عورت کا اختلاط عام ہو گیا تو پھر مسجدوں کے اندر بھی وہ سڑاند محسوس کی جانے لگے گی جو ان مقامات پر محسوس کی جا رہی ہے جہاں عورت اور مرد تذکیر و تانیث کے فرق سے بے نیاز ہو کر کاندھے سے کاندھا ملا کر اور سر سے سر جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جن گھروں میں پردہ کا وجود باقی نہیں رہا ہے وہاں کیسی کیسی برائیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اور جن شہروں میں عورت اور مرد کا اختلاط و انسلاک عام ہو چکا ہے وہاں جو جو خرابیاں پھیل رہی ہیں وہ کسی بھی صاحبِ نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوں گی۔

تجربات یہ ثابت کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کی اجتماعیت کے بعد حاصل جمع خرابیوں اور فتنوں کے ماسوا کچھ نہیں نکل پاتا۔

عورت اور مرد کی اجتماعیت کے مظاہرے اگر مسجدوں میں بھی ہونے لگے تو ہماری مسجدوں میں بھی وہ خرابیاں اور برائیاں پھیل جائیں گی جو ہوٹلوں، پارکوں اور نائٹ کلبوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

یہ صحابہ و صحابیات کا دور نہیں جن کی خواہشات اور فطری تحریکات پر خدا ترسی اور خوف آخرت غالب تھی۔ وہ مساجد میں کیا بازاروں میں بھی کبھی کسی نامحرم

کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کا گناہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے قلوب آئینوں کی طرح صاف تھے۔ ہمارے زمانے کے اکثر و بیشتر مسلمان خوفِ خدا اور خوفِ آخرت سے بیگانہ نظر آتے ہیں۔ ہمارے آئینۂ قلوب پر تو نفس پرستی کی زنگ چڑھی ہوئی ہے۔ ہمارے زمانے کے مرد اور عورتوں میں حیا اور خدا ترسی کا فقدان اتنا ظاہر و باہر ہے کہ اسے باور کرانے کے لئے قلم کو متحرک کرنے کی احتیاج محسوس نہیں ہوتی۔ اس زمانہ میں مرد اور عورت کے یکجا ہو کر نماز پڑھنا برائیوں کا بیج بونے کے مرادف ہوگا۔ اور جہاں برائیوں کے بیج بو دیئے جائیں وہاں برائیوں کے بڑے بڑے درخت اُگ آنے ہی میں کیا دیر لگ سکتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ جو لوگ موجودہ زمانہ میں عورتوں کو مسجد میں آکر نماز پڑھنے کی تاکید یا نصیحت کرتے ہیں وہ بدیرا اور وسیع النظر کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے اگر کسی طرح یہ تحقیق ہو جائے کہ ان کی نیت میں کسی قسم کا کوئی فساد نہیں ہے۔

اور اگر کسی طرح یہ واضح ہو جائے کہ ان کی نیت ہی خراب ہے، وہ مسجدوں میں فتنے پھیلا کر مسجدوں کا سکون برباد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر ایسے لوگ قطعاً اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی نصیحتوں پر کان دھرے جائیں۔ خواہ وہ کتنا ہی فصیح و بلیغ وعظ بیان کر لیتے ہوں۔

بہر حال نیت اچھی ہو یا بری۔ پاک۔ صاف ہو یا فاسد و کاسد، عورتوں کو موجودہ زمانے میں اس بات کی نصیحت کرنا کہ وہ مسجدوں میں آکر جمعہ یا عید کی نماز ادا کریں دانشمندی کی بات نہیں ہے مصلحت سے ہم آہنگ نہیں۔ دور اندیشی نہیں۔

ویسے یہ بات گوش گذار کر لیجئے کہ عورتوں کی نماز مرد کی اقتداء میں بلا شبہ صحیح ہو جاتی ہے بلکہ عورت کی نماز عورت کے پیچھے مکروہ قرار دی گئی ہے۔

عورتیں اگر گوناگوں مصلحتوں کو روند کر مسجد تک پہونچ ہی جائیں تو پھر خطبہ سُنکر واپس آجانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ جب مسجد میں بیٹھ کر خطبہ سننے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی پھر نماز پڑھنے ہی میں کیا تأمل ہو سکتا ہے، نماز بھی ادا کر لی جائے۔ مرد کے پیچھے اور مسجد میں جاکر با جماعت نماز ادا کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں البتہ مصلحت اور دور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ عورتیں مسجدوں میں آنے سے گریز کریں۔ اور گھروں سے باہر نکل کر ان مصلحتوں کا خون کرنے پر نہ اتر جائیں جن کا خون کرنے کے بعد خرابیوں اور بدکاریوں کی ولادت ناگزیر ہے۔

اسلام نے عورتوں پر جمعہ و عید کی نماز فرض قرار نہ دیکر ان کے لئے سہولت اور آسانی پیدا کی تھی اب عورتوں کا جمعہ اور عید وغیرہ میں شرکت کرنا اپنے اوپر خود مشکلات اور دشواریاں مسلط کرنے کے مصداق ہے۔ وعظ و تبلیغ کی محفلیں گھروں کے اندر بھی منعقد کی جا سکتی ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ مرد اور عورت میل جُل کر تقریریں سنیں۔

بہر حال ہمارے نزدیک عورتوں کا جمعہ وغیرہ میں شرکت کرنا مصلحت اور دانشمندی کے خلاف ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ عورتیں اپنے ہی گھروں میں نماز ادا کیا کریں۔ اسی میں امن و عافیت ہے۔ اسی میں خیر اور سلامتی ہے۔

نماز میں مقدار قرأت

سوال ۵:- از:- محمد ابوالقاسم (بہار)

گذارش ہے کہ آپ کا ارسال کردہ جواب موصول ہو گیا اور یہ بات منکشف ہوئی کہ سورۂ فاتحہ کے بعد آیت هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ملانے سے نماز ہو جائیگی اس لئے کہ اس پر بڑی آیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ تو کیا

چھوٹی سے چھوٹی آیت قراءۃ کرنے پر نماز ہو جاتی ہے؟ چھوٹی و بڑی آیت کی قراءۃ کی قید کے متعلق کیا مسئلہ ہے میں نے جہاں تک بزرگوں کی کتابیں پڑھی ہیں اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں قراءۃ سورۂ فاتحہ ضروری ہے۔ قراءۃ آیت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا ہے اور ایک بزرگ کی کتاب میں پڑھا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک کوئی آیت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، یہانتک کہ صرف آیت قراءۃ کرنے پر نماز ہو جاتی ہے لیکن امام اعظمؒ کے شاگرد رشید امام ابویوسفؒ اور امام بن محمدؒ ایک آیت جو کم از کم تین آیتوں کے برابر کی قید لگاتے ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ مسئلہ کیا ہے صحیح حدیث شریف کیا ہے۔ ائمہ کا قول آرا اس مسئلہ میں کیا ہے؟ امید ہے کہ آپ مفصل و مدلل جواب سے آگاہ فرمائیں گے۔ اگر مناسب سمجھیں تو تجلی کی اشاعت میں اس پر گفتگو فرمائیں تاکہ عوام مستفید ہوں اور آپ اجر عظیم کے مستحق ہوں۔ تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔

الجواب:-

اس سے پہلے بھی مقدار قرأت کے بارے میں آپ کا خط موصول ہوا تھا۔ اس کا مختصر سا جواب بھی دے دیا گیا تھا لیکن اندازہ یہ ہوا کہ اس جواب سے آپ کی تشفی نہیں ہوسکی اور آپ کو خط لکھنے کی ایک بار پھر زحمت اٹھانی پڑی۔

اس سلسلہ میں آپ کی پریشانی کم از کم میرے نزدیک قابل حیرت ہے۔ اس لئے کہ آپ ایک معمولی سے مسئلہ کو معمہ سمجھ بیٹھے ہیں اور خواہ مخواہ آپ نے اپنے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا ہے

مقدار قرأت کے بارے میں بلا شبہ ائمہ کے درمیان کچھ نہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اختلاف اس نوعیت کا نہیں ہے کہ اسے ہوّا بنا دیا جائے۔ اس بات پر تو سبھی حضرات متفق ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے بعد فرض کی پہلی دو رکعتوں میں اور سنت و نفل وغیرہ کی تمام رکعتوں میں دوسری سورت یا دوسری آیات کا پڑھنا ضروری ہے۔ یہ بات مختلف فیہ نہیں ہے۔ اختلاف مقدار قرأت میں پایا جاتا ہے کہ قرأت کی کتنی مقدار فرضیت اور وجوب کے لئے کافی ہوتی ہے۔

عوام کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ اس سلسلہ میں دوسرے ائمہ کی رائے کیا ہے اور قرأت کی کتنی مقدار ان کے نزدیک ضروری ہے۔ عوام کو تو صرف اس امام کے مسلک کی تحقیق کرنی چاہئے جن کی وہ تقلید کرتے ہوں ——— دوسرے ائمہ کا مسلک اور ان کے دلائل کیا ہیں انھیں اس سے کیا واسطہ اور کیا غرض۔

آپ چونکہ مسلکاً حنفی ہیں اس لئے آپ کے لئے تو بس اتنی معلومات حاصل کرلینا کافی ہے کہ مقدار قرأت کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا اصح قول کیا ہے اور مسئلہ کی بنیاد کس آیت یا کس روایت پر ہے۔ دوسرے ائمہ کے مسلک اور دلائل کی تحقیقات کرکے آپ کیوں اپنے ذہن کو الجھاتے ہیں۔

مقدار قرأت کے بارے میں امام اعظمؒ سے تین اقوال مروی ہیں:-

ایک قول تو ان کی طرف یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ فرض ایک آیت پڑھ لینے سے پورا ہو جائے گا اگرچہ وہ آیت چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔

دوسری روایت میں یہ فرماتے ہیں کہ اتنی بڑی آیت پڑھنے سے فرضیت ادا ہو جاتی ہے جس پر قرأت کا اطلاق ہوسکے اور جس کے پڑھنے والے کو قاری کہا جاسکے۔

تیسرا قول امام اعظمؒ سے یہ روایت کیا جاتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد فرض کی پہلی دو رکعات میں اور سنن و نوافل کی تمام رکعات میں کم سے کم قرآن کی چھوٹی تین آیات یا بڑی ایک آیت کا پڑھنا ضروری ہے۔ یہی قول اور یہی رائے صاحبین امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کی بھی ہے۔

چلئے اس سے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا کہ امام اعظمؒ اور
صاحبینؒ کے درمیان اس سلسلہ میں کسی قسم کا کوئی اختلاف
موجود نہیں ہے۔ امام اعظمؒ کا تیسرا قول صاحبین کے قول کے
مطابق ہے اور احناف اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ
احناف کا صحیح مسلک یہی ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد
کم سے کم چھوٹی چھوٹی تین آیتوں کی قرأت یا ایک بڑی
آیت کی قرأت ضروری ہے ورنہ نماز صحیح نہ ہوگی۔

رہا آپ کا یہ فرمانا کہ امام اعظمؒ کے نزدیک ــــ
مدھامتان پڑھ لینے سے نماز درست ہوجاتی ہے
ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ ہم نے اب تک یہی سنتے آئے
ہیں کہ بعض ائمہ کے نزدیک صرف مدھامتان پڑھ لینے
سے بھی نماز درست ہوجاتی ہے لیکن امام اعظمؒ کے نزدیک
درست نہیں ہوتی۔ وہ تو تین چھوٹی آیات یا ایک بڑی آیت
یا کم سے کم اتنی قرأت کو لازمی قرار دیتے ہیں کہ جس کے پڑھنے
والے کو قاری گمان کیا جاسکے۔ صرف "مدھامتان" کہدینے
والا قاری نہیں کہا جاسکتا لہٰذا ان کے نزدیک مدھامتان
پر اکتفا کرلینے سے نماز درست نہیں ہوسکتی۔

لیکن چلئے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ امام اعظمؒ کے نزدیک
بھی مدھامتان یا حٰم۔ عٓ۔ سٓ۔ قٓ کہدینے سے فرضیت
قرأت ادا ہوجاتی ہے تو اس میں باعث پریشانی اور قابل
تعجب کیا بات ہے۔

جن ائمہ نے یہ فرمایا ہے کہ مدھامتان جتنی قرأت سے
نماز درست ہوجاتی ہے انھوں نے اتنی قرأت کو بحالت
مجبوری اور بحالت عذر جائز قرار دیا ہے اور جہاں انھوں نے
اس درجہ مختصر قرأت کو جائز قرار دیا ہے وہاں یہ بھی
واضح فرمادیا ہے کہ اتنی قرأت نہ مسنون ہے اور نہ مستحسن۔

اگر کسی شخص کو سورۂ فاتحہ کے علاوہ کوئی اور
سورت یا آیت یاد نہ ہو تو اسے مجبور اور معذور تصور کیا جائیگا
اور اسے اس بات کی اجازت دینی پڑے گی کہ تم سورۂ فاتحہ
کے بعد مدھامتان کہہ لیا کرو۔ مدھامتان کے الفاظ تمہارے
لئے قرأت کے قائم مقام ہوجائیں گے اور تمہاری نماز
درست ہوجائے گی۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے وتروں میں دعائے قنوت
کا پڑھنا ضروری ہے لیکن جن لوگوں کو دعائے قنوت یاد
نہ ہو انھیں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ وتروں
کی تیسری رکعت میں دعائے قنوت کی بجائے تین بار قل ہو اللہ
پڑھ لیا کریں۔ ایسے لوگوں کو دعائے قنوت کی جگہ قل ہو اللہ
پڑھنے کی اجازت دیتے وقت یہ تاکید بھی کردی جاتی ہے
کہ وہ دعائے قنوت یاد کرنے کی کوشش کرتے رہیں اور جب
تک دعائے قنوت یاد نہ ہو اس وقت تک وتروں کی تیسری
رکعت میں رفع یدین کے بعد قل ہو اللہ پر اکتفا کریں۔

ظاہر ہے کہ وتروں میں دعائے قنوت کی بجائے قل
ہو اللہ کا پڑھنا ان ہی حضرات کے لئے جائز ہوگا جن کو
دعائے قنوت یاد نہ ہو، دعائے قنوت یاد ہونے کے باوجود
محض شوقیہ قل ہو اللہ پڑھ لینا جائز نہیں ہوسکتا۔ جن لوگوں
کو دعائے قنوت ازبر ہو لیکن اس کے باوجود وہ وتروں میں
سورۂ اخلاص یا ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ
حسنۃ وقنا عذاب النار یا تین بار اللّٰھم اغفرلی
کہنے پر اکتفا کرلیتے ہوں ان لوگوں کے وتروں میں بلاشبہ
کراہیت پیدا ہوجائے گی۔ اس لئے کہ وتروں میں مذکورہ
بالا سورۃ اور آیات وغیرہ کا پڑھنا اسی صورت میں جائز ہے
جب دعائے قنوت پڑھنے سے قاصر ہو۔ اگر دعائے قنوت
پڑھنے پر قادر ہے تو پھر دعائے قنوت ہی کا پڑھنا ضروری
ہے۔ دوسری چیزیں اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتیں۔

بس یہی حال مقدار قرأت کا بھی ہے۔ مدھامتان
اور اس جیسے چند حروف پڑھنے پر اکتفا کرلینا ان ہی حضرات
کے لئے جائز ہے جنھیں کہیں اور سے قرآن یاد نہ ہو۔ جنھیں
قرآن کی دوسری سورتیں یا دوسری بہت سی آیات بھی
حفظ ہوں ان کے لئے مدھامتان کہہ کر رکوع کردینا کسی
صورت جائز نہیں ہوسکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مدھامتان کہنے والے پر
قاری کا اطلاق نہیں ہوسکتا لیکن بحالت مجبوری اس پر

کتفی ہو جانے کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ کچھ بھی نہ پڑھنے سے بہرحال بہتر یہ ہے کہ کچھ پڑھ لیا جائے خواہ کچھ پڑھنا برائے نام ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن حکیم میں یہ ارشاد فرمایا گیا فاقرؤا ما تیسر من القرآن۔ یعنی قرآن میں سے جو کچھ آسانی کے ساتھ پڑھ سکو پڑھ لو۔ یہی آیت کریمہ ہمارے مسلک کی بنیاد ہے اسی آیت کو دلیل بنا کر ہم عرض کرتے ہیں کہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی آیت پڑھنے سے بھی وجوب قرأت ساقط ہو جاتا ہے اور نماز درست ہو جاتی ہے اور اسی آیت کے پیش نظر بعض ائمہ کے نزدیک قرآن حکیم کے چند حروف پر اکتفا کر لینا ہی نماز کے صحیح ہو جانے کے لئے کافی ہے اور قرآن کے چند حروف پر اکتفا کر کے رکوع کے لئے جھک جانا ہمارے نزدیک بھی جائز ہے لیکن عذر اور مجبوری کی حالت میں۔

عذر کسی قسم کا ہو سکتا ہے۔ قرآن کا یاد نہ ہونا بھی عذر ہی ہے۔ اور اسے بھی عذر ہی پر محمول کیا جائے گا کہ ایک شخص حافظ قرآن تو ہو لیکن کسی خاص مرض کی وجہ سے اس کی زبان حروف قرآن کی ادائیگی سے قاصر ہو۔ لہٰذا اس قسم کی صورتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھ کر مدھامتان کہتے ہی رکوع کر دیا جائے تو نماز درست ہو جائے گی۔ اور یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ نماز ناقص اور ناتمام رہی۔

آپ کا یہ تحریر فرمانا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا تو ضروری ہے لیکن ضم سورۃ ضروری نہیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں سکوت فرمایا ہے۔ انتہائی غلط بات ہے۔ اسے ناواقفیت اور کم علمی کے ماسوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

کیا آپ نے کبھی کسی کتاب میں یہ پڑھا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی ہو اور سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورت یا چند آیات پڑھے بغیر رکوع کر دیا ہو۔

ظاہر ہے کہ آپ کا جواب نفی میں ہوگا۔ اثبات میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز اس طرح پڑھائی ہو کہ سورۂ فاتحہ پڑھتے ہی رکوع کر دیا ہو اور ضم سورۃ کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو یا سورۃ پڑھنا آپ بھول گئے ہوں اور آپ نے سجدۂ سہو نہ کیا ہو۔

اگر بغیر سورۃ ملائے ہوئے نماز درست ہو جایا کرتی تو زندگی میں ایک بار تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضم سورۃ کے بغیر نماز ادا فرماتے۔ مشہور سی بات ہے کہ آپ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جو افعالِ حسنہ آپ کے معمولات میں داخل تھے کبھی کبھی بیان جواز کے لئے آپ انھیں ترک فرما دیا کرتے تھے تاکہ صحابہ کرام کو یہ علم ہو جائے کہ فلاں فعل اہم اور باعث ثواب ضرور ہے لیکن فرض اور ضروریت کی حیثیت نہیں رکھتا کہ اس کا ترک قابل ملامت اور موجب سزا ہو۔ بعض معمولات میں کبھی کبھی آپ کا ترک یہ ثابت کر دیا کرتا تھا کہ فلاں معمول مستحب اور مباح کی حیثیت رکھتا ہے واجب اور فرض کی نہیں۔

احادیث نبوی میں ان گنت ایسی مثالیں نظر سے گذری ہیں جن سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض خاص امور جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد مرغوب تھے اور جن پر مداومت اور مواظبت کے ساتھ آپ عمل پیرا رہا کرتے تھے انھیں کبھی آپ نے وقتاً فوقتاً ترک کر دیا تھا اور یہ ترک محض یہ واضح اور مترشح کرنے کے لئے ہوتا تھا کہ یہ امور انتہائی پسندیدہ سہی باعث اجر و ثواب سہی لیکن ہیں استحبابی درجہ کے ان کی حیثیت ہرگز ہرگز وہ نہیں جو فرض اور واجب کی حیثیت ہوتی ہے اور جن کا ترک عذر اور اضطراری صورتوں کے ماسوا جائز نہیں ہوا کرتا۔

جو افعال مندوب اور مستحسن نوع کے ہوتے ہیں ان کا اختیار کرنا بلاشبہ اجر و ثواب اور خوشنودیٔ پروردگار کا موجب ہو سکتا ہے لیکن ان کا ترک خواہ دانستہ ہو اور خواہ بغیر کسی عذر و مجبوری کے ہو گناہ اور جرم نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ ہی ان افعال کے ترک کرنے پر کسی قسم کی کوئی پوچھ تاچھ اور دار و گیر عمل میں آ سکتی ہے۔

مثال کے طور پر وضو میں تثلیث آپ کی مخصوص اور

نمایاں عادت تھی۔ آپ وضو کرتے وقت اعضاء تین تین مرتبہ دھویا کرتے تھے اور صحابۂ کرام کو بھی وقتاً فوقتاً آپ اعضاء کو تین تین بار دھونے کی تلقین فرماتے رہا کرتے تھے۔ لیکن بخاری وغیرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی کبھی بیان جواز کے لئے اعضاء کو ایک ایک بار دھونے پر بھی اکتفاء کیا ہے۔

اگر آپ ہمیشہ اعضاء کو تین تین بار دھویا کرتے تو صحابۂ کرام کو یہ کیسے اندازہ ہوپاتا کہ اعضاء کا تین بار دھونا سنت اور مستحب ہے، فرض اور واجب نہیں۔

آپ کی بلا ترک مداومت تو بلاشبہ ثبوت فراہم کرتی کہ اعضاء کا تین بار دھونا واجب اور ضروری ہے اس کے بغیر وضو صحیح نہیں ہو سکتا۔

آپ نے کبھی کبھی ایک بار اعضاء دھونے پر بس اسلئے کی تاکہ صحابۂ کرام کو یقین ہو جائے کہ وضو میں اعضاء کا ایک دھونا ضروری ہے تین بار دھونا محض سنت واستحباب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی اگر اعضاء کو صرف ایک ایک بار دھوکر وضو تمام کر لیا جائے تو بھی وضو صحیح ہو جائے گا البتہ ثواب میں تھوڑی سی کمی پیدا ہو جائے گی۔

آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کو بے حد مرغوب رکھتے تھے اور بسا اوقات آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ علیکم بالسواک مسواک کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ اور یہ ارشاد گرامی بھی آپ کی زبان مبارک پر آتا رہتا تھا کہ وہ نماز جس کے لئے مسواک کی جائے ....

.... اس نماز کے مقابلہ میں جو بلا مسواک کے پڑھی جائے ستر گنا فضیلت رکھتی ہے۔

اور غالباً آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ آنحضور ؐ سے کم وبیش چالیس روایات ایسی مروی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسواک کرنا آپ ؐ کو انتہائی محبوب تھا اور وقتاً فوقتاً آپ مسواک کرنے کی تلقین بھی فرماتے رہا کرتے تھے۔

لیکن کبھی کبھی بیان جواز کے لئے آپ نے وضو میں مسواک کو ترک فرما دیا تھا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مسواک کرنا مستحب اور سنت تو ضرور ہے لیکن واجب اور فرض نہیں کہ بہر حال کی جائے اور اس کے ترک کو موجب سزا گردانا جائے۔

اندازہ یہ ہوا کہ وہ افعال جو آنحضور ؐ کے معمولات میں داخل تھے اور آپ کو بے حد مرغوب ومحبوب بھی تھے ان کو بھی آپ نے کبھی کبھی دانستہ ترک کر دیا تھا تاکہ صحابۂ کرام کو یہ یقین ہو جائے کہ حضور ؐ کا فلاں معمول فرض اور واجب کی حیثیت نہیں رکھتا کہ اس کا ترک گناہ اور جرم سے تعبیر کیا جا سکے۔ اگر اس کا ترک گناہ اور جرم کے مساوی ہوتا تو ناممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار بھی اس کو نظر انداز کر دیتے۔

اب ذرا سوچئے اگر نماز کے اندر سورۂ فاتحہ کے بعد کسی دوسری سورت وغیرہ کا ملانا صرف استحبابی درجہ رکھتا تو کم از کم ایک بار تو آنحضور سے اس کا ترک ثابت ہوتا، کوئی نماز تو آپ نے ضم سورۃ کے بغیر ادا فرمائی ہوتی۔ آپ کا ہمیشہ ہی ضم سورۃ کے ساتھ نماز ادا کرنا اور کبھی ضم سورۃ کو ترک نہ کرنا اس بات کا واضح اور کھلا ثبوت ہے کہ سورہ فاتحہ کے بعد کسی دوسری سورۃ یا دوسری آیات کا ملانا واجب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بغیر نماز کا درست ہو جانا ممکن نہیں۔

آپ کا یہ خیال کہ آنحضور ؐ نے ضم سورۃ کے بارے میں سکوت فرمایا ہے۔ لہٰذا ضم سورۃ ضروری نہیں ایک غلط خیال ہے۔ جو کم علمی پر مبنی ہے۔

یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لیجئے کہ کسی بھی فعل وعمل میں مداومت بلا ترک دلیل وجوب اور دلیل فرضیت ہوا کرتی ہے اور مداومت مع الترک اس بات کی علامت ہے کہ فعل وعمل اپنی جگہ اہم اور باعث اجر سہی لیکن واجب اور فرض کا درجہ نہیں رکھتا اگر واجب اور فرض کا درجہ رکھتا تو پھر آنحضور ؐ اس کا ترک کبھی نہ فرماتے۔

لہٰذا یہ خیال اور یہ تصور ناواقفیت اور کم علمی پر

محمول کیا جائے گا کہ حضورؐ نے ضم سورۃ کے بارے میں سکوت فرمایا ہے اور آپ کا سکوت یہ ثابت کرتا ہے کہ ضم سورۃ ضروری نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ ھوالاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیئ علیم کو چھوٹی آیت قرار دیں یا بڑی تو اس بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ پہلے آیت کی پیمائش کے لئے کوئی پیمانہ متعین کر لیجئے۔ معیار اور پیمانے کے تعین کے بغیر کسی آیت کے بارے میں چھوٹی بڑی ہونے کا فیصلہ مبنی برصواب نہیں ہو سکتا۔ مذکورہ آیت کے بارے میں اگر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ یہ بڑی ہے یا چھوٹی تو پھر کل کسی دوسری آیت کے بارے میں آپ پوچھ تاچھ کریں گے کہ اس آیت کو چھوٹی آیت سے تعبیر کریں گے یا بڑی آیت سے۔

لہٰذا عقل و قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کو کسی ایسے پیمانہ کی نشاندہی کر دی جائے کہ آئندہ آپ اسی کے توسل سے بآسانی خود آیت کے چھوٹی بڑی ہونے کا اندازہ کر لیں اور آپ کو علماء کے دروازے کھٹکھٹانے کی زحمت اٹھانی نہ پڑے۔

ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ قرآن حکیم کی سب سے چھوٹی سورت کو معیار بنا لیجئے اور قرآن کی سب سے چھوٹی سورۃ کی ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی آیات کا درجہ دیدیجئے۔ اب جو آیت اس مقرر کردہ معیار پر پوری اترے تو آپ بڑی آیت پر محمول کیجئے اور جو پوری نہ اتر سکے اسے ایک یا دو چھوٹی آیتوں کے برابر سمجھئے۔

مثال کے طور پر سورۃ کوثر قرآن کی ایک چھوٹی سی سورۃ ہے اور اس کی قرأت پر اکتفا کر لینے سے بالاتفاق نماز درست ہو جاتی ہے گویا کہ اس سورۃ کو ایک بڑی آیت کے قائم مقام سمجھا گیا ہے۔ لہٰذا جو آیت اس سورۃ کے مساوی ہو اسے بڑی آیت تصور کرنے میں ایں و آں کرنا مناسب نہیں ہو گا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مذکورہ آیت سورۃ کوثر سے بلحاظ الفاظ کسی درجہ کم نہیں۔ لہٰذا اسے بڑی آیت پر محمول کیا جائے گا۔ یعنی اس کی قرأت سے نماز درست ہو جائیگی۔

واللہ اعلم بالصواب

ضم سورۃ واجب ہے یا فرض

سوال ۱۶:۔ (ایضاً)

نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کسی سورۃ یا آیت کا پڑھنا فرض ہے یا واجب؟

الجواب ۱۶:۔

نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کسی دوسری سورۃ یا آیات کا ملانا فرض نہیں بلکہ واجب ہے۔ فرض اور واجب کے مابین نمایاں فرق یہ ہے کہ فرض اگر سہواً بھی چھوٹ جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے اور اس کا دہرانا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن واجب کے سہواً چھوٹ جانے سے نماز اسی وقت فاسد ہو گی جب سجدۂ سہو نہ کیا جائے اگر سجدۂ سہو کر لیا جائے تو نماز بلاشبہ درست ہو جاتی ہے۔

البتہ اگر کسی واجب کو دانستہ یعنی جان بوجھ کر چھوڑ دیا گیا تو پھر نماز فاسد ہو جاتی ہے اور سجدۂ سہو اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا دانستہ واجب کو نظر انداز کر دینے کی صورت میں نماز کا صحیح ہو جانا کسی طرح ممکن نہیں الّا یہ کہ دوبارہ پڑھی جائے۔

نماز میں ضم سورۃ چونکہ واجب کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ضم سورۃ کو جان بوجھ کر ترک کر دینے سے نماز فاسد ہو جائے گی اور اس کا دہرانا ضروری ہو گا۔ لیکن اگر نمازی سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورۃ ملانا بھول جائے تو پھر وہ سجدۂ سہو کر کے اپنی نماز کو صحت مند بنا سکتا ہے اگر سجدۂ سہو بھی بھول گیا تو بھی نماز دوبارہ ادا کرنی پڑے گی

بہرحال سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورت یا

آیات کا ملانا واجب ہے فرض نہیں۔

رویت ہلال کا مسئلہ

سوال: از جناب عبدالہادی صاحب اعظم پور۔

رمضان شریف کے موقع پر رویت ہلال کے معاملہ میں تقریباً ہر جگہ دو قسم کے حضرات موجود ہیں جن میں ثقہ اور ذی اعتبار اور معتمد علیہ اشخاص پائے جاتے ہیں۔ اور اپنے اپنے علم کی حد تک اُن پر اعتماد کرتے ہوئے قیام صوم اور تارک صوم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بندۂ ناچیز ریڈیو کی خبر کو غیر معتبر قرار دیتے ہوئے اس بار بھی ترک صوم کا مرتکب ہوا ہر دو فریق کے دلائل پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ تشفی بخش جواب دیا جائے گا۔ بہشتی زیور، تجلی میں جو جوابات نظر سے گذرے ان میں ابہام موجود ہے۔

فریق اول:۔ مطلقاً ریڈیو کی خبر کو غیر معتبر قرار دیتا ہے اس لئے اس کے نزدیک قول رسولؐ کے تحت عینی شہادت کے بغیر محض خبر پر روزہ رکھنے کو حکم رسولؐ کے خلاف گردانتا ہے۔

فریقِ ثانی:۔ جس کا کہنا ہے کہ شارح علیہ السلام نے ابر کی حالت میں ایک شخص کی خبر کو بھی معتبر قرار دیا ہے منشاء رسولؐ یہ ہے کہ قلب و ذہن کو اس بات پر اطمینان و ایقان حاصل ہو جائے کہ ہلالِ رمضان کی یہ خبر درست ہے۔ وہ خبر چاہے کسی سائنسی ذرائع سے حاصل ہوئی ہو۔ البتہ خبر رساں کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔

(۲) وہ ریڈیو کے ذریعہ پاک کے تمام اسٹیشنوں سے خبریں سنکر جو ہر پندرہ منٹ کے بعد براڈکاسٹ ہوتی رہتی ہیں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن پر علماء تفسیر بھی بیان کرتے ہیں اور تاریخ رمضان بھی بتاتے ہیں۔

(۳) فریق ثانی کہتا ہے کہ بارہا کا مشاہدہ ہے کہ رویت ہلال کی خبر ریڈیو پر سنکر جن حضرات نے روزہ رکھا ان کا روزہ باعتبار رویت صحیح نکلا اور جو تارک صوم کے مرتکب ہوئے۔ اور روزہ کی ان تمام فضیلتوں سے محروم ہو گئے جن کا احادیث میں ذکر ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔

(۴) واضح رہے عید الفطر کے موقع پر رویتِ ہلال کے بارے میں جو قید حضورؐ نے لگائی ہے اگر اس کا اطلاق ان خبروں پر ہو تو وہ مصر بھی نہیں کیونکہ یہاں پر ترک صوم کا معاملہ ہے۔

ایسی صورت میں ہلال رمضان کے بارے میں ایک شخص کی خبر ابر کی حالت میں زیادہ قابل اعتماد ہے یا پاک کے تمام اسٹیشنوں سے ہر پندرہ منٹ بعد مختلف سے فضاء بسیط میں پھیلنے والی خبریں۔

یہاں ایک بات اور واضح کر دوں۔ میرا تلخ تجربہ ہے کہ یہ عینی شہادت دینے والے اس کسوٹی پر پورے نہیں اترتے جو حضورؐ نے متعین کی ہے۔ بس روایتی قسم کے مسلمان ہیں۔

میرے نزدیک یہ کوئی فروعی مسئلہ نہیں۔ پھر اس انتشار کو ختم کرنے کے لئے کوئی مؤثر اقدام کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی؟۔

الجواب:۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ بہشتی زیور اور تجلی میں چھپے ہوئے جواب سے تسلی نہیں ہو سکی اس لئے کہ ان میں ابہام موجود تھا لیکن آپ نے حوالہ دینے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ بہشتی زیور کے کس حصہ اور تجلی کے کس شمارے میں رویت ہلال کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔

بہشتی زیور میں کسی بھی مسئلہ کی تلاش منجملہ مشکلات نہیں۔ البتہ تجلی کے ۲۷ سالہ فائل میں کسی خاص موضوع کی جستجو میں جس درجہ دشواری اور مستحیل ہے اس کا اندازہ کچھ نہ کچھ آپ بھی کر سکتے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر آپ یہ تحریر فرمادیتے کہ تجلی کے فلاں شمارہ میں رویت ہلال

پر کلام کیا گیا ہے اور یہ کلام میرے لئے باعث تشفی ثابت نہیں ہو سکا۔

آپ نے ہر دو فریق کی گفتگو نقل کر کے متعدد سوالات کئے ہیں۔ سب کا الگ الگ جواب دینا تفصیل کا باعث ہو گا۔ سب کا الگ الگ جواب دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ اصولی طور پر چند باتیں گذارش کی جا رہی ہیں۔ ان گذارشات میں اپنے سوالوں کے جواب تلاش کر لیجئے۔

اس بات سے تو آپ یقیناً واقف ہوں گے کہ فقہاء نے شہادت اور خبر کو دو جداگانہ چیزیں قرار دیا ہے اور دونوں کے لئے الگ الگ شرائط و احکام مقرر کئے ہیں اور ممکن ہے کہ آپ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ ریڈیو سے چاند کے بارے میں جو اطلاعات نشر کی جاتی ہیں ان پر شہادت کا اطلاق نہیں ہوتا انھیں بہرحال خبر سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس طرح جو اطلاعات بذریعۂ ٹیلیفون وغیرہ موصول ہوں انھیں بھی خبر و روایت کی فہرست میں شمار کریں گے۔ انھیں شہادت کا نام دینا روا نہیں ہو گا۔

یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ فقہاء نے ہلال رمضان اور ہلال عید کے مابین بھی تفریق کی لکیر کھینچ دی ہے اور یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ابر و غبار کی حالت میں ایک عادل و ثقہ شخص کی گواہی سے اور ریڈیو وغیرہ کی خبر سے رمضانیت ثابت ہو جائے گی۔ لیکن ہلال عید کا معاملہ جداگانہ ہے۔ ہلال عید کے بارے میں ایک عادل اور ثقہ آدمی کی گواہی معتبر نہیں ہو سکتی خواہ وہ آدمی تقدس اور پرہیزگاری کے اعتبار سے اپنے وقت کا خضر ہی کیوں نہ ہو۔

ابر و غبار کی حالت میں ہلال عید کے لئے کم از کم دو ایسے آدمیوں کی شہادت درکار ہو گی جو عدل و ثقاہت میں مشہور و معروف ہوں یا جو مستور الحال ہوں۔ مستور الحال کا مطلب یہ کہ وہ اجنبی ہوں اور ان کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہ کی جا سکے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان کی ظاہری وضع قطع میں کوئی ایسا عیب نہ ہو جسے شرعی عیب سے تعبیر کیا جا سکے۔

جس طرح ایک شخص کی گواہی سے ہلال عید متحقق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ریڈیو وغیرہ کی خبر سے بھی ہلال عید کا تحقق نہیں ہو گا۔

گویا کہ ریڈیو کی خبر نہ بہرحال معتبر ہے اور نہ بہرحال غیر معتبر — ہلال رمضان کے بارے میں ریڈیو کی خبر ناقابل اعتبار قرار پائے گی۔

یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ رمضان کے چاند کے بارے میں بھی ریڈیو کی خبر اسی وقت قابل اعتبار متصور ہو گی جب کہ یہ یقین ہو کہ خبروں کو نشر کرنے والا مسلمان ہے اور حدود شریعت سے کم از کم اس درجہ واقفیت رکھتا ہے جس درجہ واقفیت رکھنا ہر صاحب ایمان کے لئے ضروری ہے۔

اختلاف مطالعہ کا چونکہ کوئی اعتبار نہیں ہے لہٰذا اگر مدراس سے چاند دیکھنے کی خبر آئے تو دہلی وغیرہ میں بھی رمضان کی آمد ثابت ہو جائے گی لیکن یہ واضح رہے کہ ہلال رمضان کے بارے میں بھی ریڈیو کی خبر اسی وقت معتبر ہو گی جب طلوع ہلال کے وقت مطلع پر ابر و غبار چھایا ہوا ہو۔ اگر مطلع بالکل صاف تھا تو اس صورت میں محض خبر موصول ہو جانے سے رمضان ثابت نہیں ہو گا بلکہ شہادت کا انتظار کیا جائے گا اور شہادت بھی ایک دو آدمی کی معتبر نہیں ہو گی۔ بلکہ اتنے آدمیوں کی شہادت درکار ہو گی جنھیں جم غفیر کہا جا سکے۔ ہلال عید کے بارے میں ریڈیو کی خبر ناقابل اعتبار سمجھی جائے گی خواہ مطلع صاف ہو یا ابر آلود

حاصل یہ ہے کہ بعض صورتوں میں خبر کا اعتبار کیا گیا ہے اور بعض صورتوں میں نہیں۔ اور چونکہ حالت ابر و غبار میں ریڈیو کی خبر معتبر سمجھی گئی ہے لہٰذا ریڈیو پر چاند کی اطلاع نشر ہونے کے بعد اگلے دن روزہ رکھنا ضروری ہو

فریق ثانی کے خیالات بلاشبہ درست اور وزن دار ہیں لیکن اس نے جو ریڈیو کی خبر کے بارے میں عقلی دلائل پیش کئے ہیں ان سے جہالت اور کم فہمی کی بو آتی ہے۔

آپ کا یہ فرمانا بھی درست نہیں ہے کہ عینی شہادت دینے والے اس معیار پر پورے نہیں اترتے جو معیار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کردہ ہے۔

یہ بات ملحوظ رکھئے کہ شریعت مطہرہ نے ہمیشہ آدمی کے ظاہر پر اعتماد کیا ہے، آدمی کے اندر جھانکنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ اور یہ بات ممکن بھی نہیں کہ کسی طرح آدمی کی نیت اور اس کے اندرونی احوال کا ادراک کر لیا جائے۔ جب اندرونی احوال و کیفیات کا ادراک ممکن ہی نہیں تو پھر لامحالہ آدمی کے ظاہر پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنا پڑے گا۔ البتہ اگر ظاہر میں کوئی عیب اور نقص موجود ہو تو پھر اس شخص کو ثقہ اور پرہیزگار خیال نہیں کریں گے۔ گو حقیقتاً وہ پرہیزگار ہی کیوں نہ ہو۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ اعتبار ظاہر کا کیا جائیگا۔ اور چونکہ باطن کا اندازہ کرنا ممکن ہی نہیں لہذا اس جھنجھٹ میں پڑے بغیر کہ اس کا باطن اس کے ظاہر کے برعکس نہ ہو۔ اس کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ کر لیا جائے گا۔ ظاہر اچھا ہے تو اسے اچھا سمجھا جائے گا۔ ظاہر برا ہے تو اسے برا سمجھا جائے گا۔ اگرچہ وہ باطنی طور پر بدکار ــ یا پرہیزگار ہی کیوں نہ ہو۔

اگر روایتی مسلمان سے آپ کا اشارہ ان مسلمانوں کی طرف ہے جن کے ظاہر میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہوتی جس کی بنا پر انھیں مسلمان سمجھا جا سکے تو بلاشبہ ایسے لوگوں کی گواہی امور دینیہ میں معتبر نہیں ہو گی۔ امور دنیاوی میں خواہ وہ کتنے ہی قابل اعتماد کیوں نہ سمجھے جاتے ہوں۔ شریعت نے بہرحال مستور الحال کی گواہی کو قابل اعتبار سمجھا ہے۔ مستور الحال کہتے ہی اسے ہیں کہ اس کا ظاہر تو مسلمانوں اور متقیوں جیسا ہو لیکن اس کے بارے میں صحیح طور پر کسی کو اندازہ نہ ہو سکے کہ یہ کون ہے اور حقیقتاً کس قسم کا آدمی ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص ہلال رمضان کے بارے میں کسی قرب و جوار یا دور دراز کے علاقہ سے گواہی دینے کے لئے آتا ہے اس شخص کا ظاہر قابل اعتماد ہے لیکن چونکہ وہ اجنبی ہے اس لئے اس کی اخلاق و کردار کی صحیح پوزیشن کا ادراک کر لینا قطعی ناممکن ہے۔ لیکن اس کی گواہی اس بنا پر قابل اعتبار تصور کر لی جائے گی کہ اسکے ظاہر میں کوئی خرابی موجود نہیں ہے اور فتویٰ ظاہر ہی پر لگایا جاتا ہے نہ کہ باطن پر البتہ اگر کسی کا فسق و فجور ظاہر باہر ہو تو اس کی شہادت قابل رد اور ناقابل قبول قرار پائے گی خواہ لباس اور وضع قطع کے اعتبار سے وہ غوث اور قطب ہی کیوں نہ محسوس ہوتا ہو۔

آخری سطر میں آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ آخر رویت ہلال کے بارے میں کوئی مؤثر اقدام کیوں نہیں کیا جاتا۔

خدا جانے مؤثر اقدام کسے کہتے ہیں۔ جہاں تک اس بارے میں تفصیلی گفتگو کا معاملہ ہے وہ ہمارے علماء بہت پہلے کر چکے ہیں۔ اجتماعی فیصلے صادر کرنے کے لئے رویت ہلال کمیٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ بعض علاقوں میں ایسی انجمنیں بھی قائم ہیں جنہیں امارت شرعیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ انجمنیں بر وقت اپنی آرار اور رجحانات سے آگاہ کرتی رہتی ہیں۔

صحیح اور مناسب تر فتاویٰ دینے کیلئے دارالعلوم دیوبند جیسے قابل اعتماد ادارے قائم ہیں اگر یہ سب کچھ مؤثر اقدام کے ضمن میں نہیں آتا تو پھر آپ ہی بتائیں کہ مؤثر اقدام کی کیا صورت ہوگی۔؟

مندرجہ بالا سطور میں آپ کے سوال کا جواب دے چکا تھا لیکن آج پھر آپ کا مفصل خط موصول ہوا۔ یہ بھی رویت ہلال سے متعلق ہے اس میں بھی کم و بیش وہی باتیں دریافت کی گئی ہیں جو گذشتہ خط میں دریافت

کی گئی تھیں اور جنھیں نقل کر کے میں جواب دے چکا ہوں اس نئے خط کو میں نقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس کی اولین وجہ یہ ہے کہ یہ بے حد طویل ہے اس کو نقل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں تجلی کی ڈاک کے دو تین صفحے سیاہ کر دوں اور قارئین کی ناراضگی مول لوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس خط میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو گزشتہ اور کتابت شدہ خط میں موجود نہ ہو۔ تقریباً وہی مسائل ہیں جن کا ذکر آپ پہلے کر چکے ہیں اور میں اپنے محدود علم و عقل کے مطابق ان کا جواب بھی دے چکا ہوں۔

ہاں ایک بات اس خط میں ضرور ایسی نظر آئی جسے انوکھی اور نرالی کہا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے اس خط میں سعید الزماں نامی عالم دین کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ جن حضرات نے امسال پیر کا روزہ رکھا وہ دین کے معاملہ میں خود آرائی اور عقلی گھوڑے دوڑانے کے مرتکب ہوئے۔

خادم یہ گزارش کرتا ہے کہ جن لوگوں نے امسال رمضان کا آغاز منگل سے کیا ہے اور پیر کا روزہ رکھنا گوارہ نہیں کیا (باوجودیکہ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ ۲۹ر کا چاند ہونے کی اطلاعات ملک بھر میں پھیل چکی تھیں اور دار العلوم جیسے معتمد اور محتاط اداروں نے ان اطلاعات کو قابل اعتبار سمجھتے ہوئے چاند ہونے کا اعلان کر دیا تھا)

انھوں نے دین کے معاملہ میں ہٹ دھرمی اور عقلی گدھے دوڑانے کی جسارت کی ہے۔ امور دینیہ میں خود آرائی معیوب سہی لیکن اتنی معیوب نہیں کہ ہٹ دھرمی کے مقابلہ میں اسے خفت کا سامنا کرنا پڑے۔ رہا عقلی گھوڑے دوڑانے کا معاملہ تو وہ میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ جنھوں نے پیر کے دن روزہ رکھا انھوں نے دین کے میدان میں عقلی گھوڑے دوڑانے اور جنھوں نے پیر کے دن روزہ رکھنے کو فعل عبث تصور کیا انھوں نے دین کے میدان میں عقلی گدھے دوڑانے کی حرکت فرمائی۔ گھوڑے بہرحال گدھوں کے بہ نسبت ثقہ سمجھے جائیں گے۔ لہٰذا پلّہ ان ہی کا بھاری رہیگا جنھوں نے ۲۹ر کا چاند تسلیم کر لیا اور پیر کے دن سے رمضان کے روزے رکھنے شروع کر دیئے۔

یہ ایک متفقہ اور تسلیم شدہ بات ہے کہ ہلال رمضان کے بارے میں شخص واحد کی گواہی بھی قابل اعتبار سمجھی جائے گی۔ جب کہ ہلال عید کے بارے میں کم از کم دو ثقہ آدمیوں کی گواہی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عید کے چاند کے بارے میں کم سے کم دو آدمیوں کی گواہی کو قابل اعتبار کیوں تصور کیا گیا ہے اور دو سے کم کی گواہی کو کس لئے ناقابل تسلیم گردانا گیا ہے۔ اور رمضان کے چاند کے بارے میں صرف ایک شخص کی گواہی کو قبول کرنے کا آرڈر کیونکر دے دیا گیا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

اس کی ایک نہیں ان گنت وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن دو وجہ تو ایسی ظاہر و باہر ہیں جو مجھ جیسے نااہل اور کم فہم آدمی کی بھی سمجھ میں آتی ہیں۔

ایک وجہ تو یہی ہے کہ جہاں بڑے اور ناقابل تلافی نقصان کا اندیشہ ہو وہاں مصلحت اور احتیاط کو ملحوظ رکھنے میں اصول و کلیات ہی پر زد کیوں نہ پڑتی ہو۔

۲۹ر شعبان کو آپ نے چاند دیکھنے کی کوشش کی لیکن چونکہ مطلع غبار آلود تھا اس لئے آپ کو چاند نظر نہیں آیا البتہ آپ نے یہ اڑتی ہوئی خبر سنی کہ چاند ہو گیا ہے۔ اب احتیاط کا تقاضا یہ ہوگا کہ آپ اگلے دن روزہ رکھیں اور وہم بازی کے چکر میں نہ پڑیں۔ اگر آپ نے روزہ رکھ لیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ خبر جھوٹی تھی چاند نہیں ہوا تو ظاہر ہے کہ آپ کو نفلی روزے کا ثواب مل ہی جائیگا اور اگر اتفاقاً خبر صحیح ثابت ہوئی چاند واقعی طور پر ہو گیا تھا تو پھر آپ فائدے میں رہیں گے اور ان تمام حضرات کو ایک روزہ قضا کرنا پڑے گا جو ناحق معاملہ میں فلسفی بنے ہوئے تھے۔ احتیاط اور مصلحت ان کے پیش نظر نہیں تھی —— بہرکیف خسارہ کسی بھی صورت میں آپ کے حصہ میں

نہیں آئے گا۔ آپ بہرحال فائدے میں رہیں گے خبر سچی ہو یا جھوٹی۔ چاند ہوا ہو یا نہیں۔

اسی طرح احتیاط ہلال عید کے معاملہ میں بھی ملحوظ رہے گی۔ لیکن اس احتیاط میں اور پہلی والی احتیاط میں تھوڑا سا فرق ہو جائے گا۔ پہلی صورت میں تو احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ جھوٹی خبر کو بھی اہمیت دی جائے اور روزہ رکھ لیا جائے۔ دوسری صورت میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سچی خبر کو بھی اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جائے جب تک چاند کا ہونا متیقن طور پر ثابت نہ ہو جائے۔ دونوں جگہ احتیاط اس بات کی متقاضی رہے گی کہ روزہ ترک نہ ہو۔ دونوں میں سے کسی بھی صورت میں اگر روزہ ترک ہو گیا جب کہ حقیقتاً ترک نہیں کرنا چاہئے تھا تو اس کی قضا لازمی ہے ورنہ آدمی گناہگار ہوگا۔ مثلاً عید کے چاند کے بارے میں سرسری سی خبر کانوں میں پڑی کہ چاند ہو گیا۔ یہ خبر سنکر کچھ حضرات نے اگلے دن روزہ نہیں رکھا بعد میں معلوم ہوا کہ خبر جھوٹی تھی تو ان کچھ حضرات کو ایک روزہ کی قضا کرنی پڑے گی۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ ہلال رمضان کے بارے میں فقہاء نے فرد واحد کی گواہی کو اس لئے قابل اعتبار قرار دے دیا ہے کہ اگر اتفاقاً خبر جھوٹی بھی ہو تو نقصان کا کوئی پہلو نہیں۔ نفلی روزہ کا ثواب تو کہیں گیا نہیں۔ اور اگر خبر سچی ثابت ہو تو پھر وارے کے نیارے۔

ہلال عید کے بارے میں فرد واحد کی گواہی اسلئے قابل رد قرار پائی کہ اس صورت میں نقصان کا اندیشہ ہے، اگر خبر مبنی بر کذب ہو۔ ابر و غبار کی حالت میں ہلال رمضان جب ایک شخص کی گواہی سے ثابت ہو سکتا ہے تو پھر خط اور ٹیلی فون کے ذریعہ کیوں نہیں ثابت ہو سکتا اور جب خط اور ٹیلی فون کے ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے تو پھر ان اطلاعات کے ذریعہ کیوں ثابت نہیں ہو سکتا جو ریڈیو سے نشر کی جاتی ہیں۔

چلئے آپ صرف ریڈیو اسٹیشن کی خبر کو صحیح مانیے جو مسلمانوں کے قبضہ میں ہو اور جس پر متمکن ہو کر خبریں براڈ کاسٹ کرنے والا بھی مسلمان ہی ہو۔ لیکن ریڈیو کی خبر کو سرے سے اہمیت نہ دینا ہمارے سمجھ میں نہیں آتا۔

ہلال عید کے بارے میں اگر ریڈیو کی خبر کو لائق اعتبار نہ سمجھا جائے تو چلئے اسے پرہیزگاری پر محمول کرلیں گے لیکن اگر رمضان کے بارے میں بھی ریڈیو کی خبر قابل التفات نہیں ہے تو اسے کس چیز پر محمول کیا جائے گا۔ اسے پرہیزگاری تو نہیں کہا جا سکتا۔ کیا نفلی روزے سے جان چرانا پرہیزگاری کہلا سکتا ہے۔؟

اگر اتفاقاً ریڈیو کی خبر مبنی بر حقیقت ثابت نہیں تو ایک نفلی روزہ رکھنے ہی کی زحمت تو اٹھانی پڑے گی اور نفلی روزہ رکھنا تو عین پرہیزگاری کی علامت ہے نہ کہ اس سے جان بچانا۔

اس سال جنھوں نے ۲۹ کا چاند تسلیم نہیں کیا اور رمضان کا آغاز پیر سے نہیں منگل سے کیا ان بیچاروں کے ۲۸ روزے ہوئے۔ اور یہ بات مسلّم ہے کہ قمری تاریخوں میں کوئی مہینہ ۲۸ دن کا نہیں ہوتا۔ جس طرح انگریزی تاریخوں میں فروری کا مہینہ ۲۸ دن کا ہوتا ہے — مولانا سعید الزماں صاحب نے بھی غالباً ۲۸ ہی روزے رکھے ہوں گے۔ اس لئے کہ انھوں نے دین کے معاملہ میں عقلی گھوڑے دوڑانے سے گریز کیا۔ خیر مضیٰ ما مضیٰ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نقصان میں کونسا فریق رہا۔ جس نے ریڈیو کی خبر کو سچ سمجھا وہ یا جس نے ریڈیو کی خبر کو جھوٹ سمجھا وہ۔؟

ہمارے خیال میں مولانا سعید الزماں صاحب کو اپنے حلقۂ اثر میں یہ اعلان کرا دینا چاہئے کہ جن لوگوں نے پیر کا روزہ نہیں رکھا تھا وہ اپنے روزے کی قضا کرلیں ورنہ یہ روزہ ان کے ذمہ رہے گا۔ اور وہ اخروی اعتبار سے زبردست گھاٹے میں رہیں گے۔

اکلِ حلال و حرام

سوال:- از: ڈاکٹر اعجاز الاری۔ اعظم گڈھ

ایک بزرگ و فاق حنفی عالم صاحب دینی مدارس و یتیم خانوں کے رقوم چندہ کی حلت و حرمت سے متعلق یوں مسئلہ فرماتے ہیں کہ "جہاں حلال و حرام ذرائع سے پیدا کی ہوئی آمدنی جمع ہوں اور مساوی ہوں یا غلبہ حلال و حرام میں سے کسی کو ہے اور وہ کسی کے پوچھنے پر کہے کہ میرا مال حلال ہے تو ایسی رقم کی حلت و حرمت کی تحقیق کی مزید ضرورت نہیں اور اس شخص کی امانت کو حلال سمجھ کر بطور چندہ قبول کر لینے میں کوئی قباحت نہیں"۔ مولانا موصوف نے کسی حدیث کا حوالہ نہیں دیا بلکہ فقط ایک شرعی مسئلہ بیان فرما دیا ہے مگر کسی حدیث کی غیر موجودگی میں مولانا کی اس شرعی دلیل پر اتفاق کر لینا کم از کم میرے بس کی بات نہیں کیونکہ میری عقل سلیم اس مسئلہ میں جہاں تک کام کرتی ہے فقہی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو یہ حقیقت آئینہ کی طرح عیاں ہے۔

ایک شخص سود خور، شراب فروش، چور، ڈاکو وغیرہ سب کچھ ہے اور انھیں غلط پیشہ کو اپنا ذریعۂ معاش بنانے کے ساتھ دکھلا دے کے لئے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار بھی کر لیتا ہے۔ ظاہر بات ہے اس کی آمدنی میں حرام و حلال دونوں قسم کا مال جمع ہوگا۔ چنانچہ ایسا بدکار شخص اگر کہہ دے کہ میرا مال حلال ہے تو کیا اس کی بات قابل قبول ہو سکتی ہے؟ اور اسکی امانت کو حلال سمجھ کر کسی دینی مدرسہ یا یتیم خانہ کے لئے قبول کیا جا سکتا ہے؟ علاوہ بریں حصی کے ایک من حلال گوشت میں لحم خنزیر اگر چھٹانک ملا دیا جائے تو کیا سارا گوشت حلال مانا جائے گا؟ یہ کیا بے تکی بات مولانا موصوف نے پیدا کر کے گمراہ کرنے کا حسین راستہ دکھلایا ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ بے حد نازک و اہم ہے اس لئے آپ سے گذارش ہے حدیث شریف و فقہ کی روشنی میں مدلل جواب سے مرحمت فرما دیں۔ میں اتنا جانتا ہوں تقویٰ کا تقاضا ہے اکل حرام سے اجتناب کیا جائے اور جس مسلمان میں تقویٰ نہیں وہ منافق ہے اور منافق مومن ہونے کا کتنا ہی دعویٰ کرے بہرحال اسلام کے لئے وہ نقصان دہ ثابت ہوگا۔ بلکہ مشرک و کافر اسلام کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ آج کے نام نہاد مسلمانوں کی اکثریت سے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ رہا ہے۔ مگر اہل ایمان ان نام نہاد کے متعلق خوش فہمی میں ہیں کہ یہ بھی مسلمان ہیں مگر کمتر درجہ کے حالانکہ مومن کی قسمیں نہیں ہوا کرتیں بلکہ اسلامی عمل و کردار کے اعتبار سے مومن فقط مومن ہوتا ہے اگر وہ اپنے مقام سے ہٹا ہوا ہے تو وہ مومن نہیں بلکہ منافق یا کافر ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ پڑھنے کو تو گاندھی بھی کلام پاک کی تلاوت کرتا تھا تو ہم سمجھیں کہ وہ مسلمان تھا زبان سے لا الٰہ الا اللہ و ایمان مجمل و ایمان مفصل کو اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ عمل بھی ویسا ہی ہونا چاہئے اور رسولہ آنے ویسا ہی ہونا چاہئے ورنہ قرآن و احادیث کے مطابق ایسا کرنے والا مومن ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آج دینی مدارس و یتیم خانوں میں بلا تحقیق حلت و حرمت ہر قسم کے رقوم چندے میں وصول کر کے طلباء کو دکھلایا جاتا ہے جس کا خاص اثر آج کے علماء کے قلب و ذہن پر یوں پڑا ہے کہ علم دین کی دولت سے مالا مال ہوتے ہوئے ان کے قلب و ذہن تاریک نظر آتے ہیں۔

الجواب:-

خدا ہی جانے وفاق صاحب کی گفتگو کا انداز اور منشا کیا رہا ہوگا۔ ممکن ہے کہ آپ کی عقل نے ان کا مدعا سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہو۔ کسی بھی ذی اعتماد عالم سے اس

بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس مال کو حلال باور کرائے جس میں مال حرام غالب ہو۔

اتنی بات ضرور ہے کہ اگر کوئی شخص اعلانیہ طور پر سودی کاروبار نہیں کرتا اس کے بارے میں اس بات کی صحیح تحقیق نہیں کہ اصل کاروبار اس کا کس قسم کا ہے لیکن ظاہری طور پر اس کا ذریعۂ معاش کوئی چھوٹی موٹی تجارت ہے اور اسی تجارت کو وہ اپنا حاصل محنت اور ذریعہ معاش کہا کرتا ہے تو اس کی بات کا یقین کرنا ضروری ہے اور اس کے پاس دولت کی بہتات دیکھکر اس وہم میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ یہ دولت کہاں سے آئی اور اس کا اصل ذریعۂ آمدنی کیا ہے؟۔

اسلام کسی کے بارے میں تجسسات کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر تجسس کے بغیر کسی کے بارے میں یہ علم ہوجائے کہ اس کا اصل ذریعۂ آمدنی یہ نہیں جو ظاہر ہے بلکہ اصل ذریعۂ آمدنی وہ ہے جس پر سیاست کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں تو بلاشبہ ایسے شخص سے لین دین کرنا خلافِ تقویٰ ہوگا۔

جس شخص کے پاس دونوں طرح کے اموال موجود ہوں وہ مال بھی جو حلال طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے اور وہ مال بھی جو حرام اور ناجائز ذرائع سے مہیا کیا گیا ہے تو ایسے شخص کے بارے میں عام فقہاء نے یہ اجازت دی ہے کہ اس کے گھر اکل وشرب کا سلسلہ جائز ہے لیکن اولیٰ اور احوط یہ ہے کہ ایسے شخص کے گھر کھانے پینے سے احتراز کیا جائے۔

ملی جلی قسم کی رقم یتیم خانوں میں کھپائی جاسکتی ہے البتہ مدارس وغیرہ میں اس قسم کا پیسہ لگانا جائز نہیں۔

چونکہ کسی معتمد عالم سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایسے مال کو "حلال" تصور کرے جسمیں مال حرام کی بھی آمیزش ہو۔ لہذا ہمارا خیال یہ ہے کہ وفاق صاحب نے یہ فرمایا ہوگا۔ اگر کوئی شخص ماضی میں سود وغیرہ کا کاروبار کرتا رہا ہو پھر بعد میں اس نے ناجائز کاروبار کو ترک کرکے جائز طریقہ پر تجارت وغیرہ شروع کردی ہو اور اب یہی کہتا ہو کہ میرا مال بھی حلال ہے اور میرا ذریعہ آمدنی بھی تو اس شخص کی بات مانی جائے اور اس کے پیسے کو جائز تصور کرتے ہوئے مدارس وغیرہ کے لئے بطور خیرات وغیرہ لے لیا جائے۔

اگر کوئی شخص کھلے عام سود کا کاروبار بھی کرتا ہے اور تجارت بھی یعنی اس کی دونوں قسم کی آمدنیاں عیاں اور ظاہر وباہر ہیں تو ایسے شخص سے بطور خیرات روپیہ لے کر مدارس وغیرہ میں کھپانا جائز نہیں ہوسکتا۔

ممکن ہے کہ چھوٹے اور غیر مستند مدارس کے سفراء ایسے لوگوں سے بھی چندہ وصول کرلیتے ہوں جن کے کاروبار مشتبہ یا ناجائز ہیں۔ لیکن بڑے اور معتمد مدارس اپنے سفیروں کو اس بات کی تاکید کردیتے ہیں کہ جس کا ذریعہ معاش ظاہراً غلط اور ناجائز ہو اس سے چندہ لینے کی ضرورت نہیں۔ خواہ وہ بذات خود چندہ دینے پر مصر ہو۔ چنانچہ بڑے مدارس کے سفیر حضرات ایسے پیسے کو قبول نہیں کرتے جو مشتبہ بھی ہو چہ جائیکہ حرام۔

آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں کسی حدیث کے بغیر وفاق صاحب کی بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور نہ ہی میں اس شرعی دلیل سے متفق ہوں جو وفاق صاحب نے بیان کی ہے۔

یہ شرعی دلیل والی بات بھی بالکل عجیب وغریب ہے۔ وفاق صاحب کی کسی بات کو آپ دلیل شرعی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ دلیل تو انھوں نے کوئی بیان ہی نہیں کی۔ غالباً آپ اصول اور دلیل کے مابین فرق کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

یہ بات بھی قطعاً لغو اور مہمل ہے کہ جب تک بطور دلیل حدیث نہ پیش کی جائے آپ کسی بات کو مانیں ہی گے نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ کیا قرآن کی آیت اور

علمائے امت کا اجماع آپ کے نزدیک دلیل کی حیثیت نہیں رکھتا ؟ ۔ اگر مذکورہ چیزیں بھی آپ کے نزدیک دلیل و برہان کا درجہ رکھتی ہیں تو پھر یہ کہنا کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ حدیث لاؤ ورنہ ہم کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ۔

بعض باتیں آپ کے خط میں اس درجہ مضحکہ خیز ہیں کہ ان پر کچھ عرض کرتے ہوئے بھی انقباض محسوس ہوتا ہے ۔

آپ نے فرمایا ہے کہ ہر وہ مسلمان جس میں تقوی اور پرہیزگاری نہ ہو وہ منافق ہے ۔ آپ کا یہ کہنا بلاشبہ درست ہے کہ اسلام کو جتنا نقصان مسلمانوں سے پہنچا ہے ۔ دوسری قوموں سے نہیں پہنچا لیکن یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ ہر وہ مسلمان منافق ہے جو تقدس اور پرہیزگاری سے محروم ہو ۔

شاید آپ جانتے ہی نہیں کہ منافق کہتے کسے ہیں اگر آپ کے ذہن میں منافق کی صحیح تعریف موجود ہوتی تو آپ اتنی غلط بات زبان سے خارج نہیں کر سکتے تھے

محترم ! منافق اسے کہا جاتا ہے کہ جس کے ظاہر و باطن میں کھلا فرق موجود ہو ۔ یعنی ظاہر کچھ باطن کچھ ۔

غالباً آپ اس بات سے بھی واقف نہیں کہ نفاق دو طرح کا ہوتا ہے ایک نفاق فی الایمان اور ایک نفاق فی العمل ۔ نفاق فی الایمان کا وجود فی زمانہ ناپید ہے ۔ ایسے منافقین صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پائے جاتے تھے جو زبان سے مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہوں اور دلی طور پر کافر و مشرک ہوں یعنی ایمان و اسلام کی خوشبو بھی انھیں نصیب نہ ہو ۔

البتہ نفاق فی العمل موجودہ زمانے میں بھی پایا جاتا ہے — ایمان کا دلی طور پر اقرار کرنے کے باوجود اعمال صالحہ سے راہ فرار اختیار کرنا اور گناہوں میں غرق رہنا نفاق فی العمل کی تعریف میں آتا ہے ۔ موجودہ دور کے بدکار اور بد اطوار مسلمانوں کو ان منافقین پر قیاس کر لینا جو حضور کے زمانہ میں پائے جاتے تھے ، نا سمجھی کی بات ہے ۔

چونکہ نفاق فی العمل میں مبتلا مسلمانوں کو زمرۂ منافقین میں شمار کرنا روا نہیں ہے ۔ اسی لئے امت کے ذکی و فہیم علماء نے ان تمام حضرات کو فساق و فجار قرار دیا ہے جو زبان سے مسلمان ہونے کا دعوی کرتے ہوں لیکن جن کا عمل اسلامی احکامات سے متصادم ہو ۔

حیرت ہے کہ آپ ان حضرات کو بھی منافق قرار دے رہے ہیں جن کے اندر تشرع اور پرہیزگاری کا فقدان ہو ۔ تشرع اور پرہیزگاری ، تقوی اور تقدس بلاشبہ اعلی درجہ کے اوصاف ہیں ، لیکن جن حضرات کے اندر یہ صفات موجود نہ ہوں انھیں منافقین کی صف میں کھڑا کر دینا صرف ناانصافی ہی نہیں بلکہ ایک درجہ کا ظلم و ستم بھی ہے ۔ کیا آپ کے اعمال ان مسلمانوں کے اعمال سے ملتے جلتے ہیں جن کو اولیاء اور اصحاب تقوی کے نام جانا پہچانا جاتا ہے ۔ ؟

اگر واقعتاً آپ اس مقام علیا پر فائز ہیں تو سبحان اللہ لیکن اگر ایسا نہیں ہے یعنی آپ اس مقام پر فائز و متمکن نہیں ہیں جس تک پہنچنے کے بعد آدمی کو متقی کہا جا سکتا ہے تو پھر آپ کی اپنے بارے میں کیا رائے ہے ۔ کیا آپ خود کو بھی اس گروہ میں شمار کرتے ہیں جیسے گروہ منافقین سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ ؟

بظاہر یہ تصور بڑا دل فریب اور خوشنما ہے کہ جس شخص کے پاس اعمال صالحہ کی دولت نہیں ہے وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ۔ وہ کافر یا منافق ہے ۔ لیکن اپنے پس منظر کے اعتبار سے یہ تصور حد درجہ خطرناک اور گھناؤنا ہے ۔ یہ تصور ان حدود کو پار کر جاتا ہے جن کی نشاندہی امت کے ان ائمہ اور فقہاء نے کی ہے جن پر اعتماد کئے بغیر ایمان اور ہدایت کی راہوں میں دو قدم بھی چلنا ممکن نہیں ہے ۔

آپ نے سنا ہوگا تاریخ کے اوراق میں دو گمراہ ترین فرقوں کا تذکرہ آتا ہے ۔ یہ دونوں ہی فرقے اس بات کے قائل تھے کہ معصیت کا ارتکاب کرنے کے بعد

مسلمان دائرۂ ایمان سے خارج ہوجاتا ہے۔ یہ دونوں فرقے مرتکبین معصیت کو دائمی عذاب کی دھمکیاں دیا کرتے تھے حالانکہ یہ بات لغو اور باطل ہے کہ معصیت کے ارتکاب سے مسلمان دائرۂ کفر میں داخل ہو کر دائمی عذاب کا مستحق ہوجاتا ہے۔

صحابۂ کرام اور ائمہ امت میں سے کسی شخص سے بھی ایسی بات مروی نہیں ہے جن سے معتزلہ اور خوارج کے ارشادات عالیہ کی تائید ہوتی ہو۔

تمام صحیح العقیدہ علماء کا محکم اور معقول مسلک یہ ہے کہ کوئی بھی معصیت سوائے ارتداد کے مسلمان کو دائمی جہنم کا مستحق نہیں ٹھیراتی۔

متعدد احادیث میں آتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے کثیر لوگوں کی شفاعت فرمائیں گے وہ ایسے ہی لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنی زندگی گناہوں اور نافرمانیوں میں گذاری ہوگی۔ جن حضرات نے پوری زندگی اطاعت اور فرمانبرداری میں گذاری انھیں شفاعت کی کیا حاجت ہوسکتی ہے۔ شفاعت کی احتیاج تو انھیں ہی محسوس ہوگی جنکے پاس ایمان کی دولت تو ہوگی لیکن اعمال صالحہ کی دولت ان کے پاس نا موجود یا برائے نام ہوگی۔

آپ کا خوشنما نظریہ ان فرقوں کے نظریات کی تائید کر رہا ہے جن کی ضلالت اور گمراہی دو اور دو چار کی طرح واضح ہے اور جن کا شمار بالاتفاق ان فرقوں میں ہوتا ہے جو راہ مستقیم سے بھٹک کر ان راہوں پر جا پڑے جن راہوں سے واپس آنا بھی ممکن نہیں ہوتا الّا یہ کہ پروردگار کسی پر اپنا کرم فرمادیں۔

یہ کہنا بھی جہالت ہی کا مظہر ہوسکتا ہے کہ مومن کی قسمیں نہیں ہوا کرتیں۔ مومن سب یکساں، صاف اور ایک سی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں کوئی طبقہ، کوئی جماعت ایسی نہیں پائی جاتی جو تین چار درجوں میں منقسم نہ ہوجاتی ہو۔ دنیا کے ہر ہر طبقہ اور ہر ہر جماعت میں بالعموم یہ پانچ درجے پائے جاتے ہیں۔ اعلیٰ، اعلیٰ ترین، ادنیٰ، ادنیٰ ترین اور متوسط

یہ درجات حیوانوں میں بدستور نظر آتے ہیں۔ بعض جانور نسلی اعتبار سے اعلیٰ کہلاتے ہیں۔ بعض کا شمار اعلیٰ ترین میں ہوتا ہے۔ بعض درمیانی حیثیت کے ہوتے ہیں نہ بہت زیادہ اچھے اور نہ بہت زیادہ برے۔ بعض درمیانی درجہ سے ذرا فروتر ہوتے ہیں اور بعض بالکل کنڈم۔

یہی فرق درجات انسانوں میں بھی پایا جاتا ہے اور یہی فرق مراتب کافروں اور مسلمانوں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ کفار بھی سب ایک جیسے نہیں ہوتے ان کی فطرتیں اور انکا کفر بھی ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں سزائیں بھی ایک دوسرے سے جداگانہ دی جائیں گی۔ بعض کافروں کو ہولناک اور سخت ترین قسم کے عذاب بھگتنے پڑیں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے کفر میں انتہائی شدید اور اسلام کے حق میں انتہائی معاند اور متعصب تھے۔ بعض کافروں کو معمولی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے کفر کی راہیں تو ضرور اختیار کر رکھی تھیں لیکن ان کا کفر اس درجہ کا نہیں تھا کہ اسے اس کفر سے تعبیر کیا جاسکے جو ہر وقت اسلام کو گزند پہنچانے کی جدّوجہد میں لگا رہتا ہو۔

جب کافروں میں فرق درجات اور نوع بہ نوع قسم کے لوگ نظر آتے ہیں پھر مسلمانوں میں یہ درجہ بندی کا سلسلہ کیوں نہیں ہوگا۔ دنیا بھر کے تمام مسلمان ایک سی فطرت اور ایک جیسے کردار و اطوار کے کیسے ہوسکتے ہیں مسلمانوں میں بھی عموماً پانچ قسم کے حضرات دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک وہ جو کبھی دانستہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ بغیر کسی عذر کے کوئی ایسی عبادت ترک نہیں کرتے جسے اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے فرض قرار دیا ہو۔ یہ حضرات صرف منہیات ہی سے نہیں مشتبہات سے بھی احتراز کرتے ہیں اور صرف فرائض و واجبات ہی کے پابند نہیں بلکہ ان عبادتوں کا بھی اہتمام کرتے ہیں جنھیں

مستحبات کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے۔ ان حضرات پر اعلیٰ ترین مسلمان کا اطلاق ہوتا ہے۔

بعض حضرات گناہوں سے بھی دامن بچاتے ہیں اور احکامات کی تعمیل بھی کرتے ہیں لیکن ان افعال کا اہتمام نہیں کر پاتے جنھیں مستحب کہا جاتا ہے۔ ان کے اندر پرہیزگاری بھی اس درجہ کی نہیں ہوتی جس درجہ کی پرہیزگاری اول الذکر مسلمانوں میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ان پر اعلیٰ ترین کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا البتہ انھیں اعلیٰ قسم کے مسلمان سے ضرور تعبیر کیا جائے گا۔

متوسط درجے کے مسلمان وہ ہوتے ہیں کہ جو عبادات سے بھی پہلوتہی نہیں کرتے اور نافرمانیوں سے بھی۔ پابندی کے ساتھ نماز پڑھیں گے اور پابندی کے ساتھ سینما بھی دیکھیں گے۔ جتنے اہتمام کے ساتھ قرآن کی تلاوت ہوگی، رمضان کے روزے ہوں گے اتنے ہی اہتمام کے ساتھ جھوٹ بھی چلے گا، غیبت بھی ہوگی اور دوسری ہزاروں برائیاں بھی پابندی کے ساتھ جاری و ساری رہیں گی اور ادنیٰ درجہ کے مسلمان وہ کہلاتے ہیں جو نہ عبادات کی طرف راغب ہوتے ہیں اور نہ گناہوں کی ایسے لوگ اپنے ایمان میں تازگی اور طراوت پیدا کرنے کے لئے عید اور جمعہ کی نمازیں پڑھتے رہتے ہیں باقی سب ہڑپ۔

ادنیٰ ترین مسلمان وہ کہلاتے ہیں جو ہر وقت گناہوں میں ڈوبے رہتے ہیں اور جنھیں عبادت اور اطاعت کی کبھی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی کچھ اور قسمیں ہوتی ہوں۔ لیکن بہرحال ان پانچ قسموں کو پیش نظر رکھ کر یہ تو ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ مسلمانوں میں مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں یہ دعویٰ کرنا کہ مومن کی قسمیں نہیں ہوتیں غیر سمجھداری اور لاعلمی کی بات ہے۔

مذکورہ بالا تمام حضرات مسلمین میں شمار کئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر طبقہ دل کی گہرائی سے خدا کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قائل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے افعال و اعمال ایک دوسرے سے متفاوت ہوں۔

قرآن حکیم سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اہل ایمان اختلاف اعمال کی وجہ سے مختلف قسموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ سورہ احزاب میں فرمایا جاتا ہے

ان المسلمین و	مسلمان مرد مسلمان عورتیں
المسلمات والمومنین	مومن مرد مومن عورتیں۔
والمومنات والقنتین	عبادت گزار مرد عبادت
والقٰنِتٰتِ۔	گزار عورتیں۔

دیکھیے درجات و مراتب بالکل صاف ظاہر ہو رہے ہیں۔ اگر مسلمین، مومنین اور متقین ایک ہی ہوتے تو اس طرح الگ الگ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

کچھ اور ایسے دلائل و براہین پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے صاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مختلف مراتب کے لوگ ہوتے ہیں اور حساب و کتاب کے بعد اعمال و افعال کی مناسبت سے مختلف قسم کی جزائیں اور انعامات انھیں عطا کی جائیں گی۔ تمام مسلمانوں کو ایک سا انعام اور ایک سا صلہ نہیں ملیگا۔

بہرحال دلائل اور بھی پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن قرآن کی اس دلیل اور نظیر کے ہوتے ہوئے دوسرے دلائل اور نظائر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

آپ تو خیر سے ڈاکٹر ہیں۔ آپ بات کی گہرائی تک کیوں نہیں پہونچ پا رہے ہیں۔ ایک موٹی سی بات ہے کہ ضعف اور کمزوری انسانی بدن کو فنا نہیں کر دیتی بس ان اعضاء میں اضمحلال پیدا کر دیتی ہے جو عموماً طور پر قوی ہوا کرتے ہیں۔

کیا آپ ان تمام حضرات کے وجود کا انکار کر دیتے

ہیں جو بیماریوں کا شکار رہیں۔ صحت اور عدم صحت، قوت اور نقاہت ایک الگ چیز ہے لیکن امراض اور تسلسل امراض کی وجہ سے اگر وجود جسمانی کا انکار صحیح برصواب نہیں ہوتا تو معصیتوں اور بداعمالیوں کی بناپر وجود ایمانی کا انکار عقل و شعور کی کسوٹی پر کیسے صحیح ثابت ہو سکتا ہے۔

گاندھی جی کی مثال دینا یہاں کسی صورت درست نہیں ہوگا اس لئے کہ گاندھی جی نے کھلے عام کب کلمہ پڑھا تھا اور کب یہ اعتراف کیا تھا کہ میں نے اسلام قبول کر چکا ہوں اور مجھے مرنے کے بعد اسلامی تعلیمات کے مطابق دفن کیا جائے۔

ایک شخص اگر زندگی بھر قرآن کی تلاوت کرتا رہے لیکن اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف ایک بار بھی نہ کرے تو اسے مسلمان کہنا اور مسلمان سمجھنا جائز نہیں ہو سکتا اُخروی طور پر ایسے شخص کا مقام اُن مسلمانوں سے پست ہی رہے گا جو زندگی میں بداعمالیوں کا شکار رہے ہوں لیکن انھوں نے دل کی گہرائی سے اسلام قبول کر لیا ہو اور خود کو مسلمانوں میں شمار کرتے رہے ہوں۔

کیا دنیا کا بدسے بدتر مسلمان یہ گوارا کر سکتا ہے کہ مرنے کے بعد اسے غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کر دیا جائے۔ اس کی نماز جنازہ بھی نہ ہو اسے اسلامی شعار کے مطابق کفن بھی نہ پہنایا جائے۔

اور کیا گاندھی جی نے کبھی اس بات کی خواہش ظاہر کی تھی کہ انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ دی جائے اور ان کی تدفین و تکفین خالص اسلامی شعار کے مطابق ہو۔

ظاہر ہے کہ گاندھی جی نے ایسی خواہش کا کبھی اظہار نہیں کیا لہٰذا انھیں لمحہ بھر کے لئے مسلمان کہنا جائز نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک اسلام سے متأثر ہونے کا معاملہ ہے تو ہزاروں فلاسفر آپ کو ایسے نظر آجائیں گے جو اسلام سے صرف متأثر نہیں بلکہ اکثر اسلامی تعلیمات کی مدحت بیان کرتے رہے ہیں اور صرف اسلامی ہی قانون کو قابل نفاذ خیال کرتے رہے ہیں جیسی مثال گرو نانک کی ہے انھوں نے وقتاً فوقتاً اسلامی احکامات کی تعریف کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے پیروکاروں کو جو نصیحتیں انھوں نے کیں وہ قرآن و احادیث سے ماخوذ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی بھی صحیح العقیدہ عالم نے گرو نانک کو مسلمان گمان نہیں کیا۔ اسلام سے متأثر ہونا، اسلام کو برحق سمجھنا، اسلام کا مدّاح ہونا اس بات کی علامت نہیں ہے کہ آدمی مسلمان ہوگیا۔

دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے شرط اول یہ ہے کہ آدمی کھلے عام کلمہ پڑھے اور اسلام میں داخل ہونے کا اعتراف کرے۔ اس اعتراف کے بغیر اگر کوئی شخص ہزار بار بھی قرآن کی آیت پڑھ ڈالے تو اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں اور اس کے نامۂ اعمال سے کفر و شرک کی سیاہی کو نہیں دھو سکتیں۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ اعمال ایمان کا جُز نہیں ہوتے۔ بداعمالیاں صحت ایمان پر تو اثر انداز ہوا کرتی ہیں لیکن وجود ایمان پر اثر انداز نہیں ہوا کرتیں۔ ایمان کا وجود بہرحال باقی رہتا ہے اور جب تک ایمان کا وجود اور ایمان کی ہلکی سی رمق بھی باقی ہے اس وقت تک آدمی کو مسلمان ہی گمان کیا جائے گا اور مرنے کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے مسلمانوں کے گورستان میں دفن کیا جائے گا۔

ایمان و عمل سے متعلق اگر تفصیلات اور تحقیقات دیکھنے کی خواہش ہو تو تجلی کا ایمان نمبر ملاحظہ فرمائیے جو آج بھی ادارہ تجلی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

آپ نے دو چار غیر محتاط مولویوں کی حرکات دیکھ کر تمام علمائے کرام پر جو سنگ باشی کی ہے اور ظلم و ستم کے زہر میں ڈوبے ہوئے جو تیر چلائے ہیں اسے ناانصافی، جبر اور تشدد کے ماسوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

آپ ماشاء اللہ ڈاکٹر ہیں۔ ممکن ہے کہ بہ اکرداد بھی ہوں

(باقی برصفحہ ۱۰۵)

(۲)

کیا قربانی حضرت اسحاق کی دی گئی تھی یا حضرت اسماعیل کی ۔۔۔؟

جیسا کہ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں، بنی اسرائیل کی یہ عادت رہی ہے کہ ہر قابلِ فخر بات کو وہ اپنی نسل کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور دوسری نسلوں کے لئے ان کے ہاں یا تو جھوٹے الزامات ہیں یا پھر کم از کم یہ کہ جو فخر ان کو حاصل ہوا سے چھین کر اپنے حساب میں لکھ لیں اسی عادت کے مطابق بیٹے کی قربانی کے اس واقعہ کو بھی انہوں نے حضرت اسماعیل کے بجائے حضرت اسحاق کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بائبل کا بیان ہے :۔

"خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابرہام .... تو اپنے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے، ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا" (پیدائش باب ۲۲۔ فقرات ۱-۲)

اس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق ؑ کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اکلوتے تھے۔ حالانکہ خود بائبل کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحاق ؑ اکلوتے نہ تھے۔ اس کے لئے ذرا بائبل ہی کی حسبِ ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں :۔

"اور ابرہام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور ساری نے ابرہام سے کہا "کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے۔ سو تو میری لونڈی کے پاس جا۔ شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرہام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے ہوئے دس سال گذر گئے تھے۔ تب

اس کی بیوی ساری نے مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے۔ اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی" (پیدائش ۱۶-۱-۳)

خدا کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام اسمٰعیل رکھنا"۔ (پیدائش - ۱۶ - ۱۱)

"جب ابرہام سے ہاجرہ کو اسماعیل پیدا ہوا تب ابرہام چھیاسی برس کا تھا" (پیدائش ۱۶: ۱۶)

"اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے ...... اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا ...... تو اس کا نام اضحاق رکھنا ...... جو اگلے سال اسی وقت معین پر سارا سے پیدا ہوگا ...... تب ابرام نے اپنے بیٹے اسماعیل اور گھر کے سب مردوں کو لیا اور اسی روز خدا کے حکم کے مطابق ان کا ختنہ کیا۔ ابرام ننانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا۔ اور جب اسماعیل کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا" (پیدائش ۱۷ - ۱۵ - ۲۵)

"اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرام سو برس کا تھا" (پیدائش ۲۱: ۵)

اس سے بائبل کی تضاد بیانی صاف کھل جاتی ہے ظاہر ہے کہ ۱۴ برس تک تنہا حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحاق کی نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی تھی۔ کیونکہ وہی اکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحاق کی قربانی مانگی گئی تھی تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں تو ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔

مفسرین نے صحابہؓ و تابعین کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے۔ اور اس گروہ میں حسب ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں:

حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ۔ قتادہؒ۔ عکرمہ۔ حسن بصری۔ سعید بن جبیر۔ مجاہد۔ شعبی۔ مسروق۔ مکحول۔ زہری۔ عطاء۔ مقاتل۔ سُدّی۔ کعب احبار۔ زید بن اسلم وغیرہ۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیل تھے اور اس گروہ میں حسب ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ۔ حضرت معاویہؓ۔ عکرمہ۔ مجاہد۔ یوسف بن مہران۔ حسن بصری۔ محمد بن کعب القرظی۔ شعبی۔ سعید بن المسیب۔ ضحاک۔ محمد بن علی بن حسین (امام محمد الباقر) ربیع بن انس۔ احمد بن حنبل وغیرہم۔

ان دونوں فہرستوں کا تقابل کیا جائے تو متعدد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے عکرمہ یہ قول کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے۔ مگر انہی سے عطاء بن ابی رباحؒ یہ بات نقل کرتے ہیں کہ "یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحاق تھے۔ مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں"۔

اسی طرح حضرت حسن بصری سے ایک روایت ہے کہ وہ حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کے قائل تھے۔ مگر عمرو بن عبید کہتے تھے کہ حسن بصری کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔

اس اختلاف روایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء اسلام میں سے بعض پورے جزم و وثوق کے ساتھ حضرت اسحاق کے حق میں رائے دیتے ہیں۔ مثلاً ابن جریر اور قاضی عیاض۔ اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل ہی تھے۔ مثلاً ابن کثیر۔ اور بعض مذبذب ہیں۔ مثلاً جلال الدین سیوطی۔ لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے

دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک و شبہ سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیل ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) سورۂ صافات میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے ایک صالح بیٹے کی دعا کی تھی، اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حلیم (بُردبار) لڑکے کی بشارت دی تھی۔ فحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ دعا اس وقت کی گئی تھی جب آپ بے اولاد تھے اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی تھی وہ آپ کا پہلوٹا بچہ تھا پھر یہ بھی اسی سورہ کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم کے پہلوٹے صاحبزادے حضرت اسماعیل تھے۔ نہ کہ حضرت اسحاقؑ۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ:

الحمد للہ الّذی	شکر ہے اس خدا کا جس نے
وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ	بڑھاپے میں مجھ کو اسمٰعیل اور
وَإِسْحَاقَ ط (ابراہیم - ۳۹)	اسحاق عطا کئے۔

(۲) قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی گئی ہے وہاں ان کے لئے غلام علیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ ہیں (الذاریات آیت - ۲۸) اور لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ (الحجر ۵۳) مگر سورۂ صافات میں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اس کے لئے غلام حلیم (بردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی نمایاں صفات الگ الگ تھیں اور ذبح کا حکم غلام علیم کے لئے نہیں بلکہ غلام حلیم کے لئے تھا کیونکہ بیٹے کی قربانی کا واقعہ اسی بچے کے پیدا ہونے اور جوانی کے قریب پہنچنے کے بعد بیان کیا گیا ہے اور دوسرے بچے کی پیدائش کی بشارت اس کے بعد دی گئی ہے

(۳) قرآن مجید میں حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دیدی گئی تھی کہ ان کے ہاں یعقوب جیسا بیٹا پیدا ہوگا فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ (ہود - ۷۱)

اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر دی جا چکی ہو کہ اس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا اس کے متعلق اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اسے ذبح کر رہے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ کیونکہ اسے قربان کر دینے کے بعد اس کے ہاں بیٹے (یعنی حضرت یعقوب) کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علامہ ابن جریر اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحاق کے ہاں حضرت یعقوب پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کے قابل ہو گیا" تب یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھیگا اسکے سامنے آٹھ یا دس یا حد سے حد ۱۲-۱۳ برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان اور صاحب اولاد بیٹے کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہوں گے۔

(۴) اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ "ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا۔ بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی۔ پھر جب وہ باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا، پھر جب حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تب ان کو ایک اور بیٹے اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیب واقعات قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحاقؓ نہ تھے بلکہ وہ ان سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابن جریر اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ پہلے حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لئے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ ان کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب

سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس سلسلۂ کلام میں یوں نہ فرماتا "کہ ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے"۔ بلکہ یوں فرماتا کہ "ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمہارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے"۔

(۵) معتبر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے فدیہ میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا اس کے سینگ خانۂ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں حجاج بن یوسف نے حرم میں ابن زبیر کا محاصرہ کیا اور خانہ کعبہ کو مسمار کر دیا تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابن عباس اور عامر شعبی دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے خانہ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں (ابن کثیر)

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اسی لئے تو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے تعمیر کردہ خانہ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

(۶) یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منیٰ میں پیش آیا تھا۔ اور یہ صرف روایت نہیں تھی بلکہ اس وقت سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مناسکِ حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آرہا تھا کہ اسی مقامِ منیٰ میں جا کر لوگ اسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی، جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے بھی اسی طریقہ کو جاری رکھا۔ حتیٰ کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار سال کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیل ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحاق۔ حضرت اسحاقؑ کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود امتِ مسلمہ میں حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کا خیال آخر کیسے پھیل گیا؟ یہودیوں نے اگر حضرت اسمٰعیل کو اس شرف سے محروم کر کے اپنے دادا حضرت اسحاق کی طرف اسے منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہ کثیر نے ان کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کر لیا؟ اس سوال کا بہت شافی جواب علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعبِ احبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب جب حضرت عمر کے زمانے میں مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کی قدیم کتابوں کے مندرجات ان کو سنایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ انھیں سن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے اور سب رطب و یابس جو وہ بیان کرتے تھے انھیں روایت کرنے لگے حالانکہ اس امت کو ان کے اس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی"۔

اس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قُرظی کی ایک روایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحاق تھے یا حضرت اسماعیلؑ۔ اس وقت ایک صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا "امیرالمومنین خدا کی قسم وہ اسماعیل ہی تھے۔ اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں، مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحاق تھے"۔ (ابن جریر)

ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پروپیگنڈا تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا۔ اور

مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں اس لئے ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالہ سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کرلیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصب کارفرما ہے۔
(تفہیم القرآن جلد چہارم۔ الصّٰفّٰت۔ حاشیہ ۶۷)

بنائے کعبہ

پہلے یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ زمزم کی برکت سے قبیلۂ جرہم کے مختلف خاندان آکر حضرت ہاجرہ و اسماعیل کے پاس بس گئے تھے اور مکہ ایک شہر بنتا جارہا تھا۔ یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت ہاجرہ کی ملنساری کی وجہ سے ان نوآباد کاروں کے ساتھ دونوں ماں بیٹوں کے تعلقات بہت اچھے ہوگئے تھے حضرت اسماعیلؑ انہی کے درمیان پلے بڑھے تھے اور جب وہ جوان ہوئے تو ان کے بہترین اخلاق اور عمدہ اوصاف کی وجہ سے جرہمیوں کی خود یہ خواہش تھی کہ ان کی شادی انہی کے ہاں ہو۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ پہلے ایک لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کو وہ بہو پسند نہ آئی اس لئے حضرت اسماعیلؑ نے اسے چھوڑ کر دوسری لڑکی سے شادی کی جسے حضرت ابراہیم نے پسند فرمایا اور اسی سے ان کے ہاں بارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ حضرت ہاجرہ کا انتقال بخاری کی اس روایت کے مطابق اپنے بیٹے کی پہلی شادی کے بعد ہی ہوچکا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اس اصل کام کے لئے مکہ تشریف لائے جس کی خاطر انہوں نے تیس برس پہلے اپنی ذُرّیت کے اس حصے کو اس بے آب و گیاہ وادی میں لاکر بسایا تھا۔ بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے اس میں آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ ایک روز زمزم کے پاس درخت کے نیچے حضرت اسماعیلؑ بیٹھے اپنے تیر بنا رہے تھے کہ یکایک حضرت ابراہیمؑ وہاں پہنچے۔ حضرت اسماعیل انھیں دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے اور دونوں باپ بیٹے اسی طرح ملے جس طرح بیٹے اپنے باپوں سے اور باپ اپنے بیٹوں سے ملا کرتے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اسماعیلؑ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ آپ کے رب نے جس کام کا حکم دیا ہے آپ اسے ضرور کریں۔ حضرت ابراہیم نے پوچھا تم اس میں میری مدد کروگے؟ انہوں نے کہا جی ہاں، میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے وادی کے اس حصہ کی طرف اشارہ کیا جو اپنے گردوپیش کی زمین سے کچھ اٹھا ہوا تھا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہاں ایک گھر بنانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھائیں۔ حضرت اسماعیلؑ پتھر لاتے اور حضرت ابراہیم ان کو نصب کرتے جاتے۔ جب دیواریں کافی بلند ہوگئیں تو حضرت ابراہیمؑ وہ پتھر اٹھا لائے جو مقام ابراہیمؑ کے نام سے مشہور رہے اور حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر پتھر نصب کرنے شروع کر دیئے اور دیواروں کو مزید بلند کر دیا۔
(اضافہ از مؤلف)

عرب اور پوری دنیا میں کعبہ کی حیثیت

یہ عمارت محض ایک عبادت گاہ ہی نہ تھی، جیسے مسجدیں ہوا کرتی ہیں، بلکہ اوّل روز ہی سے اس کو دین اسلام کی عالمگیر تحریک کا مرکز تبلیغ و اشاعت قرار دیا گیا تھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ایک خدا کو ماننے والے ہر جگہ سے کھنچ کھنچ کر یہاں جمع ہوا کریں، مل کر خدا کی عبادت کریں اور اسلام کا پیغام لے کر پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں۔ یہی اجتماع تھا جس کا نام "حج" رکھا گیا۔ اس کی پوری تفصیل کہ یہ مرکز کس طرح تعمیر ہوا، کن جذبات اور کن دعاؤں کے ساتھ دونوں باپ بیٹوں نے اس عمارت کی دیواریں اٹھائیں اور کیسے حج کی ابتدا ہوئی۔ قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:-

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر
لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا	کیا گیا وہی تھا جو مکہ میں تعمیر ہوا۔[1]

[1] واضح رہے کہ بیت المقدس خانہ کعبہ کے ایک ہزار برس بعد حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا، اس لئے کعبہ ہی وہ مرکز توحید ہے جو دنیا میں سب سے پہلے تعمیر کیا گیا (مؤلف)

وَهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ

برکت والا گھر اور سارے جہان والوں کے لئے مرکز ہدایت۔ اس میں اللہ کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ مقام ابراہیم ہے۔ اور جو کوئی اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کو امن مل جاتا ہے۔

\+ \+ × × ×

(آل عمران ۹۶-۹۷)

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ

کیا لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کیسا پر امن حرم بنایا ہے۔ حالانکہ اس کے گرد و پیش لوگ اچک لئے جاتے ہیں۔

(العنکبوت - ۶۷)

یعنی جب کہ عرب میں دو ہزار برس تک ہر طرف لوٹ مار قتل و غارتگری اور جنگ و جدال کا بازار گرم رہا۔ اس حرم میں ہمیشہ امن ہی رہا حتی کہ وحشی بدو تک اس کے حدود میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ پاتے تو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ...... وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لئے مرکز و مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے مقام عبادت کو جائے نماز بنا لو، اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو ہدایت کی کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھو، اور جب ابراہیمؑ نے دعا کی کہ پروردگار، اس جگہ کو ایک پُر امن شہر بنا دے اور یہاں کے باشندوں کو پھلوں کا رزق بہم پہنچا، جو بھی اُن میں سے اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والا ہو ...... اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار، ہماری اس کوشش کو قبول فرما، تو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے پروردگار، اور تو ہم دونوں کو اپنا مُسلم (اطاعت گذار) بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مُسلم ہو۔ اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر عنایت کی نظر رکھ کہ تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے، پروردگار، اور تو ان لوگوں میں انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول بھیجیو جو انھیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق درست کرے یقیناً تو بڑی قوت والا ہے اور بڑا حکیم ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔

(البقرہ ۱۲۵-۱۲۹)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ

اور جب کہ ابراہیم نے دعا کی کہ پروردگار، اس شہر کو پر امن شہر بنا دے اور مجھ کو اور میرے بچوں کو بت پرستی سے بچا، پروردگار، ان بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہ کیا ہے سو جو کوئی میرے طریقے کی پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میرے طریقے سے پھر جائے تو بیشک تو غفور اور رحیم ہے۔ پروردگا

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْکُرُوْنَ ۔

میں نے اپنی نسل کے ایک حصہ کو تیرے اس عزت والے گھر کے پاس اس بے آب و گیاہ وادی میں لا بسایا ہے تاکہ اے پروردگار یہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دلوں میں ایسا شوق ڈال کہ وہ ان کی طرف کھنچ کھنچ کر آئیں اور ان کو پھلوں سے رزق پہنچا۔ امید ہے کہ یہ شکر گزار بنیں گے۔

(ابراہیم ۳۵-۳۷)

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِکْ بِیْ شَیْئًا وَّطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ فَکُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ ۔

اور جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر کی جگہ مقرر کی اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی کو میرے ساتھ شریک نہ کرنا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھنا اور (حکم دیا کہ) لوگوں میں حج کی عام منادی کر دو کہ تمہارے پاس آئیں خواہ پیدل آئیں یا ہر دور دراز مقام سے دبلی اونٹنیوں پر آئیں تاکہ یہاں آکر دیکھیں کہ ان کے لئے کیسے کیسے (دینی و دنیوی) منافع ہیں اور ان چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں۔ اللہ کا نام لیں (یعنی قربانی کریں) اور اس میں سے خود بھی کھائیں اور تنگ دست و محتاج لوگوں کو بھی کھلائیں۔"

(الحج - ۲۶ - ۲۸)

(خطبات صفحہ ۲۶۵ تا ۲۶۷)

عہدِ جاہلیت میں کعبہ کی برکات

عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عمرے کے لئے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہو جاتا تھا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے۔ شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں[1] کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا۔ بس یہی زمانہ ایسا تھا جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے قلادوں کی موجودگی سے اس نقل و حرکت میں بڑی مدد ملتی تھی۔ کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹے پڑے ہوتے انہیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ المائدہ۔ حاشیہ ۱۱۳)

---

[1] حرام مہینوں سے مراد ہیں رجب عمرے کے لئے، اور ذی القعدہ ذی الحجہ اور محرم حج کے لئے۔ ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں۔ اور حج و عمرے کے لئے جانے والوں کو راستے میں کوئی نہ چھیڑ سکتا تھا (مؤلف)

تاریخ نے پوچھا

از
نعیم صدیقی

تاریخ نے پوچھا اے لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے
شاہی نے کہا —— یہ میری ہے
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر تخت بچھے، ایوان سجے، گھڑیال بجے، دربار لگے
تلوار چلی اور خون بہے! انسان لڑے، انسان مرے
دنیا نے بالآخر شاہی کو
پہچان لیا، پہچان لیا

☆

تاریخ نے پوچھا پھر لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
دولت نے کہا —— یہ میری ہے
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر بنک کھلے، بازار جمے، بیوپار بڑھے
انسان لٹے، انسان بکے، آرام لٹے، سب چیخ اٹھے
دنیا نے بالآخر دولت کو
پہچان لیا پہچان لیا

☆

تاریخ نے پوچھا پھر لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
محنت نے کہا —— یہ میری ہے
پھر روح دبی، پھر پیٹ بڑھے، افکار بڑھے، کردار گرے
ایمان لٹے، اخلاق جلے، انسان نرے حیوان بنے
دنیا نے بالآخر محنت کو
پہچان لیا، پہچان لیا

☆

تاریخ نے پوچھا پھر لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے
مومن نے کہا —— اللہ کی ہے
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر قلب و نظر کی صبح ہوئی، اک نور کی ندّی پھوٹ پڑی
ایک ایک خودی کی آنکھ کھلی، فطرت کی صدا پھر گونج اٹھی
دنیا نے بالآخر آقا کو
پہچان لیا، پہچان لیا

☆

از ندیم الواجدی

نہیں ہوا جس کا خدشہ تھا۔ اور جو دیر، خدا ہی کم فہم اور بے عقل لوگوں سے جس کی توقع کی جارہی تھی مسلمانوں کے جذبات، خواہشات مسلسل مطالبوں اور لگاتار درخواستوں، احتجاجوں کے علی الرغم اس ناپاک، متعفن اور گھناؤنے منصوبے کو روبہ عمل لانے کی کوششیں مکمل کرلی گئی ہیں جو پورے عالم اسلام کے لئے انتہائی دل گداز تکلیف دہ اور اضطراب انگیز ہی نہیں بلکہ اس اعتبار سے رسوا کن بھی ہے کہ یہ سب کچھ ایک مسلمان مملکت کی ایما پر ہو رہا۔ وہ مملکت بھی ایسی جو اب سے کچھ پہلے تک اپنے دینی شعور، غیرت اور حمیت کے لئے پوری دنیا میں مشہور ہو چکی تھی۔

اسلام نے تصویر کشی کرنا جائز فعل قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے فلم سازی کی ہمت افزائی نہیں کی جاسکتی اور پھر فلم بھی ان قدسی صفات اور پاک باطن انسانوں کی جو ہمارے لئے اسوہ تھے اور جن سے ہدایت و یقین کی لازوال روشنی ہم تک پہنچی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقائے کرام کا تقدس اور بے داغ پاک و صاف زندگیوں کے ساتھ یہ ناپاک کھلواڑ، یہ دلگداز جارحانہ مذاق انتہائی مذمت کے قابل ہے۔

یہ فلم جس کا نام دی میسنجر آف گاڈ (محمد رسول اللہ) ہے ایک ڈیڑھ برس قبل شروع کی گئی تھی۔ ابتدا میں چار عرب ملکوں کویت، بحرین، لیبیا اور مراکش نے انٹرنیشنل پروڈکشن کے ذریعہ اس فلم کی تیاری کا منصوبہ بنایا تھا جس کے لئے ۶۰ لاکھ ڈالر کا ابتدائی سرمایہ بھی فراہم کرلیا گیا تھا۔ مگر فلم کی منصوبہ بندی اور اس کے اسکرین پلے کی تیاری پر پورے تین برس صرف ہوئے اور اس کے بعد جب اس کی شوٹنگ مراکش میں شروع ہوئی تو سعودی عرب کی غیور حکومت نے اپنے وسیع اثر و رسوخ سے کام لے کر یہ شوٹنگ رکوا دی۔ مگر تھوڑا ہی وہ فلمی یونٹ جسے مراکش کی حکومت نے اپنے یہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیبیا کی دعوت پر کرنل قذافی کا مہمان بن گیا اور مراکش کے بجائے اس فلم کے پروڈیوسر مصطفےٰ عقاد نے اپنی ناپاک سازشوں کو بروئے کار لانے کے لئے طرابلس کو منتخب کیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں اسلامی نظام کے عملی مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں لیبیا نے اپنے مہمانوں کی میزبانی کا پورا حق ادا کیا۔ مسلمانوں کے مسلسل اصرار کے باوجود اس کے موقف میں لچک نہ آئی اس نے اپنے مہمانوں کو تمام ضروری سہولتیں بہم پہنچائیں

اور ہر طرح کے تعاون سے انھیں نوازا۔ جنگی مناظر فلمانے کے لئے اپنے فوجیوں کی خدمات وقف کیں اور مکے اور مدینے کے سیٹ تیار کرنے کے لئے وسیع صحرا پیش کئے۔ اس طرح دو کروڑ کی لاگت سے تیار ہونے والی یہ فلم بن کر مکمل ہو گئی۔

یہ فلم اگرچہ مسلمان ملکوں کے تعاون اور بعض مسلمان افراد کے ذاتی شوق و عقیدت کا مظہر دکھائی دیتی ہے مگر حقیقت میں یہ بھی اسلام دشمن سازشوں ہی کی ایک کڑی ہے جسکو تاریخی تسلسل حاصل ہے۔ اس فلم کے موسیقار ماریس جارے ہیں۔ کہانی ایم۔ اے۔ ایل گوبرگ نے لکھی ہے۔ اور کلیدی رول کرنے والوں میں انتھونی کوئین اور ایرینے پاپاس کا نام شامل ہے۔ آجکل اس فلم کی ریڈٹنگ لندن میں ہو رہی ہے۔ دسمبر میں اسے لاس اینجلز میں ریلیز کیا جائے گا تاکہ روس کے مقابلہ میں بھی اسے شامل کیا جا سکے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کی کہانی کی سطر سطر علماء نے پڑھی ہے اور اس کی تصدیق کی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی تصویر کشی نہیں ہے مگر یہ سب لغو اور باطل دلیلیں ہیں۔ اس طرح کی باتوں سے اس ناپاک منصوبے کی سمیت میں تخفیف نہیں ہو جاتی۔ علمائے ہندوستان ہی کے نہیں جامعہ ازہر اور رابطۂ عالم اسلامی کے علماء نے بھی مسئلہ کی حقیقت بالکل واضح کر دی ہے اس وضاحت سے سلیم الفطرت اور دینی مزاج رکھنے والی طبیعتیں مطمئن ہو سکتی ہیں۔ مگر جن لوگوں کی فطرتیں مسخ ہو گئی ہوں اور جن سے غلط و صحیح اور باطل و حق اور حرام و حلال میں تمیز کرنے کا سلیقہ سلب کر لیا گیا ہو ان سے نہ اس کی توقع تھی کہ وہ ان وضاحتوں پر کان دھریں گے اور نہ ہی اب امید ہے کہ وہ اپنے اس فعل پر شرمندہ ہوں گے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

عالم اسلام میں سیاسی بیداری کی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مسلم ممالک کے اتحاد کا جو خواب دیکھا جاتا رہا ہے وہ اب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔ عالم اسلام کے اتحاد اور مسلم ممالک کے وسیع تر وسائل کے صحیح مصرف کی دریافت کا سہرا شاہ فیصل مرحوم کے سر ہے۔ انھوں نے اپنی سیاسی بصیرت دینی شعور اور اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کی بنا پر عالم اسلام کے وجود کی اہمیت اور قدر و قیمت محسوس کر لی تھی۔ اتحاد اور آپس کے اختلافات کو بھلا کر مشترکہ مسائل کے لئے مشترک جد و جہد کے لئے شاہ فیصل کی دعوت کے پس منظر میں یہی احساس کام کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اسلامی کانفرنس کی خدمات بھی قابل قدر ہیں۔ مسلم ممالک کی شیرازہ بندی انکی ان کی منتشر قوتوں کو سمیٹنے۔ مشترک مسائل کے سلسلہ میں انھیں قریب لانے اور ان کی صفوں کی برہمی دور کرنے میں اسلامی کانفرنس نے بڑا موثر، بڑا اہم اور بنیادی رول ادا کیا ہے یہ کانفرنس جس کا اجلاس ابھی پچھلے دنوں جدہ میں ہوا ہے اہم مسلم ممالک پر مشترک ہے۔ اگر نو آزاد مسلم ملکوں کا عدد بھی ان میں شامل کر لیا جائے جو اب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں آزاد ممبروں کی حیثیت سے داخل ہوں گے تو یہ تعداد ۴۵ سے تجاوز کر جائے گی۔

۴۵ ملکوں کی اس طاقت ور تنظیم نے اپنی مختصر مدت حیات میں بڑے اہم اور مفید کام کئے ہیں۔

سب سے اہم کارنامہ جو اسلامی کانفرنس نے انجام دیا وہ یہی اتحاد ہے جس کے عملی مظاہر آئے دن دیکھنے کو ملتے ہیں وہ مسلم ممالک جو اب تک آپس کے مسائل، آپس کے اختلافات کو اہمیت دیتے رہے تھے ان سے کہیں بڑے مقاصد کے لئے متحد نظر آنے لگے ہیں۔ اس کانفرنس کے اثرات کا اندازہ لوگوں کو اس وقت ہو گیا تھا جب لاہور کی سربراہ کانفرنس کے موقع پر اس نے شیخ مجیب الرحمن اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان ثالثی کا رول ادا کیا تھا اور شیخ مجیب الرحمن پاکستان کے ساتھ اپنے تمام اختلافات کو نظر انداز کر کے سربراہوں کی اس تاریخی کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور آئے تھے۔

معاشی اور اقتصادی سطح پر بھی اسلامی کانفرنس نے بڑا ٹھوس کام کیا ہے۔ ایک عالمی بنک کا قیام بلاشبہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ اس کے انتہائی مفید نتائج مرتب

ہوں گے اور مسلم ممالک کی پسماندگی دور کرنے اور انھیں ایک عالمی طاقت کی حیثیت سے سامنے لانے کے لئے اس کا وجود بڑا اہم ثابت ہوگا۔ اس بینک کا دائرہ اگرچہ اسلامی ممالک تک محدود رہے گا مگر اس سے دوسرے ترقی پذیر ممالک بھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ یہ بینک اُن ملکوں کی فلاحی اسکیموں کے لئے سرمایہ فراہم کرے گا اور ضرورت کے وقت انھیں غیر مشروط مدد بھی دے گا اس طرح ان ممالک کو بڑی طاقتوں کے سیاسی تفوذ سے نجات بھی حاصل ہو جائے گی۔ اسلامی بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی کے قیام کا منصوبہ اور دوسری فلاحی اسکیمیں آنے والی دنیا میں مسلم ممالک کی پوری طرح نشاندہی کرتی ہیں۔

جدہ میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس نے اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا ہے کہ اسلامی کانفرنس کو اس عالمی ادارہ میں مشاہدہ و مبصر کی حیثیت سے شرکت کی اجازت دی جائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مطالبہ اقوام متحدہ کے اگلے اجلاس کے لئے تیار ہونے والے ایجنڈے میں شامل کیا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اقوام متحدہ میں مغربی بلاک، مشرقی بلاک اور ناوابستہ ممالک کے بلاک کے ساتھ ساتھ ایک اور بلاک بھی قائم ہو جائے گا جسے مسلم بلاک کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک معقول مطالبہ ہے اور عالمی سیاست کے لئے بڑا اہم اور مفید بھی۔ اگر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اس مطالبے کو منظوری دیدیتی ہے تو یہ پوری دنیا کے لئے اچھا شگون ہوگا۔ مسلم ممالک ایک وزن رکھتے ہیں مجوزہ بلاک عالمی مسائل کے سلسلہ میں بڑا مؤثر رول ادا کر سکتا ہے

ستمبر کا پہلا ہفتہ مشرق وسطیٰ کی سیاست کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مصر اور اسرائیل کے عبوری معاہدے پر اگرچہ مسٹر انور سادات اور مسٹر رابین نے اطمینان کا اظہار کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے صدر سادات کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ مسٹر کیسنجر کو اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے میں کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اسرائیل میں اگرچہ اس معاہدے کی طرف سے بے اعتمادی کا اظہار کھلے بندوں کیا جا رہا ہے۔ موشے دایان تو مخالف ہی رہے ہیں۔ اسرائیل کے بعض انتہا پسند مذہبی تنظیموں نے بھی اس معاہدے کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ مگر اسرائیل کے لئے یہ کافی ہے۔ کہ اس نے کچھ کھو کر کچھ پا لیا ہے۔ اس معاہدے کے نتیجہ میں اسے کیا ملا؟ اس سلسلہ میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہاں اگر معاہدے پر عمل ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسرائیل کے لئے مصر کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا ہے اور وہ اب آسانی کے ساتھ مشرق وسطیٰ میں اپنے پاؤں جما سکتا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں ایک زبردست سیاسی ہلچل کا احساس کیا جا رہا ہے۔ اس ہلچل کو عرب دنیا میں اختلاف یا انتشار سے تعبیر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ تاہم بعض ملکوں کی جھنجھلاہٹ صاف ظاہر ہے۔ بعض انتہا پسندوں نے تو یہاں تک سوچنا شروع کر دیا ہے کہ ۱۹۷۳ء کی جنگ نے جو اتحاد قائم کر دیا تھا وہ اس معاہدے سے پاش پاش ہو گیا ہے یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں صرف مصر کا علاقہ ہی ہاتھ سے نہیں گیا تھا بلکہ شام اور اردن کے علاقے بھی اسرائیل کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ مصر نے شام اور اردن کو نظر انداز کر کے جس معاہدے پر دستخط کئے ہیں وہ مصر کے حق میں کتنا بھی مفید اور صحیح ہو مگر اس سے دونوں ملکوں کا ناخوش ہونا بالکل فطری ردعمل ہے۔

عراق کے نائب صدر مسٹر صدام حسین نے بھی اس معاہدے پر بے اطمینانی اور بڑی حد تک تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ معاہدہ اس علاقے میں امن کے استحکام کے لئے کارگر ثابت نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس سے فلسطینیوں کے حقوق بحال نہیں ہوتے۔ خود فلسطینیوں کی تنظیم پی۔ ایل۔ او نے بھی اس جنرل کی سمجھنے کو مسترد کر دیا ہے۔ دوسری طرف لیبیا کو مصر کے ساتھ اپنے پرانے اختلاف کے اظہار کا اچھا

اچھا موقع ہاتھ لگ گیا ہے اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں مصروف ہے۔ لیبیا کی طرف سے پی۔ ایل۔ او کو اپنی مکمل حمایت کا یقین بھی دلایا گیا ہے اس معاہدے کے تھوڑا بعد اردن اور شام کی مشترکہ تنظیم کا قیام بھی اسی بے اطمینانی کا مظہر ہے جو اس معاہدے سے عرب دنیا میں پیدا ہو گئی ہے۔

اگرچہ صدر سادات نے اس معاہدے کو مشرق وسطیٰ کی سیاست میں ایک زبردست موڑ سے تعبیر کیا ہے اور وہ اپنے نائب صدر کے عرب ممالک کے دورے پر روانہ کر رہے ہیں تاکہ وہ عرب دنیا کو اس معاہدے کی تفصیلات اور اس کے متوقع اثرات، نتائج اور عواقب سے مطلع کر سکیں۔ مگر سیاسی مبصرین کا خیال یہ بھی ہے کہ جس معاہدے کو انھوں نے سیاسی موڑ قرار دیا ہے وہ مشرق وسطیٰ کی سیاست کے لئے دھماکہ خیز بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

مصر کی طرف سے جو بے اطمینانی بعض عرب ملکوں میں پائی جا رہی ہے وہ اصل میں امریکہ کی پیدا کردہ ہے مسٹر سادات نے یہ اعلان کیا تھا کہ اس معاہدے میں خفیہ دفعات نہیں ہیں مگر امریکہ اور اسرائیل دونوں ہی نے خفیہ دفعات کی موجودگی کا اقرار کیا۔ وزیر خارجہ مسٹر کیسنجر نے وطن پہنچنے پر جو تفصیلات امریکن کانگریس کے لیڈروں کو بتلائیں اس میں یہ بات بھی شامل تھی۔ دوسری بات جو اس معاہدے میں کھٹکتی ہے وہ "نا جنگ اعلان" ہے جو معاہدے کی پہلی دفعہ میں موجود ہے۔ معاملات کے تصفیے سے پہلے ہی نا جنگ اعلان کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ عرب دنیا کے لئے یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اتنا بہر حال یقین ہے کہ اس سے مصر کو بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ سینائی کے بعض علاقوں سے اسرائیلی فوجوں کا انخلاء بڑا اہم ہے۔ اس طرح مصر کو وہ کنویں حاصل ہو جائیں گے جن کی پیداوار پر اس کی معیشت کا توازن قائم ہے۔ مگر مصر کے اس اقدام نے عرب عوام میں جو بے اعتمادی کی کیفیت پیدا کر دی ہے اس کے ازالے کے لئے مسٹر انور سادات کو پوری سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔

اگر مزار پہ سورج بھی لا کے رکھ دو گے
"اجل نصیب" نہ پائے گا روشنی کا سراغ
بھٹک رہے ہیں اندھیروں میں کارواں کتنے
جلا سکو تو جلاؤ صداقتوں کے چراغ

مولانا ماہر عثمانی

جب کوئی غلط کار انسان کسی مذموم مقصد کے حصول کی خاطر کسی پاکیزہ چیز کا سہارا لیتا ہے تو اس کے اس فعل کو محاورے کی زبان میں یوں کہا جاتا ہے "شیطان کتاب مقدس کا حوالہ پیش کر رہا ہے" ٹھیک اسی محاورے کے مصداق مذہب کے وہ بگڑے ہوئے شیدائی جو زرپرستی کے جنون میں سادہ لوح عوام کے نہایت سطحی جذبات سے کھیلنے کے لئے مذہبی سوانگ رچاتے ہیں، مذہبی ڈراموں کا انتظام کرتے ہیں اور کروڑوں اربوں پونڈ خرچ کر کے مذہبی فلمیں تیار کر کے اپنی توانائیاں کھپا رہے ہیں اور جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جو کام وہ سرانجام دے رہے ہیں اس کا مقصد صرف "دینی خدمت" ہی ہے اور یہی مقدس جذبہ ان کی ساری سرگرمیوں کا محرک و محور ہے۔ ان "خادمانِ مذہب" کی دینی خدمات کی نوعیت اس آبرو باختہ مغنیہ کے جذبۂ دینی کی سی ہے کہ جو یہ دیکھ کر کہ عوام کے دلوں میں محراب و منبر کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ ان پر خود قبضہ کر کے اور وہاں ناچ گانے کا دلچسپ پروگرام ترتیب دیکر معابد کو عوام کی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کرے۔

جس طرح پاکیزہ کھانا پاکیزہ برتنوں میں اور پاکیزہ آداب کے ساتھ ہی کھایا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح تبلیغ دین جیسا مقدس کام، مقدس عزم، مقدس ہاتھوں اور مقدس انداز ہی سے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ مسلمان بھی گمراہ قوموں کی نقالی میں تبلیغ دین کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرنے لگے ہیں جو مسلک شیطان کے پرچار کے لئے تو کارآمد ہو سکتے ہیں مگر اللہ کے دین کی اشاعت کے لئے کسی طرح بھی سودمند ثابت نہیں ہو سکتے۔ ان مختلف ذرائع میں ایک اہم ذریعہ فلم ہے۔ جو لوگ تفریح کے اس ناپاک کاروبار کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ شراب کی طرح یورپ کے تھکے ہارے مزدوروں جن سے یورپی کارخانوں میں جانوروں سے بھی زیادہ کام لیا جاتا تھا، کے اعصابی تناؤ کو دور کرنے کے لئے ایک مؤثر آلۂ کار کی حیثیت سے شروع ہوئی۔ دولت کے حریص کارخانہ داروں کو مزدوروں کے استحصال کے لئے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ انہیں شراب کا رسیا بنا دیا جائے تاکہ مدہوشی کے عالم میں وہ بیچارے اس بات سے بیخبر رہیں کہ انہیں کس قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے اور حیوانوں کی طرح کام کرتے کرتے جب ان کے اعصاب جواب دینے لگیں تو انہیں سستی تفریح کے ایسے مواقع فراہم کئے جائیں جن سے ان کے سفلی جذبات کی کسی حد تک تسکین ہو سکے

ظاہر ہے کہ یہ ناپاک دھندا وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے اندر کوئی اخلاقی حس موجود نہ ہو۔ چنانچہ اس مذموم کام کے لئے صرف ان لوگوں نے اپنی دولت صرف کرنے پر آمادگی ظاہر کی جو معاشرے کی اخلاقی اقدار کو تباہ کر کے اور انسان کو پورا حیوان بنا کر اس سے ہر طرح کے جائز فوائد حاصل کرنے کے درپے تھے اور اس ناپاک مقصد کے حصول کے لئے ایسے افراد کی تلاش شروع ہوئی جو عوام کے سفلی جذبات سے کھیل کر ان کی جیبیں خالی کرانے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ جو صنعت اس قسم کے ناپاک عزائم کے ساتھ شروع ہوئی ہو اور اس نوعیت کے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے دائرہ کار کو پھیلا رہی ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ اسے پاکیزہ مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی ابلہ فریبی ہے جس طرح کہ اسلام کا کوئی نادان دوست یہ سمجھ بیٹھے کہ مساجد کے اندر کلب کا ماحول پیدا کر کے عوام کو اللہ کے دین کا شیدائی بنایا جا سکتا ہے۔ اسے انسانیت کا ایک عظیم المیہ کہہ لیجئے کہ دور جدید میں اس نوعیت کی ابلہ فریبیوں کی ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں جن میں نمایاں مثال مذہبی فلموں کے ذریعہ دین حق کی تبلیغ کا دھندا ہے۔ چند سال سے یہ خبریں منظر عام پر آ رہی تھیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے ان کی پاکیزہ زندگی کو فلما کر عوام کے دلوں میں ان کی محبت و عظمت کا نقش ثبت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اب یہ روح فرسا اطلاع ملی ہے کہ بعض سر پھرے مسلمان عیسائیوں کی تبلیغ میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بارے میں فلم تیار کرنے کے بارے میں مصروف ہیں جو غالباً اس سال کے آخر تک نمائش کے لئے تیار ہو جائے گی۔

امریکہ میں مقیم ایک شامی کمیونسٹ مصطفےٰ العقاد اس فلم کا ہدایت کار ہے جس نے میکسیکن، اطالوی، ہنگرین، یونانی اور دیگر یورپی اداکاروں اور فنی ماہرین کی ایک بہت بڑی تعداد کو اس فلم کی تیاری پر لگا رکھا ہے۔ فلم کی کہانی چار مصری ناول نویسوں، توفیق الحکیم، محمد علی ماہر، عبد الحمید جودا اور عبد الرحمن شرقاوی نے مل کر لکھی ہے۔ پوشاک کی تیاری برطانوی نژاد مس ڈالیتی کے سپرد ہے، یہ وہ خاتون ہے جو اس سے قبل اسی نوعیت کی ایک فلم "لارنس آف عربیا" کے ملبوسات تیار کر کے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ مس ڈالٹن کو قبل از اسلام عرب شاعری کے ترجمے سے وہ کچھ نمونے بھی مہیا کئے گئے ہیں، تاکہ ان کی روشنی میں وہ اس دور کے لئے موزوں لباس تیار کروا سکے۔ فلم کی عکس بندی کا کام جیک ہل یارڈ کے ذمے ہے جو قدیم مناظر کو پیش کرنے میں بڑا ماہر خیال کیا جاتا ہے۔ اس فلم میں معروف اداکار ہیری کریگ بھی شامل ہے جس کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ اسے قرآن پاک کی کئی ایک سورتیں یاد ہیں اور اللہ کے کلام سے محبت کی وجہ سے جامعہ ازہر کے بعض علماء اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ایک لبنانی نوجوان منیر نے حضور کے چچا زاد بھائی سیدنا جعفر طیار رض کا کردار ادا کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابوسفیان رض اور ہندہ کے کردار ادا کرنے کے لئے بھی بعض لبنانی اداکاروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ حضرت حمزہ رض کا کردار میکسیکو کے ایک ایکٹر انتھونی کوئن نے ادا کیا ہے۔

اسلام کے ان "نادان دوستوں" نے شاید مسلمانوں کے ردعمل کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین میں سے کسی کا کوئی کردار شامل نہیں کیا۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مرحلہ پر وہ مسلمانوں کے احساسات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کی روشنی میں مستقبل کے لئے کوئی منصوبہ تیار کر سکیں۔ اگر مسلمانوں نے اس ناپاک جسارت کو ایک مرتبہ گوارا کر لیا اور مسلم عوام الناس نے اس "دینی خدمت" کی پذیرائی کی تو جلد ہی ایسی فلمیں تیار ہونی شروع ہو جائیں گی جن میں حضور سرور کائنات اور ان کے جلیل القدر اصحاب کے کردار کی عکاسی بھی ہو گی۔

موجودہ فلم کی تیاری پر دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے

پہلے مرحلے پر تو مراکش، لیبیا، کویت اور بحرین سب نے مل کر اس منصوبہ کو بڑی فیاضی کے ساتھ مالی امداد فراہم کی لیکن جب مسلمانوں کی طرف سے اس ناپسندیدہ کام پر سخت احتجاج ہوا تو لیبیا کے کرنل قذافی کے سوا باقی سارے لوگ اس کی امداد سے دستکش ہو گئے۔ اب یہ فلم کرنل صاحب کے مالی اور اخلاقی تعاون سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے جب فلم کی تیاری کا منصوبہ بنایا گیا تو اس وقت عام خیال یہی تھا کہ اس کے لئے مراکش کی سرزمین اور ماحول ہی بہتر ثابت ہوگا اور کام کا آغاز بھی اسی ملک میں ہوا لیکن جب وہاں کے عوام نے اس پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا تو وہاں سے اس کی بساط لپیٹ دی گئی۔ مگر لیبیا کے حکمران نے "اپنے جذبۂ دینی" کے تحت اسے طرابلس کی سرزمین میں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں تاکہ یہ جلد ہی پایۂ تکمیل تک پہونچ سکے۔ معلوم نہیں کرنل صاحب خواص و عوام کے شدید احتجاج کے بعد اس فلم میں کیوں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ لیکن عام روایت یہی ہے کہ اس فلم کے بعض حصے جب انھیں دکھلائے گئے تو وہ ان سے اس قدر متأثر ہوئے کہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ جو لوگ انسانی نفسیات سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مصنوعی منظر کو دیکھ کر خواہ وہ کتنا ہی تکلیف دہ ہو آبدیدہ ہو جانا ذہنی نابختگی اور سطحی جذباتیت کی دلیل ہوتی ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے بڑے طمطراق کے ساتھ جو مذہبی فلمیں تیار کی تھیں ان کے نتائج دیکھتے ہوئے فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد نے اس مشغلہ کو بے کار سمجھ کر ترک کر دیا ہے اور جن حضرات نے بڑے اخلاص کے ساتھ تبلیغ مذہب کے اس طریقہ کو اپنانے کی کوشش کی تھی وہ کثیر مقدار میں مال و دولت اور محنت کے زیاں اور تجربات کی کڑی آزمائشوں سے گذر کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فلم کے ذریعہ دین کی قطعًا کوئی خدمت نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے مذہب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ مذہبی فلموں کے بہت سے منصوبے جو بڑی محنت سے تیار کئے گئے تھے دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں۔ لیکن اپنے مسلم قوم کی بدقسمتی سمجھئے کہ اس کے بعض افراد ابھی نوعیت کے ناکام اور اخلاق سوز تجربات کر کے اللہ کے دین کو رسوا کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

فلموں کے بعض احمق شیدائی ابھی تک اس بات پر مصر ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے دین کی سربلندی کے لئے اسلامی فلمیں تیار کر کے دنیا کے سامنے کرنی چاہئیں تاکہ حق کا بول بالا ہو لیکن اس طرح کی بے مغز باتیں کرنے والے غالبًا فلم کے مضر اثرات سے یکسر ناآشنا نظر آتے ہیں۔ اسے محض اتفاق سمجھئے کہ جن دنوں یہ اشارات لکھے جا رہے تھے راقم الحروف کو ایسے کئی ایک "دردمندانِ ملّت" کے خیالات سننے کے مواقع حاصل ہوئے جو فلم کی وساطت سے اشاعتِ اسلام کا مقدس فرض سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ پیسے کمانے اور شغل کی غرض سے یہ دھندا کرنا چاہتے ہیں، ورنہ جہاں تک تبلیغ دین کا تعلق ہے وہ اس باب میں کوئی زیادہ پرامید نہیں۔ یہ سوال چونکہ ہم سے بارہا کیا جاتا ہے کہ ہم مذہبی فلموں کی کیوں مخالفت کرتے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں اس کا جواب بڑے اختصار کے ساتھ عرض کرتے ہیں۔

ہماری مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈرامہ اور فلم دونوں کی بنیاد نقالی پر ہے۔ کچھ لوگ جنھیں نقالی کے فن میں مہارت حاصل ہوتی ہے وہ چند کرداروں کی نقل کر کے اسے تماشائیوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ یہ فن ہے جو انسان کے نہایت ہی سطحی جذبات جن میں تفریح کا عنصر غالب ہوتا ہے کی تسکین کرتا ہے۔ اس لئے دینی نقطۂ نظر سے یہ مفید ہونے کے بجائے سخت نقصان دہ ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ داڑھی کی مسلم معاشرے میں جو عزت و توقیر ہے وہ کسی سے مخفی نہیں جس شخص کا

چہرہ داڑھی سے مزین ہو اس کے لئے دل میں جذبۂ احترام پیدا ہو جاتا ہے۔ اب ایک شخص آپ کے سامنے مصنوعی داڑھی لگا کر نمودار ہوتا ہے اور آپ کو اس بات کا علم بھی ہے کہ اس کے چہرے پر داڑھی کی سجاوٹ محض بناوٹ ہے تو کیا آپ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اس باریش شخص کے لئے اپنے دل میں کوئی جذبۂ احترام پیدا کر سکیں گے؟ احترام تو خیر بڑی بات ہے نقالی کی صورت میں تو اس دینی شعار کی تضحیک ہوگی۔ بالکل یہی ذہنی اور جذباتی کیفیت ان مقدس ہستیوں کے بارے میں پیدا ہوگی جن کے کرداروں کی نقالی عوام کے سامنے پیش کی جائے گی۔ بگڑے ہوئے اور آوارہ مزاج لوگ جب محض اداکاری کے ذریعہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی سیرت کے کچھ پہلوؤں کو تماشائیوں کے سامنے لائیں گے تو ظاہر بات ہے کہ یہ تماشائی ان کے فن اداکاری کی داد تو ضرور دیں گے مگر نیکی اور پرہیزگاری کی نقالی سے قطعاً متأثر نہ ہوں گے کیوں کہ جب کسی شخص کو معلوم ہو کہ پاکیزگی، خدا ترسی اور تعلق باللہ کے جو مناظر سامنے آرہے ہیں وہ سب بناوٹ ہے تو اس کے دل میں ان بزرگ ہستیوں کے لئے جذبۂ احترام کس طرح پیدا ہو سکے گا۔ وہ بھانڈ جو ایک نقال کی حیثیت سے کسی درویش کا سوانگ بھر رہا ہو وہ درویش کی تذلیل کا باعث تو بنتا ہے لیکن اس کی عظمت کا نقش کسی دل میں نہیں بٹھا سکتا۔ درویشی ایک خاص نوعیت کی پاکیزہ قلبی کیفیت کا نام ہے جسے وہ بھانڈ نہ تو اپنا سکتا ہے اور نہ اپنانے کا کوئی عزم اور ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ اس درویش کی ظاہری وضع قطع کی بھونڈی نقالی کر کے اسے تماشائیوں کے سامنے اس انداز سے پیش کرے جس سے ان کی ضیافت طبع کا سامان ہو سکے اور وہ اسے چندے دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

فلم ساز "خادمان دین" کے طرز استدلال کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ انہوں نے اتباع اور نقالی کے مابین جو نہایت واضح فرق ہے اسے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ کسی برگزیدہ ہستی کا اتباع خلوص پر مبنی ہوتا ہے اور متبع ہر وقت اس بات کے لئے کوشاں رہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے پورے ڈھانچے کو ہادی کی ہدایت کے مطابق ڈھال لے۔ لیکن ایک مخلص متبع کے برعکس ایک اداکار اپنی پوری زندگی تو اپنے ذوق کے مطابق فسق و فجور میں بسر کرتا ہے۔ اس کے دل میں نہ تو کسی پاکیزہ زندگی کو اپنانے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ اسے اپنے لئے موزوں سمجھتا ہے لیکن اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے کسی مقدس زندگی کے چند ایک واقعات کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ تماشائی اس کے فنی کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

فلم تبلیغ دین کا اس بنا پر بھی ذریعہ نہیں بن سکتی کہ عوام تفریح کی غرض سے سینما گھروں کا رخ کرتے ہیں اور تفریح طبع کی خاطر وہاں کچھ وقت گزارتے ہیں۔ اس ذہنی کیفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ سینما ہال کی پوری فضا فسق و فجور سے معمور ہوتی ہے اور انسان سفلی جذبات کی تسکین کے لئے ہی فلم سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس قسم کی اخلاق سوز فضا میں نیکی اور پرہیزگاری کی باتیں بالکل اسی طرح کی طفلانہ باتیں ہیں جس طرح کہ کوئی سرپھرا بادہ خوار میخانے کے اندر نشے میں غرق ہو کر اذان دینے لگے اس ناپاک ماحول میں جو شخص اس طرح کی حرکت کرے گا کیا وہ رندوں کی محفل میں مضحکہ نہ بنے گا۔ جس طرح خدا کی محبت ایک پاکیزہ دل کے اندر ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح خدا خوفی اور خدا ترسی کے پاکیزہ جذبات پاکیزہ ماحول ہی میں پرورش پاتے ہیں۔ جب کوئی انسان پاکباز لوگوں کی پیروی میں خدا کے ساتھ اپنا رشتۂ عبودیت استوار کرنے کا عزم کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنی ذہنی کیفیت بدلتا ہے۔ پھر اپنے ماحول میں دینی تقاضوں کے مطابق تبدیلی لاتا ہے۔ کیونکہ ان بنیادی تغیرات کے بغیر وہ صحیح معنوں میں اللہ کا بندہ نہیں بن سکتا ذہنی تبدیلی کا پہلا مظہر یہ ہے کہ انسان غیر سنجیدہ مشاغل چھوڑ کر سنجیدہ کاموں میں منہمک ہو جاتا ہے اور وہ ناپاک ماحول کو تیاگ کر پاکیزہ ماحول کی تلاش شروع کر دیتا ہے

ٹد سے تعلق خاطر بڑھانے کے لئے زیادہ سازگار
ٹا۔

دنیا کا کونسا گوشہ ایسا ہے جو زمانہ دلسئے حقیقی کی فرمانروائی
باہر ہو لیکن اس کے باوجود دنیا کے سارے مذاہب نے
اسات عبودیت کو پروان چڑھانے کے لئے مساجد اور
ایاد کی تعمیر کا خاص التزام کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ
صرف ان عبادت گاہوں کے اندر ہی مقید ہے اور
سے باہر اس کا وجود ناپید ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے
قدس کا جو ماحول یہ عبادت گاہیں فراہم کرتی ہیں وہ دوسرے
مات پر میسر نہیں آتا۔ احادیث میں ماحول کے اس اختلاف
انسانی طبائع پر اس کے اثرات کی متعدد مثالیں ملتی ہیں
لاً حضورؐ نے منڈیوں اور بازاروں کو ناپسندیدہ مقامات
دیا ہے اور مسلمانوں کو اس امر کی تلقین کی ہے کہ وہ مساجد
اپنا دل رگلنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح حضور سرور
عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حمام سے بھی نفرت کا اظہار فرمایا
مسجد کی تعریف و توصیف اور اس کے مقابلہ میں منڈی
ار اور حمام سے بیزاری کا سبب آخر اس کے علاوہ اور کیا
کہ مسجد کے ماحول میں جو تقدس، پاکیزگی اور روحانیت
جاتی ہے اس میں نہ صرف انسان اپنے آپ کو خدا سے قریب تر
ہے بلکہ اس کے دل میں خدا کا قرب حاصل کرنے کی امنگ
اُبھرتی ہے۔ مسجد کے برعکس منڈی اور بازار میں چونکہ
وہ دولت کے جمع کرنے میں منہمک ہوتا ہے اس لئے وہاں
وقت اس بات کا خطرہ لاحق رہتا ہے کہ وہ دنیوی
وہ دولت کی محبت میں کھو کر خدا سے غافل نہ ہو جائے
احال حمام کا ہے۔ وہاں انسان غیر سنجیدہ ذہن کے ساتھ
ل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شرم و حیا کے اس معیار کو
ار نہیں رکھ سکتا جو اسلام کا مطلوبہ معیار ہے اور بے تکلفی
ضا میں بعض ایسی باتیں زبان سے نکال دیتا ہے یا بعض
ناشائستہ حرکات کر بیٹھتا ہے جو ایک خدا ترس انسان
طرح بھی زیب نہیں دیتیں۔

دینی نقطۂ نظر سے فلم اور ڈرامے کے ان خارجی نقائص
کے علاوہ ان کی داخلی ہیئت اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ ان میں
مذہب اور مذہبی اقدار کو صحیح انداز میں سمویا نہیں جا سکتا۔ ڈرامہ
زندگی کی عکاسی کا نام نہیں بلکہ زندگی کے بعض واقعات کے اندر
غیر معمولی ہیجان پیدا کر کے انھیں عوام کے سامنے پیش کرنے
کی کوشش ناتمام کا نام ہے۔

کسی انسان کی سیرت خواہ وہ کتنی دل کش اور پاک ہو
اس وقت تک ڈرامے کے لئے موزوں نہیں بن سکتی جب تک
اس کے توازن کو درہم برہم کر کے اس کے اندر تصادم، تضاد
اور الجھاؤ نہ پیدا کر لیا جائے۔ پھر کسی کامیاب ڈرامے کے لئے
یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں وحدت زمان، وحدت مکان،
وحدت عمل اور وحدت تاثر شروع سے آخر تک قائم رہے
ڈرامے کے یہ سارے تقاضے ڈرامہ نگار کو اس بات کے لئے
مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک فیصد حقیقت کے ساتھ ننانوے
فیصد جھوٹ ملا کر اسے اس ہنرمندی سے پیش کرے کہ انسانی
ذہن پر اس آمیزش کا ایک خاص اثر مرتب ہو۔ یہ بات چونکہ
ذرا مشکل ہے اس لئے ہم چند مثالوں کے ذریعہ اس کی وضاحت
کرتے ہیں۔

چند سال پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے
بارے میں ایک فلم تیار ہوئی جس کا پس منظر یہ تھا کہ سیدنا
عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت کو نمایاں کیا جائے۔ ان کی سیرت کا نقش
ابھارنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ان کے عہد کی صحیح عکاسی ہو
چنانچہ ان کے لئے فلمسازوں نے پس منظر کو خاص اہمیت دی
اور پھر اس عہد کے اندر جان پیدا کرنے کی غرض سے رتھوں کی
دوڑ کا خاص طور پر التزام کیا گیا اور ڈرامے کی کہانی اس انداز سے
آگے بڑھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پاکیزہ زندگی رتھوں کے
پس منظر میں دب کر رہ گئی۔

فلم کے شیدائیوں نے مہاتما بدھ کی سیرت کو اجاگر کرنے
اور ان کا پیغام پھیلانے کے لئے بھی ایک فلم تیار کی تھی لیکن

جن لوگوں نے اس فلم کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھا ان کے اندر نیکی کے بارے میں احساسِ شکست ہی پیدا ہوا اور ان کے دلوں میں یہ بات گھر کر گئی کہ غلبہ ہمیشہ برائی کا ہوتا ہے اور نیکی کو اس کائنات میں مغلوب ہی رہنا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ کہانی کو دلفگار المیہ بنا کر ہی اس کے اندر غیر معمولی اثر انگیزی پیدا کی جا سکتی تھی اگر برائی کی قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کیا جاتا اور اس کے مقابلے میں نیکی کی قوت بے بسی، مظلومیت، یاس اور مجبوری کی تصویر کے طور پر سامنے نہ لائی جاتی تو عوام کے جذبات میں کبھی شدید تاثر پیدا نہ ہوتا۔

دنیا کے معروف ناول نگار اور ڈرامہ نویسوں کی تخلیقات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ان میں کسی شریف اور نیک نفس انسان کا کردار بالعموم دو حیثیتوں سے ہی سامنے آتا ہے۔ یا تو شرافت کا پرچار کرنے والا بڑا عیار اور مکار ہوتا ہے جو نیکی اور شرافت کا لبادہ اوڑھ کر سادہ لوح عوام کی نیک نفسی سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے یا غبی اور کند ذہن ان ناولوں کا مطالعہ کرنے والے، اور اگر انھیں فلمایا گیا ہو تو ان فلموں سے لطف اندوز ہونے والے اس قسم کی تخلیقات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور کہانی لکھنے والوں کی قوتِ مشاہدہ اور جرأت کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ انھوں نے نیکی کے نام پر استحصال کرنے والوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس قسم کے ناولوں اور ڈراموں کے مطالعہ کا یہ اثر پڑتا ہے کہ ناپختہ اور خام ذہن اس نہج پر سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ خیر اور بھلائی کا ہر دعویدار لازمی طور پر باطن ہی ہے۔

اس نوعیت کی افسانہ نگاری کے برعکس جہاں نیکی اور شرافت کے مخلص علمبرداروں کے کردار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں اس بات کا خاص طور پر اہتمام ہوتا ہے کہ نیک نفسی اور شرافت مظلوم و مجبور ہی نظر آئے۔ کیونکہ یہ ڈرامے اور ناول کی فنی ضرورت ہے۔ اگر ڈرامہ نویس زندگی کی ان اعلیٰ اقدار کو اس حیثیت سے پیش نہیں کرتا تو ان کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں جذبۂ ترحم پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے اور اس طرح اپنی تخلیق کو فنی اعتبار سے مجروح کرتا ہے اپنے کردار کو غم واندوہ کا پیکر بنانے کے لئے وہ یا تو اسے قدرت کی ستم کاریوں کا ہدف بناتا ہے جس سے فطرت ایک ظالم اور بے رحم قوت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے جسے ہمیشہ بھلے آدمیوں پر ہی مشقِ ناز کرنے میں مزا آتا ہے یا وہ ماہر فن ادیب کسی خدا ترس انسان کے نیکی اور شرافت کے اصولوں اور ان سے ان کی مخلصانہ وابستگی کو اس انداز میں نمایاں کرتا ہے جس سے اس کا اخلاص اور اصول پرستی اسکے لئے وبالِ جان ثابت ہوتے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں پے در پے ناکامیوں کا سامنا کر کے اور مختلف قسم کے مصائب اور شدائد جھیل کر بڑی کس مپرسی کے عالم میں زندگی کی سرحد عبور کر جاتا ہے۔ یہ اندازِ بیان بھی اگرچہ بڑا اثر انگیز ہے لیکن اس المیہ میں قنوطیت پیدا کرنے اور اسے ڈرامائی رنگ دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ڈرامہ نویس اس شریف النفس انسان کی اس طریق سے کردار نگاری کرے جس سے یہ معلوم ہو کہ خود اس نے اپنے قول و فعل سے اپنی زندگی کو حزنیہ بنا لیا ہے اس نوعیت کے جتنے ناول اور ڈرامے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں ایک چیز قدرِ مشترک کے طور پر نظر آتی ہے کہ بھلے انسان میں فہم و تدبر کی کمی ہی اس کی زندگی کو المیہ بناتی ہے آپ غور کریں کہ کیا اس نوعیت کے تاثرات قائم کر کے عوام کو دینِ حق کا علمبردار بنایا جا سکتا ہے۔

فلم کے بارے میں یہ بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ فلم سازی ایک ایسا دھندا ہے جو دولت اور شہرت کے حصول کے لئے کیا جاتا ہے۔ اس لئے جو لوگ بھی یہ کاروبار کرتے ہیں انھیں یہ فکر ہر لمحہ دامنگیر رہتی ہے کہ وہ عوام کے رجحانات اور میلانات کو سامنے رکھ کر فلمیں تیار کریں تاکہ وہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوں۔ چنانچہ دیکھیے کہ جس رفتار اور انداز سے عوام کا ذوق بگڑتا ہے اسی تناسب سے فلموں کے اندر فحاشی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہماری بداخلاقی بربادی کے سارے اسباب کو ایک پلڑے میں ڈال دیا جائے

اور صرف فلم کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر ان کا وزن کیا جائے تو بلاشبہ فلم کا پلڑا دوسرے پلڑے سے زیادہ بھاری ہوگا فلم نے انسانی معاشرے کو شیطانی چکر میں پھنسا دیا ہے فلم ساز بگڑے ہوئے افراد کے سفلی جذبات کی تسکین کے لئے فلمیں تیار کرتے ہیں جن سے ان کے اخلاق کے اندر مزید بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور انھیں اس بات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ وہ پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ اخلاق سوز مناظر سے لطف اندوز ہوں۔ ان کی اس ہوسناکی کو فلم ساز ہی پورا کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور وہ ان کے لئے ایسی فلمیں تیار کرتے ہیں جو نہ صرف ان کے بگڑے ہوئے ذوق کی تسکین کا باعث ہوں بلکہ ان کے اخلاق اور زیادہ برباد کریں اس قسم کے حالات میں فلم کے ذریعہ حق و صداقت کے پرچار کا عزم اگر عیاری نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔

ہم ان معروضات کو انگریزی زبان و ادب کے ایک معروف نقاد جانسن کی رائے پر ختم کرتے ہیں جو اگرچہ اس نے ولیم شیکسپیر کے ڈراموں کے بارے میں دی ہے لیکن جس کا اطلاق قریب قریب ہر ڈرامے پر ہوتا ہے۔

وہ سوال کرتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ڈراموں میں عشق و محبت کی داستانوں کے متحرک کرداروں کے علاوہ ہمیں کوئی دوسری چیز کم ہی نظر آتی ہے۔ اس میں جو کردار بھی سامنے آتے ہیں وہ الفت کے اسیر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ عام انسانی زندگی کی صحیح تصویر ہے تو اس آسمان کے نیچے اس سے بڑی دروغ گوئی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

محبت زندگی کے دوسرے داعیات کی طرح محض ایک داعیہ ہے جس میں زمانے کے اتار چڑھاؤ کے مطابق تغیر و تبدل رونما ہوتا رہتا ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی ہوشمند شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ انسانی زندگی کا واحد محرک جذبۂ محبت ہی ہے اور باقی محرکات محض اضافی داعیات ہیں لیکن اس حقیقت کے جانتے ہوئے بھی ڈرامہ نگار ڈرامے کے پلاٹ کا تانا بانا صرف محبت کے مصنوعی تاروں ہی سے تیار کرتا ہے اور تماشائیوں کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ کارگاہِ حیات تو صرف عشق و محبت کی وسیع جولانگاہ ہے۔

ڈرامہ نویس کے اس غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر اور حقیقت کو مسخ کرنے والی اس ذہنی کاوش کا محرک بجز اس کے اور کیا ہے کہ لوگ تفریح کے لمحات میں عشق و محبت کی ہیجان انگیزی ہی سے حظ اٹھانے کے بیتاب ہوتے ہیں۔ اور ڈرامہ نویس انھیں یہ سہولت اور موقع کرتا ہے۔

از:- الشہاب ثاقب . دہلی

ایک مُراسلہ

ایک تازہ کتابچہ یقیناً آپ کی نظر سے گزرا
ہوگا " فتنۂ مودودیت" یہ مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث
مظاہرالعلوم کے قلم سے ہے۔ ایک وقت آیا تھا کہ بہت
سے علماء کی طرف سے مولانا مودودی صاحب کی تحریرات
کی مخالفت ہوئی تھی اور بہت سے حضرات نے مختلف
انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ لیکن آپ کو
یاد ہوگا کہ تبلیغی جماعت نے کبھی کسی ایسے معاملہ میں
زبان نہیں کھولی تھی حالانکہ وہ اس کا اصل موقعہ وقت
تھا۔ اب کیا اسباب و محرکات ہیں کہ اسی خاموش
جماعت کے سرپرست اور کرتا دھرتا شیخ الحدیث صاحب
نے اس فتنہ کو قلع قمع کرنے کی ٹھانی ہے جبکہ یہ " فتنہ"
ہندوستان میں آج ہی کی پیداوار نہیں ہے۔ ایک نسل
کی عمر طبعی کا بڑا حصہ اس کشمکش میں گزار چکی ہے۔ پھر
ابتداء کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ تحریر آج سے
... برس پرانی ہے۔ تو آج ایسی کونسی ضرورت محرک ہوئی
اس کی اشاعت بہت بڑی تبلیغی اور اسلامی خدمت
بن گئی۔ سمجھنے والے موجودہ ایام کے تازہ ترین حالات
میں اس طرح کے کاموں کے دنیوی فوائد کو خوب سمجھ
سکتے ہیں۔ اس طرح کس کس کو خوش کیا جاسکتا ہے اور اس
طرح اپنی راہ سے کیا کیا رکاوٹیں دور کی جاسکتی ہیں۔ اور
کیا کیا منافعے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

یہ تو ملکی حالات کے لحاظ سے ہوا۔ اس کے علاوہ
چند چیزوں کی طرف آپ کی توجہ اور مبذول کرانا چاہتا
ہوں۔ کسی انسان کی رائے سے خواہ وہ کتنا ہی عظیم
کیوں نہ ہو اختلاف کرنے کا حق ہر صاحب علم وفہم کو ہوتا ہے
لیکن اپنی رائے کے مقابلہ میں دوسرے کی رائے کو حماقت
جہالت، بددیانتی اور ضلالت قرار دینا غیر شریفانہ حرکت
ہے۔ یہاں علاوہ اس کے بعض اور چیزیں بھی ہیں جنھیں
تبلیغی جماعت نے اپنا حلقۂ اثر وسیع کرنے کا جو تازہ
منصوبہ بنایا ہے، اس کے تحت اس کے ذمہ داران نے
ایک طویل سفر افریقی ممالک کا کیا۔ جماعت کے افراد اب سے
پہلے بھی جاتے تھے، مگر جو نزاکتیں ذمہ داران محسوس کرسکتے
تھے نچلے لوگ کیسے کرسکتے تھے۔ چنانچہ ان ذمہ داران نے
محسوس کیا کہ جماعتی فکر کی مخالفت کرکے یقین کرلیا گیا تھا
کہ ہندوستان میں اس کا دائرہ محدود کرکے بے اثر
کردیا گیا ہے۔ وہی خالص اسلامی فکری تحریک بالکل خلاف
توقع افریقہ تک اپنا اثر پھیلا چکی ہے۔ پھر جو لوگ امریکہ گئے
انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں نہایت عظیم الشان اجتماع اس
تحریک کا ہورہا ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر عرب ممالک
جہاں تبلیغی جماعت نے ان ممالک کی موجودہ اہمیت کے

پیش نظر اپنی توجہات زیادہ لگا رکھی ہیں وہاں بھی مولانا مودودی کی کتابیں ترجمہ ہو ہو کر بہت مقبول ہو رہی ہیں ان تمام حالات کو ان کے ذمہ داران نے خوب توجہ سے دیکھا۔ پھر حال میں شیخ الحدیث صاحب نے حجاز کے طویل قیام میں ان حالات کو خود دیکھا اور محسوس کیا کہ پوری دنیا میں تبلیغی اثرات پھیلانے کے لئے ضروری ہے کہ اس تحریک اسلامی کے اثرات ختم یا کم سے کم محدود کئے جائیں۔ چنانچہ جو تحریریں عین ان ایام میں شائع نہ ہوئیں جو اس کا وقت تھا۔ وہ تحریر آج پورے پچیس سال گذرنے کے شائع ہو رہی ہیں۔ اور کسی سنجیدہ طریقے پر نہیں بلکہ نہایت پست انداز میں مودودیت کو گمراہی اور تباہی قرار دیتے ہوئے بڑی تیزی سے اس کو پھیلایا جا رہا ہے۔ جن مقدس ہاتھوں نے فقہی مسائل تک پر دستخط نہ کئے صرف یہ کہہ کر کہ فقہی مسائل میں اختلاف ہوتا ہے اور ہم اختلاف سے علیحدگی ہی پسند کرتے ہیں۔ آج انہی مقدس ہاتھوں نے "فتنۂ مودودیت" جیسی آگ لگا دینے والی کتاب لکھ ڈالی۔

یہ دینی تحریفات و تلبیسات پچاس برس سے آپکی نظروں سے اوجھل تھیں؟ یا اب کچھ اور مزید تحریفات پیدا ہو گئی تھیں؟ واقعہ یہ ہے کہ تحریک میں ایک تدریجی اعتدال پیدا ہوا کرتا ہے۔ بہت سے معاملات میں اب نرمی آگئی ہے مگر ان حضرات کی نظر ان تلبیسات پر آج ہی پڑی؟ اگر خدمت دین اور حفاظت اسلام ہی اصل مدعا ہے تو آج تک خاموشی کیوں اختیار کی گئی؟۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ اب شیخ الحدیث صاحب نے بڑی تیزی سے اپنی عربی کتابیں عرب ممالک میں چھاپ چھاپ کر عام کرنا شروع کر دی ہیں اور پرانے پڑے ہوئے مسودات جو اردو میں ہیں وہ بہت برق رفتاری سے ہندوستان میں شائع کئے جا رہے ہیں اور عنقریب آپ دیکھیں گے کہ مغربی ممالک میں وہاں کی زبانوں میں تراجم ہو ہو کر کتابیں شائع ہوں گی۔ یہ تمام تدابیر اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کرنے کیلئے ہیں۔ اب کوشش ہے کہ مولانا مودودی صاحب چونکہ تحریری میدان میں بہت آگے ہیں اور ان کی کتابیں ان کتابوں کے لئے سب سے بڑی حریف ہیں اس لئے جیسے تیسے ان کی مقبولیت ختم کر کے میدان خالی کیا جائے۔ کل تک جو تبلیغی جماعت کے لوگ کتاب و قلم کے ذریعہ دعوت دینے والوں کو "اہل کتاب" تک کہہ ڈالتے تھے آج حریفانہ چشمک انھیں بھی کتاب و قلم کے ذریعہ دعوت تک لے آئی!!

کہا جاتا ہے کہ دنیا لئے تحریریں ابھرنے کا آرزومند شیخ الحدیث صاحب کا ایک نوجوان و نوخیز نواسا اس موقع کو ہزار غنیمت سمجھ کر خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ شہرت بھی مل رہی ہے اور کتب خانہ بھی چل رہا ہے معمولی معمولی ضخامت کی کتابوں کے خوب دام لگائے جا رہے ہیں۔ ایک تیر سے ———— اب متعدد شکار ہو رہے ہیں۔ شہرت، دولت، توسیع حلقہ اور دائمی طور پر آنے والی نسلوں تک کا اقتصادی حل یہ چند حقائق میں تھے اس لئے آپ کے سامنے رکھے ہیں کہ اس کتاب کو ان تمام احوال و کوائف اور پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے اور میری آواز کو قارئین تجلی تک پہنچا دیا جائے

تجلی

لیجئے آپ کی خواہش کے مطابق آپ کی آواز قارئین تجلی تک پہنچا دی گئی۔

آپ کی یہ تحریر بجائے خود مکمل ہے۔ لہٰذا اس پر حاشیہ چڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ہمیں اتفاق ہے یا اختلاف اس سے قطع نظر ہم یہ گزارش کر رہے ہیں کہ گذشتہ ماہ "فتنۂ مودودیت" سے متعلق ہمیں دو چار اور دس بیس نہیں بلکہ ان گنت خطوط موصول ہوئے۔ اکثر خطوط میں اس بات کی گزارش بلکہ اصرار کیا گیا تھا کہ اس کتاب کا آپریشن کیا جائے۔ لیکن ہم اس کتاب کے چیر پھاڑ کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کرتے

اس لئے کہ یہ کتاب بے پناہ نقائص اور کمزوریوں کی وجہ سے بذات خود شیخ صاحب کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس میں صرف ادبی سقم اور حقائق سے فرار نہیں پایا جاتا بلکہ ایک موٹی اور بھاری بھرکم عیب اور بھی ہے اور وہ ہے لب و لہجہ کی غیر سنجیدگی۔ بعض مقامات پر تو انداز گفتگو کچھ اس قسم کا ہو گیا ہے کہ متانت اور سنجیدگی علم اور وقار اپنا سا منھ لے کر رہ جائیں۔

نمونتہً یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے :-

" اگر مودودی کی ایسی سخت چیزوں پر علمائے وقت کوئی سخت لفظ اس کو لکھ دیں تو کیا اس میں کسی کو حرف گیری کی کوئی گنجائش مل سکتی ہے "۔

" وہ شخص جب قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو اس کو بالکل اس بات کی خبر نہیں رہتی کہ میں کس کے متعلق کیا لکھ رہا ہوں " ص ۱۴۷

دیکھا آپ نے یہ الفاظ ایسے شخص کے منھ سے خارج ہو رہے ہیں جو مصنوعی نہیں سچ مچ کا شیخ الحدیث ہے، جو واقعتہً ثقہ، متقی اور پرہیزگار بھی ہے کیا منقولہ بالا انداز نگارش حیرتناک اور افسوسناک نہیں ہے۔

ایک نمونہ اور بھی ہے وہ بھی لگے ہاتھوں ملاحظہ کر لیجئے :-

فتنۂ مودودیت میں متعدد جگہ مشہور منکر حدیث عبداللہ چکڑالوی کا ذکر آیا ہے۔ یہ وہ شخص ہے کہ جس کا گمراہ اور بے دین ہونا مسلم اور متفق علیہ ہے اس شخص کے نام سے پہلے اخلاقاً اور احتراماً شیخ صاحب نے لفظ "مولوی" ٹانک دیا ہے۔ لیکن قابل حیرت اور قابل افسوس بات یہ ہے کہ پوری کتاب میں ــــ ہاں پوری کتاب میں کسی ایک جگہ بھی شیخ زکریا نے مودودی سے پہلے لفظ مولوی لگا دینے کی غلطی نہیں کی۔

آپ کے نزدیک بھی یہ بات تعجب اور قابل ماتم ہو گی ــــ لیکن ذرا ٹھہرئیے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ فتنۂ مودودیت آج سے پچیس برس پہلے مرتب کی گئی تھی اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آج کے شیخ الحدیث اور اس شیخ الحدیث میں جس نے ۲۵ برس پہلے فتنۂ مودودیت قلم بند کی تھی زمین و آسمان کا نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔

جس زمانہ میں یہ کتاب تخلیق کی گئی تھی اس زمانہ میں شیخ زکریا صاحب کا تقویٰ اور تدین مستند اور معتبر نہیں تھا اور نہ ہی وہ پرہیزگاری کے اس مقام پر فائز تھے جس مقام پر آج فائز ہیں۔

لہٰذا اس زمانہ میں اگر ان کے قلم سے کوئی ناروا تحریر وجود میں آ گئی ہو تو حیرت کیسی، افسوس کس لئے اور واویلا کیوں ؟۔

ہمیں نہیں معلوم کہ شیخ الحدیث صاحب کے نو خیز نواسے کون ہیں اور دنیا کی حرص و طمع ان میں پائی جاتی ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کا خیال درست ہو اور فتنۂ مودودیت جیسی کتابیں صرف پیٹ اور جیب کے مسائل حل کرنے کے لئے چھاپی جا رہی ہوں۔

آپ کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے ہم ایک حقیقت سے اور مطلع کرتے ہیں وہ یہ کہ ہمیں باوثوق ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ فتنۂ مودودیت عنقریب مفت تقسیم ہونے والی ہے اس لئے کہ افریقہ سے کسی صاحب خیر دولت مند نے کثیر رقم ارسال کی ہے اور فتنۂ مودودیت کے ناشر کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کتاب کو مفت یعنی بلا قیمت دنیا بھر میں پھیلائے۔

ممکن ہے کہ افریقہ سے کچھ اور رقم بھی نازل ہو اور ممکن ہے کہ مودودی کے خلاف کوئی اور کتاب بھی مارکیٹ میں سر ابھارے۔

بہر حال مودودیت کے خلاف ایک نہیں ہزار کتابیں بھی وجود پذیر ہو جائیں تو کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ لیکن اس بات پر تعجب کرنا اور پیچ و تاب کھانا ضروری ہے

(باقی بر صفحہ ۱۰۲)

مولانا عامر عثمانیؒ کی خدمت میں

ہدیۂ سلام

جنابِ حضرتِ عامرؒ کے پاک قدموں کو — مری جبینِ عقیدت سلام کرتی ہے
وہ ہاتھ جس سے وہ لکھتے تھے دین کی باتیں — اسے تو آج شریعت سلام کرتی ہے
یہ قارئینِ تجلّی کی فوج عامرؒ کو — بصد خلوص و محبت سلام کرتی ہے
قلم سے حق کے سمندر بہا دئیے جس نے — اسی کو حق کی جماعت سلام کرتی ہے

وہ ایک نور کے مینار تھے جو اے شوقیؔ
تو ساتھ نور کے ظلمت سلام کرتی ہے

○

از:-

ڈاکٹر سید حبیب احمد شوقی

عامر عثمانیؒ

نمبر کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے

گر ـــــ آپ مضمون نگار ہیں تو مولانا عامر عثمانی رہ کی شخصیت پر مضمون لکھیئے۔

گر ـــــ آپ شاعر ہیں تو مولانا عامر عثمانیؒ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیجیئے۔

گر ـــــ آپ ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں تو عامر عثمانیؒ نمبر کے لئے مفید مشورے دیجیئے۔

گر ـــــ آپ کسی مصلحت کی بنا پر یا کسی خاص وجہ سے مشورے دینا مناسب نہیں سمجھتے تو ہمارے لئے دعا فرمائیے۔

رحال ـ آپ جس قسم کا بھی تعاون بآسانی دے سکتے ہیں دیجیئے ـــــ یقین کیجیئے کہ آپ کا ہر قسم کا تعاون ہماری نظروں میں قابلِ قدر ہوگا۔

ور ـــــ یقین کیجیئے کہ آپ کے پرخلوص تعاون کے بغیر ہم اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتے

شاءاللہ ـ اگلے شمارہ میں عامر عثمانیؒ کی کچھ جھلکیاں پیش کریں گے، یہ جھلکیاں اسی شمارہ میں پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن ایک مجبوری کی بنا پر یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ خدا آئندہ اس ارادہ کو پورا فرمائے۔

غزل

شعلے، سراب، دھوپ، دھواں دیکھتے رہیں
جو کچھ دکھائے وقت یہاں دیکھتے رہیں

سورج کے بخل پر نہ کریں کوئی تبصرہ
تاریکیوں میں ڈوبے مکاں دیکھتے رہیں

تنہائیوں کا زہر ہے شہروں کی بھیڑ میں
انساں کی بے بسی کا سماں دیکھتے رہیں

محرومیِ کرم کی شکایت بھی کیا کریں
بے مہریِ نگاہِ جہاں دیکھتے رہیں

کیا ظلم ہے میں جن کو سمجھتا ہوں ناخدا
وہ میرے ڈوبنے کا سماں دیکھتے رہیں

موسم کے ساتھ رنگ بدلتی ہے زندگی
عہدِ بہار و دورِ خزاں دیکھتے رہیں

کچھ قہقہوں میں جس کو چھپایا گیا طرب
چہروں سے ہیں وہ کرب عیاں دیکھتے رہیں

از
طرب صاحب
میرٹھی

یہ شمارہ آپ کو رمضان کے کافی بعد ملیگا، لیکن یہ مرتب رمضان ہی میں کیا گیا تھا۔ اور آپ واقف ہیں کہ رمضان المبارک میں ملا ابن العرب جنس نایاب ہو کر رہ جاتا ہے مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ کے انتقال کے بعد سے ان کی لاپرواہیاں دن بدن بڑھتی جارہی ہیں۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ رمضان میں غائب ہو جایا کرتے تھے۔ امسال شعبان ہی میں رفو چکر ہو گئے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ موصوف کسی مزار پر ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔ اور کب واپس تشریف لائیں گے۔ مجبوراً ان کا ایک پرانا مضمون شریک اشاعت کیا جارہا ہے اسے تبرک سمجھ کر ہضم کر لیجئے ——— (ادارہ)

یہ ٹھیک ہے کہ ایڈیٹر تجلّی دارالعلوم کے سند یافتہ ہیں اور کتابوں کو الٹنے پلٹنے علوم ظاہری میں تھوڑی سی شُدھ بُدھ ہو گئی ہے۔ لیکن علوم روحانی اور فنون طریقت کا معاملہ اور ہے ان میں وہ عاجز کے سامنے طفل مکتب بھی نہیں۔

آپ "اپنے منہ میاں مٹھو" کی پھبتی چست نہ کیجیے ــ طریقت اور روحانیت کے علوم میں اپنی مہارت تامّہ کی بات میں خود نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ تو خود پیر رحمۃ اللہ علیہ کی کہی ہوئی ہے اور میرے بہت سے پیر بھائی چار و ناچار میری صلاحیتوں کا لوہا مانتے ہیں۔ قصّہ دراصل یہ ہے کہ پیر رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کرنے کے بعد مجھ پر بارش کی طرح غیبی علوم و فنون کی بوچھار ہوتی رہی ہے اور دوسری اور تیسری صدی ہجری تک کے متعدد مشائخ نے عالم رؤیا میں تشریف لاکر مجھے بیعت خاصہ سے نوازا ہے۔ ایک مرتبہ تو خود پیر رحمۃ اللہ علیہ حیران رہ گئے۔ نہایت تعجب سے فرمایا:-

"ارے لڑکے! تو تو چھپا رستم نکلا۔ آیا تھا ہمارا اتباع کرنے مگر پھلانگ گیا ہم سے بھی آگے"۔

ایک مرتبہ فرمایا:-

"خانہ خراب راہ سلوک میں اتنی تیز رفتاری تو نے کہاں سے سیکھی"؟

فدوی نے جواب دیا:-

"آپ کی دعا سے غلام کے سر پر پاک پنجتن کا سایہ ہے۔ ہر سجدہ عرش کی چھت پر ہوتا ہے"۔

"عرش کی چھت" وہ بگڑ کر بولے تھے "ارے لڑکے

عرش کوئی مکان ہے جو چھت کی بات کرتا ہے"

"جی ...... جی دراصل عرش کے بالائی حصے کو میں نے چھت کہا ہے۔ خواجہ منطیق رحمۃ اللہ علیہ نے عالم رؤیا میں ارشاد کیا تھا کہ عرش کا کچھ حصہ نشیب میں ہے اور کچھ اونچائی پر"۔

"سخت تعجب ہے ہم پر تو ایسا منکشف ہوا نہیں"۔

"نہ ہوا ہو گا ــــ میں بہر حال اونچا جا رہا ہوں"۔

میں نے دراصل صحیح بات پیر رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں بتائی تھی۔ بتاتا تو شاید پٹ جاتا۔ وہ اکثر معاملات میں صحیح العقیدہ ہونے کے باوجود بعض امور میں وہابیت کا شکار تھے۔ مثلاً انھیں فلموں سے روحانیت کشید کرنے میں یقین نہیں تھا۔ نہ وہ زنانِ عاشقانِ اولیاء سے پینگیں بڑھانے کو تزکیۂ نفس کا وسیلہ ماننے کو تیار نہ تھے ــ وہ ان بزرگوں سے بھی خوش گمان نہیں تھے جنھوں نے خوش رو لڑکوں سے عشق کر کے سلوک کی منازل طے کی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر میں انھیں بہ تہہ کی بات بتا دیتا کہ فدوی کے ارتقائے روحانی کا بڑا ذریعہ فلم بینی پر مبنی ہے تو وہ غضبناک ہو کر چانٹا مار دیتے۔ اسی لئے گول کر گیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فلم دیکھ دیکھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ فلم کالی ٹوپی لال رومال ــــ بغداد کا چور حاتم طائی کی بیٹی ــــ بصرے کی حور ــــ سخی لٹیرا ــــ قنشوش وغیرہ وغیرہ میں مسلسل میں نے یہ دیکھا کہ جب ظالم سماج ہیرو اور ہیروئن کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے تو وہ تنہائی میں ایک دردانگیز گانا گا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور پھر وہ چشم زدن میں بہشت میں نظر آتے ہیں۔ وہاں نہ ظالم سماج ہے نہ کوئی رقیب۔ دونوں باہوں میں باہیں ڈال کر ٹھاٹ سے گاتے پھرتے ہیں اور حوریں ان کے لئے بڑا شاندار جشنِ رقص و سرود منعقد کرتی ہیں۔

میں نے سوچا کہ جب یہ خاکی مخلوق روحانی اڑان پر اتنی طاقت ہو سکتی ہے تو میں کیوں نسا ناری ہوں جو نہیں سکتا۔ صوفی مسکین کو خوشامد در آمد کر کے ہیروئن کا پارٹ دیا اور درگاہ ہی کے ایک کمرہ میں مشق شروع کر دی وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئے تھے۔ پہلے تو کہنے لگے:۔

"عرس کا انتظار کرو۔ خدا نے چاہا تو وحیدن بائی اس مرتبہ ضرور آئے گی اسے ہیروئن بنا لینا"۔

عرس میں تو ابھی بہت دن پڑے ہیں صوفی جی! پھر وحیدن بائی کو صوفی بربراو خواجہ سرفراز کب فارغ چھوڑتے ہیں جو میرے ساتھ جھک مار سکیگی۔ نہیں یار تم ہی تھوڑی سی تکلیف کر لو کیا حرج ہے"۔

حرج تو کچھ نہیں مگر ہمارا خیال ہے سینما والے کوئی چارسو بیس کرتے ہیں ورنہ آنکھیں بند کرنے ہی کوئی جنت میں کیسے پہونچ سکتا ہے"۔

چارسو بیس کیا معنی۔ آخر تم کیا اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے کہ سب کچھ سامنے ہوتا ہے آؤ ذرا کوشش کر کے دیکھیں۔ کیا تعجب کامیاب ہو ہی جائیں"۔

آخر بمشکل تمام وہ تیار ہو ہی گئے تھے۔

لیکن ابتداءً ہمیں ناکامی ہوئی۔ آنکھیں بند کر کے میں نے بہت زور لگایا مگر تصور کے افق پر کوئی نظارہ طلوع نہیں ہوا۔ البتہ صوفی نمکین ضرور کہنے لگے کہ یار مجھے تو کچھ نظر آیا ہے۔

"کیا نظر آیا ہے؟" میں نے بیتابی سے پوچھا۔

"کچھ ایسا جیسے ہنڈی کی روشنی پھیلی ہوئی ہو اور بہت دور ایک عالی شان عمارت اونچی ہوتی چلی جا رہی ہو"۔

"مار لیا کام" میں نے خوش ہو کر کہا "اب تو نہیں کہوگے کہ سینما والے چارسو بیس کرتے ہیں"۔

پھر میں نے آنکھیں بند کر کے مزید زور لگایا لیکن نہ روشنی نظر آئی نہ عمارت۔ مشکل یہ تھی کہ روح میں جو لطافت اور مستی کسی سچ مچ کی ہیروئن کے تصور سے پیدا ہو سکتی تھی اس میں صوفی مسکین کے لمبے تڑنگے جسم کا تصور حائل تھا جہاں میری طبیعت پر وہ دیگر روحانی کیفیات ابھارنی چاہیں صوفی صاحب کا قدِ بالا کسی دیو کی طرح کھوپڑی کے افق پر لٹکا ہوا نظر آیا۔

یار صوفی صاحب ... برانہ ماننا ریاضت کی
تکمیل کے لئے اگر آپ جوڑا بھی بدل لیں تو کیا مضائقہ ہے"
"جوڑا یعنی کیا مطلب ؟" وہ چونکے۔
ہیروئن کی جگہ تو آپ نے لے ہی لی۔ میک اپ کے
کے بغیر ریاضت میں حقیقت کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔
ذرا سوچئے"۔
"ارے تو کیا ہم عورتوں کا سا لباس پہنیں ؟ وہ بُرا
سا منھ بنا کر بولے۔
"وہ تو پہننا ہی ہوگا۔ دیکھ لیجئے روشنی اور عمارت
تو آپ کو نظر آ ہی گئی۔ اگر آپ میک اپ کئے ہوتے تو کیا
عجب یہی عمارت جنت میں تبدیل ہو جاتی"۔
"انھوں نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگے:۔
"یار شرم آتی ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو.....؟"
"مجال ہے کوئی دیکھ لے ... چھدّن اور کھولو کو
شہر بھیجکر پھاٹک بند کرلیں گے"۔
"لیکن زنانہ لباس کہاں ہے ؟"
"وہ میں لے آؤں گا"۔
مرحلہ اگرچہ دشوار تھا کیونکہ اپنی ملّائن کا لباس تو
ان کے حق میں گڑیا کا لباس ثابت ہوتا۔ لیکن مولوی قطب
الدین کی محترم اہلیہ میری نظر میں تھیں جن کا نام لیکر میری
خلیا ساس بچوں کو ڈرایا کرتی ہیں۔ ان کے کپڑے جس
فیکٹری میں ڈھلنے جاتے تھے اس کا منیجر اپنا مرید تھا
پھر ایک جوڑا مستعار لینے میں کیا دشواری ہو سکتی تھی۔
نہ پوچھئے اس جوڑے میں صوفی مسکین کیا کیا جچے ہیں
داڑھی تو ان کے ہے ہی نہیں۔ افغان سنو کی شیشی میں
گھر سے اڑا لایا۔ چار چار آنے کی دو چوٹیاں بازار سے خرید
لی تھیں۔ لپ اسٹک بھی لے لی تھی۔ شروع میں تو
صوفی جی نے بڑے نخرے دکھلائے۔ دوہرے ہو ہو گئے
مگر جیتے جاگتے جنت کی سیر کا تصور اتنا دل کش تھا کہ
وہ صاف انکار کی راہ اختیار نہیں کر سکے۔
اب جو میں نے انھیں آنکھوں میں بسا کر پپوٹے
کھینچے ہیں تو واقعی دنیا ہی بدل گئی۔ انشراح قلب
اور ذہنی کشود کے عجیب و غریب مرحلے ایسے نہیں ہیں کہ
الفاظ میں ان کا خاکہ کھینچا جا سکے۔ بس ایک سرمدی
کیف تھا۔ ایک لامتناہی پھیلاؤ۔ ایک نورانی خلا جس
میں اپنا کثیف جسم شیشے کی طرح مصفّا ہو کر بے تکان
اڑا چلا جا رہا تھا اور افق کے اس پار رنگین لہریئے اس
طرح سرسرا رہے تھے جیسے اب حوریں چھما چھم کرتی سامنے
آئیں اور اب کسی پیکر جمیل نے رقص کرتے ہوئے یہ
نغمہ چھیڑا۔ بصرے کی حور ناچے آگے حضور کے !
دفعتاً روح کو جھٹکا سا لگا اور دل کا ورق اس
طرح کورا ہو گیا جیسے فلم بیچ میں نکلی فیل ہو گئی ہو۔ صوفی
مسکین اپنی بھاری اور کھردری آواز میں کہہ رہے
تھے :۔
"یار اب کے تو ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا"۔
"ظالم غور سے دیکھو ہم اڑ رہے ہیں"۔
"دیکھیں کیسے آنکھیں تو بند ہیں"۔
"ستیاناس۔ ارے زور سے پپوٹے بھینچو۔ مراقبے
کے انداز میں مؤدب بیٹھ جاؤ"۔
"مم مگر.... فلم میں تو ہیروئن کبھی مؤدب نہیں بیٹھتی
وہ تو بس لیٹ کر آنکھیں بند کرلیتی ہے"۔
"یہ سب حالات پر منحصر ہے۔ تم ذرا آواز تو باریک
بناؤ۔ اتنی موٹی آواز کسی ہیروئن کی کیسے ہو سکتی ہے"۔
"اماں تو کیا بالکل ہی عورت بن جائیں" وہ جھلائے
"بالکل عورت تو تمہارے فرشتے بھی نہیں بن سکتے
مگر یار کم از کم اداکاری تو ڈھنگ سے کرو فی الحال بولنے
کی ضرورت نہیں سانس روک کر گردن جھکا لو"۔
"لو جھکا لی......"
چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ ہڑبڑا کے بولے:۔
"اے واہ سانس ہم کب تک روکیں گے۔ یہ بھی
کوئی بات ہوئی"۔
"چلو سانس لیتے رہو مگر بولو مت۔ ابھی بہت کچھ

نظر آئے گا۔"

پھر میں نے بڑی محنت سے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ ایک سچ مچ کی ہیروئن دو گز کے فاصلے پر بیٹھی ہے اور ظالم سماج ہمیں ملنے نہیں دیتا۔ اس یقین کا جاگزیں ہونا تھا کہ پھر قلب و روح پر وہی سرشاری کیفیت طاری ہوئی اور عالم ناسوت کی طرف ایک روحانی سفر شروع ہو گیا۔

یہ ریاضت ہم دونوں نے کافی کی ہے۔ ہر آٹھویں دسویں روز سلسلہ جوڑ لیا جاتا اور روحانی ارتقاء کی رفتار تسلی بخش طریقے پر آگے بڑھتی رہی۔ صوفی مسکین کو بھی اب بہت کچھ نظر آتا تھا۔ گو اپنے بھاری بدن کی وجہ سے وہ میرے ساتھ نہیں اڑ پاتے تھے۔ کبھی کبھی تو میرا بھی سفر کھوٹا کرتے۔ مثلاً آغاز سفر ہی میں میری ٹانگ پکڑ لی ہے تو ظاہر ہے انھیں لٹکا کر میری رفتار حسب معمول نہیں ہو سکتی تھی

آخر کار ایک حادثہ پیش آیا اور روحانی ارتقاء کا یہ ترقی پذیر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دراصل چھدّن اور کھبو لو کو جو درگاہ کے خدام میں سے تھے شبہ ہو گیا تھا کہ یہ آئے دن انھیں شہر کیوں بھیج دیا جاتا ہے۔ یار بار ہمیں معقول بہانے کہاں سے ہاتھ آتے۔ کئی مرتبہ تو ایسے ہی کمزور بہانوں کا سہارا لینا پڑا تھا کہ شبہ ہو اور پر ہو۔ ایک دن وہ دونوں مسکوٹ کر کے دیوار پھلانگ گئے۔ ہمارا ریاض جاری تھا اور صوفی مسکین آج بڑے بیچے دار لباس میں تھے۔ یہ مولوی قطب الدین کی محترم اہلیہ کی شادی کا جوڑا تھا۔ شاید پہلی ہی بار فیکٹری پہنچا تھا۔ مزید میک اپ بھی میں نے اسی کی مناسبت سے پُرشان دار کیا تھا۔ ان کم بختوں نے ریخوں سے جھانک کر دیکھا تو اک دم غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور ادھر ادھر صوفی مسکین کو ڈھونڈتے پھرے۔ وہ بھلا کہاں ملتے۔ اس پر وہ گدھے آس پاس کے لوگوں کو جمع کر لائے اور بڑے دردناک لہجے میں تقریباً بیس مرتبہ یہ بات دہرائی کہ صاحب غضب ہو گیا۔ ملّا مکّی نے درگاہ نجس کر دی۔ خدا جانے کس پانی کو گھیر کر کمرے میں بند کر رکھا ہے۔

کئی آوازیں آئیں ۔۔۔ "پلیس کو بلا لو۔"
کئی جوان مرد چیخے " ارے دروازہ تو کھلواؤ۔ اڑا دیں گے پاش پاش کو۔"

دروازے پر دو ہتھڑ پڑ رہے تھے اور کھولو کھولو کا طوفان مچ رہا تھا۔ لیکن یہ سارا طوفان بتاشے کی طرح بیٹھ گیا جب اندر کی زنجیر کھولتے ہوئے صوفی مسکین گلا پھاڑ کر چیخے۔

"کون ڈاکو گھس آئے ہیں۔ کیسا شور مچا رکھا ہے۔"

لوگ ہق دق رہ گئے۔ چھدّن اور کھبو لو کے چہرے تو زرد پڑ گئے کیونکہ صوفی مسکین اس وقت اپنے اصلی روپ میں تھے۔ ظاہر ہے پتہ کھڑکنے کے ساتھ ہی میں نے جوڑا اتروا دیا تھا اور مٹھیوں سے چوڑیاں بھی جدا کر لی تھیں۔ بس ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک کی سرخی ضرور باقی رہ گئی تھی تو اسے دیکھنے والوں نے پان کی سرخی ہی سمجھا ہو گا۔

جب چڑھ دوڑنے والوں نے چھدّن اور کھبو لو کے منھ میں گویا وہ ہکلا ہکلا کے کہنے لگے :۔

صاحب قسم اولاد کی ہم نے اپنی آنکھوں سے ماجرا دیکھا تھا۔ کمرے میں فقط ملّا صاحب اور کسی عورت کے سوا کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔"

"کیا بکتے ہو۔ دماغ خراب ہوا ہے"۔ صوفی جی دہاڑے
"جی ہاں جی نہیں ..... وہ گھبرا گئے"۔

"ٹھیرئیے صوفی صاحب"۔ میں آگے بڑھ آیا۔ "ان بیچاروں کا کیا قصور ہے صاحبان!" میں نے مجمع کو مخاطب کیا "جھوٹ فی الحقیقت یہ دونوں بھی نہیں بولتے مگر قصور ان کا یہ ہے کہ انھوں نے ہم اہل دل کی خلوت میں جھانکا اور بدگمانی کو دل میں جگہ دی۔ ہم دونوں نہ جانے کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ ہماری خلوتوں میں نہ جانے کون کون اوپر سے

آتا جاتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی آپ تانک جھانک کریں تو ایک نہیں کئی کئی پریاں اور حوریں حاضر باش نظر آئیں۔ لیکن ان کا تعلق اس ناپاک دنیا سے نہیں ہو گا۔ بے شک کچھ دیر پہلے ہم دونوں کو ایک خاص پیغام پہنچانے کے لئے بغداد شریف کے قطب حضرت مستانے رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آسمانی خادمہ کو یہاں بھیجا تھا۔ لیکن اب آپ اندر تشریف لا کر دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں چڑیا کا بچہ بھی نہیں"۔

لوگ بجائے تکا بوٹی کرنے کے عقیدتوں کا خمار آنکھوں میں لئے سلام کر کے دفع ہوئے اور فی الوقت چھان اور کھول تے بھی سرک ہی جاتے ہیں عافیت سمجھی۔ اب صوفی مسکین غرغرائے :-

"یار بڑی خیریت ہو گئی ——— مگر تم نے یہ تقریر کیا جھاڑ دی؟"

"آگے کے لئے گھر نکالا ہے صوفی صاحب! اب اگر یہ لوگ ہمارے تمہارے ساتھ سچ مچ کی ہیر وئن بھی دیکھیں گے تو اف نہیں کر سکیں گے"۔

نا بابا آج سے کان پکڑے ——— یہ تو اتفاق سے سب جاہل لٹھ تھے کوئی پڑھا لکھا آمرتا تو تم جانو آجکل پڑھے لکھوں کے عقیدے بہت خراب ہیں وہ کبھی بھی اس آسانی سے جان نہ چھوڑتے"۔

بچے ہیں آپ صوفی صاحب ——— پڑھے لکھوں کے لئے اپنے پاس نسخے اور ہیں۔ آپ کسی ایڈوکیٹ کو پکڑ لائیے نہ قائل کر دوں تو مونچھیں مونڈ دیجئے گا"۔

پھر بھی یار یہ سلسلہ اب نہیں چلے گا۔ ہم کوشش کرینگے کہ وہ سچ مچ کی ہیر وئنیں ہمارے ہاتھ لگ جائیں پھر ہم تم الگ الگ اپنا اپنا مراقبہ کیا کریں گے"۔

اس طرح یہ زریں سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے بے کیفی سے تنگ آکر صوفی جمن علی کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا کہ غلام کو حالت قبض سے نکال لیجئے۔ انھوں نے تفصیل پوچھی تو میں نے مجملاً اتنا بتایا کہ لاہوت و ناسوت سے گذر کر جنت تک پہنچ گیا ہوں مگر وہاں مرد ہی مرد ہیں۔ کوئی عورت ذات نہیں ملی کہ روح کو سہارا ملتا ——— عورت ذات کے بغیر جنت بھی ویران ہی نظر آتی ہے"۔

"پروا مت کرو" انھوں نے حوصلہ افزائی کی۔ "ابھی تین برزخ باقی ہیں۔ جب انھیں طے کر کے تمہاری روح حسن حقیقی سے نیا خلعت وجود حاصل کر لے گی تو تمہارا جوڑا تمہاری کوکھ سے جنم لے گا"۔

"یا رب رے ——— میں سمجھا نہیں پیر و مرشد"۔

"سمجھو گے بھی نہیں ——— شیخ سے آگے نکل جانے والے مرید ٹھوکریں ہی کھاتے ہیں۔ ان کا نور بصیرت شیخ کی مٹھی میں بند ہوتا ہے"۔

"حق فرمایا حضرت والا ——— مگر یہ کوکھ سے جنم لینے والی بات ذرا کھل کر فرمائیے"۔

"راستہ نا پو۔ اسرار و رموز کھل کر بیان نہیں ہوتے"

خلاصہ مطلب یہ کہ ایڈیٹر تجلی کو طریقت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اسی لئے وہ وقتاً فوقتاً ایسے سوالات میرے سر مارتے ہیں جن کا جواب ان کے علم ظاہری کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ آپ کئی بار دیکھ ہی چکے ہیں کہ خاص خاص سوالات انھوں نے میرے سپرد کئے اور قارئین تجلی میں ان کا وہ شاندار جواب پیش کر دیا کہ کتنے ہی خوش نصیب تو فقط انھیں پڑھ کر صوفی بن گئے۔

اب کی بھی یہی ہوا ہے۔ صبح کا سہانا وقت تھا مگر چڑیاں نہیں چہچہا رہی تھیں۔ اسی لئے فاروقی نے ابھی لحاف سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ اتنے میں ایڈیٹر صاحب کی جانی پہچانی کھنکار سنائی دی اور چڑیوں کے چہچہانے کا انتظار کئے بغیر مجھے لحاف چھوڑ دینا پڑا وہ باورچی خانے میں اپنی بہن سے تند لہجے میں پوچھ رہے تھے :-

"وہ کہاں ہے؟"

"وہ . . . . . . وہ شاید مسجد میں ہوں گے"۔

ملائن کی آواز میں خاصی بلندی تھی۔ اس بلندی میں ایک پیغام تھا۔ یہ دراصل میرے لئے الارم تھا۔ میں کوٹھری والی کھڑکی کھول کر چپکے سے باہر نکل گیا اور مسجد میں پہنچکر

منھ دھویا پھر گھر میں اس شان سے داخل ہوا کہ زبان پر جہری اور سری دونوں قسم کے ذکر تھے اور چہرہ خشوع و خضوع کے نور سے دمک رہا تھا۔ ایسے مواقع کے لئے میں تسبیح بھی ہمیشہ جیب میں رکھتا ہوں ۔ یہ اس وقت میرے ہاتھ میں لٹک رہی تھی اور اس کے دانوں پر کھٹا کھٹ میری انگلیاں چل رہی تھیں ۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟" ایڈیٹر صاحب کاٹ کھانے کے انداز میں غرائے ۔

میں نے جواب دیئے بغیر تسبیح والا ہاتھ آگے کو بڑھا دیا۔ منشاء یہ سمجھانا تھا کہ وظیفہ بیچ میں ہے زبان کھولنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے چہرے پر وہی جھلاہٹ نمودار ہوئی جو وہابیوں کے چہرۂ نامسعود پر اہل اللہ کے نظارے سے نمودار ہوتی ہے۔ شاید وہ تسبیح چھین کر چانٹا مارنے کا ارادہ کر رہے تھے گھبرا کر میں نے مخلوط ذکر کو خالص جہری میں تبدیل کر دیا۔ ظاہر ہے زبان سے زور دیا استغفار ہی نکلنا چاہئے تھا لیکن دفعتًا میں نے محسوس کیا کہ جل تو جلال تو کا وظیفہ بےساختہ حلق سے اُبل پڑا ہے۔ انگلیوں میں دبوچ کر میں بڑبڑایا۔

"حول ولا قوت ——— لاحول ولا ۔ ۔ ۔ ۔"

"کہاں سے آ رہے ہو؟" انھوں نے پھر اپنا سوال خشک لہجہ میں دہرایا۔

"قبرستان سے ۔ نماز فجر کے بعد پیر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنا میرا دائمی معمول ہے"۔

"لیکن تمہارے پیر تو کانپور میں دفن ہیں؟"۔

"ہوا کریں ۔ یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ اہل اللہ دفن کہیں بھی ہوں مگر وہ موجود ہر جگہ ہوا کرتے ہیں"۔

"تو پھر قبرستان کی کیا ضرورت ہے" وہ پاٹ دار آواز میں بولے "گھر بیٹھ کر بھی فاتحہ پڑھ سکتے ہو"۔

"یہ بھی آپ نہیں سمجھیں گے ۔ پیر رحمۃ اللہ علیہ روزانہ صبح دم جنگل بانس والی درگاہ میں ناشتہ کرنے ۔ ۔ ۔ اور مذاکرہ کرنے تشریف لاتے ہیں وہاں خواجہ بنیاد علی اور صوفی مرجان جیسے اکابر اہل اللہ دفن ہیں"۔

"میں تمہیں کسی دن زندہ دفن کر دوں گا اور پھر تمہاری روح ازنٹ کی طرح بلبلاتی پھرے گی۔ گدھے کہیں کے"۔

تھوڑی دیر بعد ایک لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے فرما رہے تھے :-

"اس میں کچھ سوالات ہیں ان کا جواب تمہیں لکھنا ہے"۔

"میں آجکل بہت مصروف ہوں جناب"۔

"ڈنڈے بجانے کے سوا تمہیں کیا مصروفیت ہو سکتی ہے"۔ وہ سرد لہجے میں بولے "لو پکڑو ——— جواب میں حماقتیں مت پھیلانا"۔

"پھر تو آپ خود ہی لکھ لیجئے۔ نیم کے درخت سے انگور پیدا نہیں ہو سکتے"۔

"بکواس مت کرو۔ یہ توقع تو مجھے خود بھی نہیں کہ تمہارے قلم سے کبھی کوئی ذمہ دارانہ تحریر نکل سکے گی تاہم ابتذال اور چھچھورے پن سے اجتناب کیا کرو مزاح اور پھکڑپن میں بڑا فرق ہے"۔

"یہ آپ کو کیا معلوم" میں نے انھیں نرم دیکھ کر کہا "مزاح علم و منطق کے کانٹے میں نہیں تلتا اسے سمجھنے کے لئے فطری صلاحیتوں کی ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھئے خفگی کی بات نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ صلاحیتیں تو ہر طرح کی آپ میں بھی ہیں۔ مگر یہ سنگین قسم کی سنجیدگی یہ وجاہت، یہ ٹھٹھرا ہوا انداز فکر ۔ ۔ ۔ ۔"

"چپ ہو جاؤ ——— تم چاہتے ہو میں بھی تمہاری طرح گدھا بن جاؤں۔ خوب سمجھ لو یہ سوال و جواب اسی بار چھپنے ہیں"۔

آپ یہ تو خیال فرمائیے کہ تازہ تجلی میں میں نے رضوان آباد کے اسٹیشن والی یتیم خانہ والی پارٹی کا ذکر خیر

کرنے کا وعدہ کیا ہے"۔

"کیا ہوگا۔ تمہارے وعدوں کی حقیقت سب جانتے ہیں"۔

"نہیں جناب۔ تجلی کی ڈاک تو آپ کا عنوان ہے مجھے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں"۔

"سمجھنے کی کوشش کرو —— بعض سوالات ردّی کر دینے کے بھی نہیں ہوتے مگر ان کا جواب بھی دینا میرے بس سے باہر ہوتا ہے —— دراصل ان کا جواب دینے کے لئے حماقت کی وافر مقدار درکار ہے"۔

پھر آپ مجھے کیوں آرڈر دیتے ہیں کہ حماقتیں نہ پھیلاؤں"۔

تمہاری حماقتیں بسا اوقات ابتذال کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ حماقت پھیلانا بڑا باریک فن ہے۔ حماقت سلیقے سے پھیلائی جائے تو اس پر بجائے غصے کے پیار آسکتا ہے"۔

قدوی اور ملائن دونوں دنگ تھے کہ آج یہ قبلہ و کعبہ کس موڈ میں ہیں۔ کہاں وہ بات بات پر انگارے اگلنے کی عادت۔ کہاں یہ ٹھنڈی چہکاریں۔ ملائن نے ناشتہ کی ٹرے سامنے رکھدی اور آج زندگی میں شاید پہلا یا دوسرا موقع تھا کہ ہم تینوں نے ساتھ اکل و شرب کیا۔

وہ چلے گئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے لفافہ کھول کر خط نکالا جو دو ورق پر مشتمل تھا۔ ڈر اس لئے رہا تھا کہ خدا معلوم سوالات کس نوع کے ہوں۔ کیا ضروری ہے کہ ہر سوال کا جواب مجھ سے بن ہی آئے۔ وہی ہوا۔ سوالات ایسے نکلے کہ طبیعت صاف ہوگئی۔ ملائن بڑی دلچسپی سے منتظر تھیں کہ میں پڑھ چکوں تو جلدی سے وہ پڑھیں۔ میری نظریں خط پر جمی ہوئی تھیں کہ وہ بیتابی سے بولیں:۔

"آپ تو شاید سو گئے۔ ذرا جلدی سے پڑھ لیجئے"۔

"پڑھ لیا —— مگر تم نہ پڑھو ورنہ سر پیٹ لوگی"۔

"مذاق مت کیجئے لائیے مجھے دیجئے"۔

"مذاق نہیں نیک بخت۔ یہ خالص روحانی معاملات ہیں۔ تمہارے فرشتے بھی ان کی تہہ کو نہیں پہونچ سکتے"۔

"خیر آپ دیجئے تو"۔

"لو پڑھ کر بتاؤ کیا جواب دینا چاہئے"۔

پڑھنے کے دوران ان کا چہرہ دیدنی تھا۔ اقلیدس کے نت نئے زاویئے بنے اور بگڑے۔ غصہ، ملال، تحیّر بیزاری سبھی کچھ ابھرتا دبتا نظر آرہا تھا۔ ایک طویل سانس لیکر وہ منمنائیں:۔

"حیرت ہے بھیّا نے اس استفسار کو لائق اعتناء کیسے سمجھ لیا میں تو اسے چولھے میں رکھ دیتی"۔

"اب رکھ دو۔ میری جان چھوٹ جائے گی"۔

"ہائے اللہ اب تو بھیا مار ہی ڈالیں گے"۔

"برداشت کرو۔ میں فوراً اسراغ دگا کر انھیں حوالۂ پولیس کر دوں گا"۔

"آپ خود جوجلا دیجئے"۔

"میں تمہیں بیوہ نہیں دیکھ سکتا —— تمہیں تو وہ شاید فقط گلا گھونٹ کر آرام سے قبر میں سلا دیں مگر مجھے تو توپ کی دم سے باندھ کر سڑکوں پر گھسیٹے پھریں گے۔ نہیں خط ضائع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

"پھر تو جواب لکھیئے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہی لکھ سکتے ہیں کہ شریعت میں ایسی لن ترانیوں کی کوئی قیمت نہیں۔ مگر کون آپ کی بات مانے گا۔ اللہ والوں کے مکاشفات کے آگے شریعت بیچاری کو کون پوچھتا ہے"۔

"یہی تو آفت ہے۔ تمہارے بھائی صاحب نے بھی شاید اسی لئے میرے سر یہ بلا ڈالی ہے کہ اگر انھوں نے قرآن و حدیث سے جواب دیا تو اللہ والوں کی ذریّت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگے گی"۔

"اور کیا۔ آپ اپنے علم تصوف کے جوہر دکھائیے یہ صوفیوں سے ربط و ضبط آخر کب کام آئے گا"۔

"اچھا جی —— اب تم بھی مسکا لگاؤ گی۔ پروا نہیں۔ میں بھی حضرت کشاف علی کی خدمت میں جاتا ہوں

وہ اگر اچھے موڈ میں ہوتے تو ایسا جواب دیں گے کہ تم اور تمہارے بھیّا عشق عشق کرتے پھریں گے"۔

ضرور جائیے، مگر کھانے کے وقت آجائیے گا مجھے بہن سلمیٰ کے گھر جانا ہے"۔

"کیوں وہاں کیا لڈو بٹ رہے ہیں؟"۔

"بمبئی سے خورشید آئی ہے"۔

"خورشید کون؟"۔

"ارے وہی خالو شمس الزماں کے چچا انیس الدین کے پھوپا زاد بھائی کی لڑکی ——"

معاذ اللہ —— کتنی بار سمجھایا ہے کہ میرے سامنے رشتوں کی انسائیکلوپیڈیا کھول کر مت بیٹھا کرو۔ کیوں نہیں کہتیں کہ میاں رئیس احمد کی بیٹی خرّتہ"۔

"اوہو آپ کو ابھی تک یاد ہے یہ نام۔ میں سمجھی تھی بھول گئے ہوں گے۔

"غلط سمجھی تھیں مجھے اپنی تاریخ پیدائش تک یاد ہے۔ نہ لیسے خرّتہ جیسی لڑکیوں کو آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا"۔

"کیوں؟" ملائن مجھے مشتبہ نظروں سے گھورتے ہوئے بولیں"۔

"بس یونہی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب پہلی ہی بار وہ ہمارے یہاں آئی تھی تو وہ مجھ سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کیں تھیں لیکن جب تک وہ باتیں کرتی رہی میں اس کے لمبے لمبے ناخنوں کو دیکھتا رہا تھا۔ یاد ہیں نا اس کے ناخن؟"۔

"یاد تو ہیں مگر اتنی جزرسی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیوں کرتے رہے تھے" ان کی آواز میں شک کا شعلہ کانپ رہا تھا۔

"آگئیں اپنی سطح پر —— نیک بخت نہ پوچھ ناخن ہی کیوں خاص طور پر میری آنکھوں میں سما گئے تھے — بمبئی کے ایک ہوٹل میں میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے خوش پوش بزرگ ایک گرل زینڈ کے ساتھ ناؤ نوش میں مشغول تھے کہ اتنے میں ایک عورت داخل ہوئی جو خیر سے ان کی بیوی تھی۔ وہ بڑے فیشن ایبل لباس میں تھی اور اس کے ناخن خدا کی پناہ پہلے تو میاں بیوی میں تو تو میں میں ہوئی پھر گرل زینڈ بھی بیچ میں بول تو دونوں عورتیں ایک دوسری سے لپٹ پڑیں۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ معاملہ عورتوں کا تھا۔ اس لئے بیچ بچاؤ کرانے کی بھی کسی مرد میں جرأت نہ ہوئی۔ دفعتاً گرل زینڈ کی نہایت دردناک چیخ سے ہوٹل کی فضا جھنجھنا اٹھی اور لوگ یہ دیکھ کر کانپ گئے کہ اس کی ایک آنکھ دوسری عورت کے لمبے ناخنوں نے باہر نکال لی ہے! میں کبھی وہ ہولناک نظارہ نہ بھول سکوں گا"۔

"جانے کب کب کی باتیں آپ نے یاد کر رکھی ہیں"۔

"بہت عاجز ہوں میں اپنے حافظے سے۔ جو بات گھس جاتی ہے نکلتی ہی نہیں —— خیر اب میں چلا"۔

حضرت کشاف علی کے کیا کہنے۔ مگر اس سے پہلے کہ بات آگے چلے ناظرین با تمکین وہ استفسار ملاحظہ فرمالیں جس کے سلسلہ میں یہ سارا چرخہ چل رہا ہے۔ مستفسر پاکستان کے ایک ملتانی بزرگ ہیں۔ انھوں نے اپنے ایڈیٹر تجلّی کو خطاب کرتے ہوئے ذیل کا والا نامہ ارسال فرمایا ہے: —

السلام علیکم!

مندرجہ ذیل تین واقعے قطب زماں حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری کے نام سے مشہور شخصیت حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی ناظم اعلیٰ جمعیت علماء اسلام و ممبر صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان نے روزنامہ "امروز لاہور" کے "شیخ التفسیر نمبر" میں شائع کرائے ہیں جن کی شرعی حیثیت مطلوب ہے؟

واقعہ نمبر (۱) ایک بار حضرت رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ایک شخص مر گیا میں نے کشفی حالت میں دیکھا کہ وہ ایمان سے خالی ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے بھائی کو بلا کر اپنا فرض پورا کیا اور اسے بتا دیا کہ تمہارے بھائی کا یہ حشر ہوا ہے لہٰذا مودودیت سے توبہ کر لو۔

واقعہ نمبر (۲) "مناظر اسلام" میں حضرت مولانا لال حسین اختر راوی ہیں کہ وہ آگرہ سے جماعت اسلامی میں اسلام

آباد پٹھان کوٹ جانا چاہتے تھے۔ راستے میں لاہور وہ اپنے استاد مکرم حضرت شیخ التفسیر کی خدمت میں حاضر ہوئے کی تعریف کرتے ہیں مگر میں جب اس کی طرف روحانی توجہ کرتا ہوں تو وہ مجھے مسخ نظر آتا ہے۔

واقعہ نمبر (۳) اس ضمن میں ایک اور واقعہ بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ ہندوستان کے ایک بہت بڑے عالم دین جو تمام ممالک اسلامیہ کی معمر ہستی ہیں اور بیک وقت اس زمانے کے دو اقطاب زماں کے خلیفہ مجاز ہیں لاہور آئے ہوئے تھے۔ وہ حضرت احمد علی سے ملنے کے لئے مسجد شیرانوالہ تشریف لائے تو آپ انھیں اپنے حجرے میں لے گئے آپ نے اندر لے جاکر ان سے کہا کہ اہل اللہ کے طریق سے ذرا میرے سامنے توجہ کرکے مودودی صاحب کی ایمانی کیفیت کا جائزہ لیجئے۔ چنانچہ جب انھوں نے حضرت قطب ماں مولانا احمد علی صاحب کے حکم کے مطابق مودودی صاحب کے قلم کی طرف متوجہ ہوکر دیکھا اور ایمانی حالت کا اندازہ کیا تو انھیں اس امر کا مشاہدہ ہوگیا کہ مودودی صاحب سرے ایمان سے خالی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی دن سے مودودی صاحب سے راہ و رسم بند کر دینے کا عہد کیا۔ اس طرح ایک اور شخص کو بھی حضرت نے مودودی صاحب کا مشاہدہ کرا دیا تھا۔ فقط والسلام۔

اس استفسار کا شایان شان جواب حاصل کرنے کی فکر میں عاجز گھر دن نکلے چلا جارہا تھا کہ مولوی صدر الدین مل گئے۔

کہاں بھاگے جا رہے ہو ملّا ——— تم یار عید کا چاند ہوگئے۔

"بہت پریشان ہوں مولانا۔ اس وقت جلدی ہے اجازت چاہوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ ہم تو تمہیں ڈھونڈ ہی رہے تھے"۔

"خیریت؟"۔

"آؤ ادھر ہوٹل میں بیٹھیں اطمینان سے باتیں ہوں گی"۔

چند لمحے بعد ہم ہوٹل کے ایک الگ گوشے میں گلاب جامن اور سموسوں کے ساتھ چائے کا شغل کر رہے تھے۔

"دیکھو دوست" دفعتاً انھوں نے بڑی لگاوٹ کے ساتھ فرمایا:-

"آج ایک کام تم سے آپڑا ہے انکار مت کرنا۔ معاملہ قوم و ملت کے مفاد کا ہے ہمارا ذاتی نہیں"۔

"قوم و ملت کس چڑیا کا نام ہے قبلہ یہ غلام کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ تاہم آپ حکم صادر کیجئے"۔

"حکم نہیں ملّا صاحب التماس ۔۔۔۔۔۔ یہ لیجئے نا گرم سموسہ بڑا خستہ ہے —— دراصل آپکے گہرے تعلقات حضرت شیخ برہان الدین سے ہیں اور قوم و ملت کے مفاد میں ہمیں ان ہی سے ایک کام آپڑا ہے"۔

"پھر قوم و ملت ——— یہ الفاظ میری سمجھ سے بالا ہیں جناب آپ معاملہ کی بات کہئے"۔

"معاملہ ۔۔۔۔۔۔ دراصل وہ تو آپ کو معلوم ہے نا کہ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی وفات کے بعد اب جمعیۃ العلماء کی صدارت کا انتخاب ہو رہا ہے بڑا نازک معاملہ ہے تمام بالغ نظر بزرگوں کا متفقہ فیصلہ تو یہ تھا کہ مولانا فخر الدین صاحب کو صدر رکھا جائے۔ آپ جانتے ہی ہیں وہ حضرت مولانا مدنی کے جانشین ہیں۔ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ بخاری کا درس دیتے ہیں۔ صاحب باطن ہیں۔ بیحد بزرگ ہیں۔ ہر اعتبار سے وہی صدارت کے مستحق ہیں، لیکن بعض شرپسندوں نے مفتی عتیق الرحمٰن کا نام کھڑا کر دیا ہے۔ اب بتایئے کہاں مولانا فخر الدین جیسا مرد جلیل اور کہاں مفتی عتیق الرحمٰن ——"

"بے شک" میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "آپ مولانا فخر الدین ہی کو صدر بنائیے مفتی صاحب کو ووٹ کون دے گا"۔

"یہی تو مصیبت ہے ملّا صاحب قوم اندھی ہے وہ حضرت شیخ الحدیث کی افضلیت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں"۔

"ارے آپ مفتی صاحب کے خلاف کفر کا فتوے نکلوا دیجئے"۔

"نکلوا دیتے مگر آفت تو یہ ہے کہ ایسا ہی فتویٰ ہمارے شیخ الحدیث کے بارے میں بھی مخالف پارٹی نکلوا سکتی ہے۔ اب مودودی وغیرہ کا معاملہ تو ہے نہیں کہ عوام ہماری ہی سنیں ان کی نہ سنیں ۔۔۔۔۔۔"

"ہوں ..... یہ واقعی دشواری ہے ...... مگر ایک اور ترکیب سمجھ میں آتی ہے ...... آپ پوسٹروں میں دونوں کے فوٹو شائع کریں اور عنوان دیں — "داڑھیاں ملاحظہ ہوں" —— ظاہر ہے حضرت شیخ الحدیث کی مفصل داڑھی کے آگے مفتی صاحب کا چراغ گل ہوجائے گا ۔۔۔۔"

"یہ پہلو پوسٹروں میں نہ سہی مگر خصوصی صحبتوں میں ہم لوگ نمایاں کرچکے ہیں۔ مگر آپ تو جانتے ہی ہیں مودودیت بری طرح پھیل گئی ہے۔ اکثر عوام یہ صاف سی بات ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ جس کی ڈاڑھی بڑی ہے وہی بزرگ بھی بڑا ہے۔"

"وہابی ہیں سسرے —— مگر غلام اس سلسلہ میں کیا کرسکتا ہے؟"

"بہت کچھ کرسکتا ہے۔ یہ ملاحظہ کیجئے۔"

انھوں نے جیبی بستے سے کچھ کاغذات نکال کر میرے سامنے رکھدیئے۔ یہ غالباً متعدد پوسٹروں کے مسودے تھے۔ ان میں سے ایک کی طرف انھوں نے خاص طور سے اشارہ کیا۔ اسے پڑھ کر اپنی طبیعت صاف ہوگئی۔

اس میں پہلے تو ملک و قوم کا مفصل تذکرہ تھا۔ پھر جمعیۃ کے مقدس کاز اور عظیم خدمات کا بیان۔ پھر حضرت مولانا فخرالدین کے اوصاف حمیدہ پر کئی سطریں صرف کی گئی تھیں۔ پھر وہ خاص حصہ تھا جسے آپ صاحب تحریر ہی کے الفاظ میں سنئے :-

"......... تو صاحبان صدارت کے لئے اگرچہ مفتی عتیق الرحمٰن کا نام آرہا ہے اور بے شک وہ بھی بظاہر بڑے دانشمند اور صاحب خیر بزرگ ہیں لیکن تمام اہل اللہ متبع علماء کی توجہ ایک خاص واقعہ کی طرف منعطف ہوگئی ہے جو یہ ہے کہ جمعیت کے ایک صاحب نسبت بزرگ خواجہ نفیس الدین خانقاہ غوثیہ تشریف لے گئے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ اس خانقاہ کے سجادے حضرت زبدۃ الاولیاء قدوۃ الاتقیاء ابدال زمانہ شیخ سرتاج علی نقشبندی کس پائے کے بزرگ ہیں۔ خواجہ نفیس الدین نے شیخ سے عرض کیا کہ ذرا روحانی طریقے پر بھی تو جائزہ لیجئے کہ شیخ الحدیث مولانا فخرالدین اور مفتی عتیق الرحمٰن میں کون جمعیت کی صدارت کے لئے زیادہ موزوں رہے گا۔ اس پر شیخ نے مراقبہ فرمایا اور سولہ منٹ چھ سکنڈ کے بعد یہ کاشفہ بیان فرمایا کہ بھائی مفتی عتیق الرحمٰن بظاہر تو واقعی نہایت نیک اور فہیم انسان نظر آتے ہیں لیکن بارگاہ ربانی میں ان کا ایمان مقبول نظر نہیں آتا۔ فرشتے میکائیل نے عزرائیل سے بالکل صاف لفظوں میں یہ بات کہی ہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن کی روح پر کالے دیو کا سایہ ہے جس کی وجہ سے ان کے کسی بھی عمل خیر کو نورانیت میسر نہیں۔ اسکے برخلاف شیخ الحدیث کا چرچا قدسیوں میں بڑی عظمت کے ساتھ ہے ان کی معیت کا شوق تو حوروں میں بھی بہت پایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب"۔

اس عبارت کے بعد شیخ سرتاج علی کی تصدیق بھی بایں الفاظ ثبت تھی :-

"فقیر ہرگز ہرگز کسی کی تنقیص پسند نہیں کرتا
لیکن یہ معاملہ چونکہ قوم و ملت کی فلاح کا ہے
اس لئے میاں نفیس الدین کے اصرار پر مجبور ہوکر
کشف کی طرف توجہ مرکوز کی اور جو کچھ منکشف
ہوا بہ نگاہ رفاہ عام نشر کردیا فمن اللہ
التوفیق وھو المستعان"۔

اس کے بعد دو تین بزرگوں کے ایسے ہی انکشافات درج مضمون تھے جن کا لب لباب یہ تھا کہ مفتی عتیق الرحمٰن کو صدر بنانا مناسب نہیں کیونکہ ان کے قلب و روح مسخ ہوچکے ہیں اور کراماً کاتبین نے ان کے اعمال خیر کو اعمالنامے میں درج ہی کرنا چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ کیا فائدہ اندراج سے جب ان اعمال میں نورانیت ہی نہیں۔

آخر میں شیخ برہان الدین کا بھی اسی کوالیٹی کا مکاشفہ درج تھا مگر اس کے آگے تصدیقی الفاظ نہیں تھے۔

"یہ کیا بات ہے؟" میں نے مولانا صدرالدین سے سوال کیا۔

"اسی کے سلسلہ میں تو آپ کو زحمت دینا چاہتا ہوں آپ جانتے ہیں کہ شیخ برہان الدین کا بھی کافی اثر ہے جمعیت کے بہت سے افراد ان کے مرید ہیں۔ ان کی تصدیق ہو جائے تو پوسٹر مکمل ہو جائے گا۔"

"تو کرا لیجئے تصدیق۔ جب مکاشفہ انھیں بھی ہو گیا ہے تو تصدیق میں کیا عذر ہوگا۔"

مولانا نے مجھے بڑی شفیق نظروں سے گھورا، پھر مسکرائے پھر ایک گلاب جامن پیش کرتے ہوئے بولے:۔

آپ سے کیا پردہ —— شیخ صاحب اگر توجہ دیں تو یہ مکاشفہ انھیں ضرور ہوگا۔ لیکن ابھی انھوں نے توجہ نہیں دی ہے۔ آپ اگر دیگر اہل اللہ کے مکاشفات دکھلا کر ان کی تصدیق لے لیں تو کام مکمل ہو جائے گا۔"

"یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ مراقبہ کرنے کی صورت میں جو کچھ شیخ صاحب پر منکشف ہوتا اسے آپ نے پہلے ہی طے کر دیا ہے؟" میں نے تحیر سے کہا:۔

"پھر کیا حرج ہے۔ ارے یار بات بہر حال ایک ہی بزرگ کے مکاشفے سے محقق ہو گئی۔ اب اگر شیخ برہان الدین بھی تائید کر دیں تو کیا قیامت ہو جائے گی۔۔ بات سمجھا کرو۔ ملک وملت کی فلاح کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر جناب ہمارے شیخ برہان الدین تو کشف وکرامت کے آدمی نہیں ہیں۔"

"نہ ہوں۔ بزرگ تو ہیں۔ انھیں تم سمجھا سکتے ہو کہ.. ۔ ۔ ۔ ۔ ارے یار تم تو خود عقلمند ہو۔ صرفہ بھی کچھ ہو جائے تو ڈر نہیں —— لو یہ رکھو ——"

دس دس کے دو نوٹ انھوں نے بڑھائے۔ مجھے پل بھر کو جھجھک ضرور ہوئی، لیکن پھر یہ سوچ کر قبول کر لئے کہ مال قوم کا ہے۔ قوم اپنی ہے، ہم قوم کے ہیں، تو جمعیت کی ہے۔ جمعیت کا بیڑا بغیر شیخ الحدیث کی صدارت کے پار نہیں ہو سکتا۔ صدارت کی باگ ڈور اگر مفتی عتیق الرحمٰن کے ہاتھ میں چلی گئی تو کالے دیو کا سایہ ساری قوم کے چہرے سیاہ کر دے گا اور سیاہ چہروں پر سفید داڑھیاں دیکھ کر نئی نسل کے کلیجے شق ہو جائیں گے۔ یہ سارا طوفان اگر حاجز کے بیس روپے قبول کر لینے سے رک سکتا ہے تو انھیں قبول کرنا بھی قوم وملت ہی کی زرّیں خدمت کہلائیگی۔

پھر پوسٹر چھپ گیا۔ شیخ برہان الدین کا مکاشفہ بھی اس میں مع تصدیق موجود تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب شیخ برہان الدین اس پوسٹر کو دیکھ کر خود بھی ہکّا بکّا رہ گئے تو مولوی صدرالدین میرے پیچھے عصا لیکر دوڑے اور نہایت تند لہجے میں فرمایا:۔

"خبیث وہ بیس روپے لوٹا دو ورنہ سر توڑ دوں گا۔"

"فدوی کا سر عصا پر وقف ہے مولانا۔ مار کر دیکھئے آپ کو عصا دوسرا خریدنا پڑے گا۔"

"تم نے مردود ہمیں دھوکا دیا۔ شیخ برہان اب ہر ایک سے کہتا ہے کہ مجھے ایسا کوئی مکاشفہ نہیں ہوا۔ نہ میں نے تصدیق کی"۔

"کہنے دیجئے۔ پوسٹر ہزاروں کی نظر سے گذر چکا ہے شیخ برہان الدین کس کس سے تردید کرتے پھریں گے۔"

"پھر بھی تمہیں ان کی طرف سے جھوٹ موٹ تصدیق نہیں کرنی چاہئے تھی"۔

"جھوٹ کیسا مولانا۔ جب آپ خود ہی کہہ چکے ہیں کہ شیخ صاحب اگر مراقبہ کرتے تو نتیجہ وہی نکلتا جو دوسرے بزرگوں کے مکاشفات کا نکلا ہے۔ پھر جھوٹ چہ معنی؟ اب تو یقیناً شیخ الحدیث صدر بن ہی جائیں گے —— تمہارا سر بن جائیں گے تمہیں نہیں معلوم مفتی عتیق الرحمٰن کے حامی کتنے چالاک ہیں۔ وہ داڑھی کی تقدیر

اور درس حدیث کی عظمت سے لوگوں کا دل پھیر کر یہ اچھالتے پھر رہے ہیں کہ دنیاوی امور میں مفتی صاحب ایسے ہیں اور ویسے ہیں ذیل پیسے ہیں ——— اتھ لعنت بھیجو جائیں گے سب جہنم میں، چلو تم تو چائے پلواؤ آج کا بل تمہارے ذمے رہے گا۔"

" باپ رے۔ نہیں مولانا آج تو اگر جیب میں پیسے ہوتے تو میں ضرور زہر خرید لاتا کیونکہ صدارت سے حضرت شیخ الحدیث کی محرومی مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی۔"

" محرومی تو خیر ناممکن ہے ہم نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ سہرا ضرور لگا رہے گا۔ تم یا ہمیشہ ہم سے کھاپی لیتے ہو مگر خود کبھی کچھ نہیں کھلاتے"۔

" کھلاؤں گا مولانا گلے گلے کھلاؤں گا ذرا وہ مبارک ساعت آنے دیجئے جب کل بہار معمہ کا پہلا انعام فقط ایک خوش نصیب کے حصے میں آئیگا۔ ذرا بتائیے تو اگر اشارہ ہو کہ جان جائے مگر یہ نہ جائے تو صدارت رکھیں گے یا وزارت؟"

" خواہ مخواہ دماغ چاٹتے ہو۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ کاہے کی صدارت کیسے فیصلہ کیا جا سکتا ہے"۔

" مان لیجئے جمعیتہ العلماء کی صدارت؟"۔

" کیوں مان لیں ——— بھاگ جاؤ تم سوائے بھیجا چاٹنے کے اور کسی کام کے نہیں"۔

میں بھاگ گیا حضرت کشاف علی کی حویلی دور نہیں تھی آج وہاں خاصی ریل پیل نظر آئی۔ گاندھی کیپ والے کتنے ہی کھدرپوش حاضر مجلس تھے۔ مولوی ذوالفقار۔ رگھبیر سنگھ لالہ دیکی نندن۔ صوفی بدرالزماں۔ بقول شخصے مقامی کانگریس نے اپنے جگر گوشے حضرت کشاف علی کی بارگاہ میں بھیج دئیے تھے۔ چائے پانی کا دور ابھی ابھی ختم ہوا تھا سب کے سب نہایت شگفتہ تھے۔

" کیوں بھئی کیا ماجرا ہے؟" میں نے میاں رضا حسین عرف ابو شبلی پوچھا جو میاں کے خادم خاص ہیں۔

" میاں کو کشف ہوا ہے، ساری رات مصلے پر کاٹی ہے"۔

" کیسا کشف؟"

" وہ جو بسنت پور کے حلقے میں الیکشن ہو رہا ہے کل یہ لوگ اسی کے سلسلہ میں آئے تھے۔ وہاں کانگریس کے مقابلہ میں ایک مسلم لیگی کھڑا ہوا ہے۔ اکثر مسلمان اسی کو ووٹ دینے کی سوچ رہے ہیں"۔

" مسلم لیگی ....؟"

" اور کیا جب کانگریس کے مقابلہ پر کھڑا ہوا ہے تو مسلم لیگی کے سوا کون ہوگا۔ میاں نے اسی کے بارے میں کشف کیا ہے"۔

" کشف کیا ہے .....؟"

" جی ہاں یہ سب لوگ آئے تھے کہ بسنت پور کے حلقے میں میاں کا بہت چرچا ہے اگر میاں نے کوئی اچھا کشف کر دیا تو مسلمان بھائی مسلم لیگی بدماش کے بھرے میں آنے سے بچ جائیں گے"۔

" پھر؟ ——— کچھ کشف کیا ہے؟"

" کیوں نہیں کیا۔ رات بھر مصلے پر سجدے میں پڑے رہے ہیں تین سو تیرہ روپے سوا گیارہ آنے کی تو نیاز گئی ہے"۔

" اللہ اکبر ——— پھر کیا پتا چلا؟"

" وہی مسلم لیگ ظاہر میں مومن باطن میں کافر ہے۔ کانگریس پارٹی کو اوپر والوں میں بڑی مرغوبیت حاصل ہے"۔

" مرغوبیت ———"

" پتا نہیں میاں نے ایسا ہی لفظ کہا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ بڑے پیر صاحب غوث اعظم دستگیر آجکل کانگریس ہی کے ٹکٹ کو ٹکٹ مان رہے ہیں۔ ایک سو نوا پال کانگریسی وزیروں کی مدد کے لئے اللہ پاک نے مقرر فرمائے ہیں"۔

" فقط ایک سو نو ——" میں نے حیرت ظاہر کی باقی وزیروں کا کیا ہوگا؟"

" باقی کا انتظام شاید مجذوبوں کے سپرد ہے ——— ہمیں ٹھیک یاد نہیں رہا۔ آپ لالہ دیکی نندن سے پوچھئے وہ سارے کشف کا اشتہار لکھ رہے ہیں۔ پوری خبر بسنت پور کے اخبار "حق کی پکار" میں چھپے گی ———"

کافی دیر بعد صوفی کشاف علی کی خدمت میں باریابی کا موقع مل سکا۔ دست مبارک کو بوسہ دینے کے بعد میں نے خط ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پڑھا اور مسکرا کر کہنے لگے۔

"یہ تو بالکل حق ہے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

"شرعی حیثیت؟"

"شرعی حیثیت کسی مولوی سے پوچھنی تھی" وہ برا سا منھ بنا کر بولے "ہم تو حقیقت بتا سکتے ہیں"۔

"وہی مطلب ہے۔ مولانا مودودی بظاہر مسلمان آدمی نظر آتے ہیں مگر یہ کشف ...."

"ارے بظاہر کی کیا حقیقت ہے۔ سب کچھ تو باطن ہے۔ حیرت کروگے ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال ظاہر میں خدا کے منکر ہیں مگر عالم باطن میں جب ان کی حقیقت و مقام کا جائزہ لیا گیا تو منکشف ہوا کہ کفار و ملحدین کی فہرست میں ان کا نام ہی نہیں ہے۔ اکابر اہل اللہ ان کے اعمالِ حسنہ میں نورانیت ملاحظہ کر رہے ہیں"۔

"مگر حضرت کفار کے اعمال تو سنا ہے حبط ہو جاتے ہیں"۔

"بے شک حبط ہو جاتے ہیں مگر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص ایمان لاکر رہے گا"۔

"یہ شخص ..... یعنی پنڈت جواہر لال؟" میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"اور کون —— ارے حیران کیوں ہو۔ ہم تو فرعون کی مغفرت سے بھی ناامید نہیں۔ آخر قرآن ہی میں تو ہے کہ وہ آخر وقت میں خدا کا قائل ہو گیا تھا ——"

"جی ہاں جی ہاں۔ شاید اسی لئے صوفی گنجان ایک دفعہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے خود فرعون کو جنت میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ قارزی غصے میں آکر ان سے لڑ پڑا تھا"۔

"خبردار صوفیاء سے سرکشی نہیں کیا کرتے۔ صوفی گنجان بھی اونچے درجے کے اولیاء ہیں۔ ان کے کشفوں کو تو ہمارے شیخ حضرت خواجہ عبدالقادر جیلانی رضوان اللہ علیہم بھی سند مانتے ہیں"

"علیہم ....؟"

"ہاں ہاں۔ تم کیا جانو وہ ایک میں ہزار ہیں اور ہزار میں ایک —— جاؤ اب ہم سوئیں گے رات بھر مصلّے پر رہے ہیں"

لوٹ کر گھر آیا تو ملائن نے بڑے پرشوق انداز میں پوچھا:-

"کہیے کیا کر آئے؟"۔

"اپنے وزیر اعظم کو جنت میں داخل کرا آیا تمہیں دوزخ میں بھیجوں گا"۔

"کیا بات جھلائے ہوئے آئے ہیں؟"

"پھر کیا خوشی سے ناچوں۔ فرعون جنت میں کبھی چلا گیا اور ہم یہاں جھک مار رہے ہیں"۔

"اچھا بھئی میں کچھ نہیں پوچھتی ——"

"کیا کہا بھائی۔ طلاق دینا چاہتی ہو ——"

"توبہ میری —— آپ تو زبان کو لگام ہی نہیں دیتے"

"ٹھیک ہے۔ میری ناک میں سوراخ کر کے رسّی ڈالدو اور بھیّا سے کہو اسے پکڑ کے ٹک ٹک کرتے پھرا کریں ——

معاذ اللہ ایسا استفسار میرے سر مارا ہے کہ سر دیواروں سے ٹکرایا کرو مگر جواب سمجھ میں نہ آئے ——"

سیدھا سادا جواب لکھ دیجئے۔ مولانا اشرف علیؒ نے تو بہشتی زیور میں یہی لکھا ہے کہ کشف و الہام حجت نہیں ہوتے۔ آپ بھی انھی کا حوالہ دیدیجئے"۔

"یہ حوالہ تمہارے بھیا بھی دے سکتے تھے۔ پھر میرے گلے میں پھندا کیوں ڈالا؟"

"اب ہر کیوں کا جواب تو میرے پاس نہیں ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہوں کہ آپ کے سر میں تیل ڈالدوں شاید دماغ کچھ چل نکلے"۔

"ہاں ہاں تم چاہتی ہی ہو کہ میرا دماغ چل جائے اور تم کسی پالتو کتے کی طرح میری گردن میں پٹا ڈال کر سہیلیوں کو دکھلاؤ کہ یہ ہیں میرے شوہر جنھیں میں اولاد کی طرح پال رہی ہوں"۔

"خدا آپ کو ہدایت دے یہ کس کس کا تیہا مجھ پر اتار رہے ہیں، نہیں جواب بن آتا تو واپس کر دیجئے بھیا کو خط۔ جلنے بھُننے سے کیا فائدہ"۔

"میں مولانا مودودی کی طرح تمہارے بھیا کو بھی حضرت کشاف علی سے جہنم میں بھجواؤں گا۔ حضرت کسی لاہوری یا ہزاروی سے کم نہیں ہیں تم مجھے زیادہ پریشان مت کیا کرو ورنہ تمہارے لئے بھی ایسا کشف کراؤں گا کہ ایک ہزار برس زندگی اور موت کے بیچوں بیچ لٹکی رہو گی۔ رونا چاہو گی مگر منھ سے قہقہے نکلیں گے ناک سے حقہ پیو گی — ہاں نہیں تو (ملّا نماز، صحبت باقی)

پرانے چراغ ● آئین لاہور کا تفہیم القرآن نمبر ● اسلامی بینک ● مسعود عالم ندوی ● عُرس کی حقیقت ۔

پرانے چراغ

از مولانا ابو الحسن علی ندوی ۔ مجلد ۔ صفحات ۴۶۴
قیمت سولہ روپے ۔
شائع کردہ :۔ مکتبۂ فردوس ۔ لکھنؤ ۔

خود کتاب کے الفاظ میں "معاصر شخصیتوں، بزرگوں، استادوں اور دوستوں سے متعلق تعارفی مضامین ۔ تأثرات، مشاہدات اور واقعات و معلومات کا دلچسپ مجموعہ" ہے

ان شخصیتوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا وصی اللہ فتح پوری، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی جیسی ہستیاں بھی ہیں اور جگر مراد آبادی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر زبیدی جیسی شخصیات بھی اور دوسرے ایسے لوگ بھی جو شہرت کے آسمان سے نسبتاً دور مگر مصنف کی نظر میں مؤمنانہ زندگی کی ٹھوس زمین سے بہت قریب تھے ۔ لیکن جیسا کہ مصنف موصوف نے "کچھ کتاب کے متعلق" لکھتے ہوئے فرمایا ہے :۔

"اس مجموعہ میں صرف انھیں حضرات کو شامل کیا گیا ہے جو اس دنیا سے رحلت کر گئے ...... زندہ شخصیتوں میں سے کسی کو بھی اس میں شامل نہیں کیا گیا اور وہ اس لئے کہ "وہ ابھی دنیا میں موجود ہیں اور ان کا درخت فضل و کمال نئے نئے برگ و بار لا رہا ہے"۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ ساڑھے چار سو سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا مجموعہ صرف دلچسپ ہی نہیں دل نواز بھی ہے مولانا علی میاں کے قلم میں جو مخصوص سادگی و پرکاری ہے اور قلب میں جو گداز اور سوز ہے اس کی بدولت لوگوں کا تذکرہ بھی خشک اور سپاٹ نہیں ہونے پایا جو قارئین کے لئے گم نام اور کمنام ہیں ۔ سیر و سوانح سے مصنف موصوف کو خود بقول ان کے آبائی اور "پشتینی" تعلق رہا ہے ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس یادِ رفتگاں کے اسلوب بیان میں سیر و سوانح نگاری کی مخصوص ادائیں پائی جاتی ہیں ۔

اشعار برمحل اشعار پیش کرنا مولانا علی میاں کا مخصوص ذوق ہے جو اس تذکرہ میں بڑا مزا پیدا کر گیا ۔ ہاں کہیں کہیں اشعار کے شعری وزن میں خلل محسوس ہوا اور یہ احساس ہوا کہ ایک غیر شاعر سے خواہ وہ کتنا ہی شعر پسند کیوں نہ ہو ایسی غلطی بالکل بھی بعید نہیں ۔ مثلاً صفحہ ۱۱۵ پر :۔

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم

کے ساتھ :۔

ز ترحم کرد دہقاں بچہ کار کشت مارا

کا مصرعہ پہلے حرف "در" پر ہی جھول کھا رہا ہے جو "در" کی "ر" کو بالکسر پڑھو تو وزن پورا ہوتا ہے مگر پھر معنی مختل ہو جاتے ہیں ۔

صفحہ ۱۰۷ پر :۔

"مصلحت را تہمت بر آہوئے چیں بستہ اند"

تہمت کو "تہمتے" پڑھو تو روانی پیدا ہو جاتی ہے ورنہ

ورنہ مصرعہ میں وزن و آہنگ بگڑتا ہے۔

صفحہ ۲۹۵ پر:۔ "مردند و آدمیت بخاک بردند" کا ترجمہ " دنیا سے چلے گئے اور آدمیت خاک میں مل گئی" قابل غور محسوس ہوا۔ اس لئے کہ خاک میں مل گئی" سے کسی شئے کی بربادی اور غارت ہو جانے کے معنی نکلتے ہیں اور الفاظ یا لابوں بھی اس ترجمہ کا ساتھ نہیں دیتے۔ سیدھا سادا ترجمہ یہ ہونا چاہئے کہ " آدمیت کو اپنے ساتھ قبر میں لے گئے"۔

کیا عجب ہے کہ یہ ترجمہ مولانا علی میاں کا نہیں بلکہ ان کے مسودہ نگار کے قلم کی تراش ہو! یوں بھی ہزاروں لاکھوں الفاظ کی اس کتاب میں بشری حسن کے طور پر کچھ تو قلم اور زبان کی لغزشیں ہوتی ہی چاہئیں۔

صفحہ ۳۰۲ پر " مدرسہ فرقانیہ کے تقاضے کبھی دامن کشاں تھے" میں دامن کشاں کی ترکیب اپنے معنی میں اصطلاحی روش سے ہٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دامن کشاں میں اصلاً دامن بچانے کا مفہوم پایا جاتا ہے اور دامن پکڑ کر کھینچنے کے معنی اس سے نکالنے میں زور آزمائی اور " تصرف" سے کام لینا ہوگا۔

اس کتاب میں مولانا علی میاں نے اپنے قارئین کو شکر کے لئے بہت کچھ دیا ہے اور شکوہ کے لئے کم از کم ہمیں صرف ایک موقعہ۔ ڈرتے ڈرتے عرض ہے کہ مولانا تھانویؒ کی شخصیت روحانی رُخ پر دبی دبی نظر آتی ہے۔ مصنف موصوف کا روحانی تعلق مولانا مدنیؒ سے اپنی جگہ۔ لیکن سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کا تقاضا ذاتی جذبات سے عاری ہو کر لکھنا ہے۔

آئین لاہور کا تفہیم القرآن

مدیر :۔ مظفر بیگ۔ قیمت نو روپے۔
صفحات بڑے سائز پر ۳۱۶۔

ہفت روزہ آئین لاہور کا یہ خصوصی نمبر دسمبر ۷۳ء میں شائع ہوا تھا مگر ہندوستان میں پہنچنے کے لئے اس پر ڈاک کے دروازے ماضیٔ قریب ہی میں کھلے ہیں تو اب ہمارے ہاتھوں تک " تبصرے" کے لئے پہنچا۔ ٹائٹل کی آب و تاب، سائز کی بڑائی اور صفحات کی زیادتی تو کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو کسی خصوصی نمبر کو واقعی " خصوصی نمبر بنا سکے۔ یہ تو خاص نمبروں کی دنیا کی عام بات ہے لیکن تفسیر تفہیم القرآن پر خصوصی نمبر کئی لحاظ سے خاص ندرت اور افادیت کی چیز ہے۔ قرآن مجید کے سرچشموں سے پیاس بجھانے کے لئے اس عہد کے دل و دماغ میں ایک عہد آفریں رجحان پیدا ہو چکا ہے۔ جیسا کہ اسی خصوصی نمبر کے ایک مضمون نگار نے بھی لکھا ہے۔ قرآن مجید کے متعلق عوام میں یہ خیال نہ جانے کب سے جما ہوا تھا کہ یہ خواص کے سمجھنے کی چیز ہی نہیں۔ اور وحی پر یہ کوئی پہلا انسانی ظلم نہیں تھا ——— ہر ملک اور ہر عہد میں ابلیس نے اسی غلط عقیدے کے ذریعہ انسانی عوام کو آسمانی علوم کی باران رحمت سے تہی دامن بنائے رکھا ہے اور یہ غلط عقیدہ خواص کی ذہنیت میں پیدا ہوا اور وہاں سے ان کے ذریعہ عوام میں اس کی تلقین قرآن کی عظمت و اعزاز کے نام پر ہوئی ——— خود ہمارے ملک میں ہم سے پہلے دیدوں کے سلسلہ میں ایسی ہی خوفناک ٹریجڈی ہو چکی ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے اہل وطن کروڑوں کی تعداد میں اپنے دھرم کی اس بنیادی کتاب سے کٹ کر رہ گئے۔ یہی حال یہود و نصاریٰ کا ہوا کہ "لا یعلمون الکتاب ......" کتاب اللہ کی ان کو ہوا تک نہیں لگی۔ اور اللہ کی کتابیں ہی آخر کار ان کے درمیان سے اٹھالی گئیں۔ اگر قرآن مجید کی حفاظت خدا خود نہ کرتا تو مسلمانوں کی قرآن فراموشی کا ٹھیک یہی انجام ہوتا۔

تفہیم القرآن اور صاحب تفہیم نے اس " ذہنی سرطان" کے زہرناک تاریود کو جس طرح اکھاڑ پھینکنے کی مقدس مہم سرانجام دی ہے اسی کا یہ خوبصورت نتیجہ ہے کہ قرآن مجید اور امت کے سواد اعظم کے درمیان کا یہ ہولناک فاصلہ گھٹتا چلا جا رہا ہے کاش امت اس کی قدر کر سکتی۔ جی چاہتا ہے کہ کاش اسی رُخ پر تفہیم القرآن کے خصوصی نمبر نکلتے اور ان میں اس کے مضامین کا فیضان عوامی ذہن کی سطح پر اتارنے کی نت نئی کاوشیں سامنے آتیں!

موجودہ زیر نظر "خاص نمبر" اپنی ترتیب و تسوید کے لحاظ سے " خاص نمبر" زیادہ ہے۔ " عام نمبر"۔ " عوام کا نمبر" کم ہے

ممکن ہے خاص نمبروں کا یہ سلسلہ ایک دن عوامی ذہن کی سطح سے بلند ہو کر اس پر کبھی اتر کر مستقبل میں کوئی ایسا "عام نمبر" بن جائے! اس میں علمیت کے پیرائے میں نہیں بلکہ جذبات اور زندگی کی دھڑکنوں کو چھوتی ہوئی نفسیاتی سنسنی زیادہ ہوگی ——— اثر اور تذکیر کا اہتمام زیادہ ہوگا عوامی ذہن دلائل سے کم اور واقعات سے زیادہ متأثر ہوتا ہے۔ قرآن مجید پر انسانوں نے جو عمل کیا ہے موجودہ عہد کا عوامی ذور علمی تفسیروں کی تشریح اس عملی تفسیر کے واقعات میں زیادہ دیکھنا چاہتا ہے، خاص نمبروں کی ضخامت اور بھاری بھرکم قیمتیں بھی غریب عوام کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں اس لئے ضخامت کو اس طرح کم کرنا کہ "کیفیت" مجروح نہ ہونے پائے۔ قرآن پر عملی واقعات کا عرق ریز "انتخاب" بھی چاہتا ہے۔ یوں بھی تبلیغی اور مشنری ذہن کے لوگوں کو اپنے عہد کی نفسیاتی حالت کا لحاظ کرنا چاہئے اور کون نہیں جانتا کہ زندگی کی مصروفیات نے ایک عذاب کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کے زیر اثر آدمی اب نہ لمبی تقریروں کو اچھی طرح سن پاتا ہے اور طول طویل تحریروں کو پڑھنے کے لائق رہا ہے۔ اگر ان ——— زاویوں سے ہٹ کر دیکھا جائے تو یہ خاص نمبر ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ مضامین میں تنوع بھی ہے اور ترتیب میں حسن و کمال بھی، طباعت دیدہ زیب بھی اور فنکارانہ بھی۔

اسلامی بینک ــ غیر سودی بینک کا مکمل نظام

از :- فیلسوف الشرق السید محمد باقر الصدر مدظلہ (نجف اشرف)

مترجم و مرتب و مقدمہ :- علامہ السید ذیشان حیدر جوادی۔

صفحات ۲۰۸ - بڑا سائز - مجلد قیمت تیس روپے

حجابی پبلیکیشن ۵ جیل روڈ۔ نارتھ کھاڑی کراس لین بمبئی نمبر ۹۔

ہم نے مصنف اور مترجم و مرتب صاحبان کے اسمائے گرامی ٹھیک اسی طرح نقل کر دیئے ہیں جس طرح وہ اس کتاب پر درج کئے گئے ہیں ——— اگرچہ یہ ہمارے اپنے ذوق کے لئے ایک "صبر آزما" خدمت سے کم نہ تھا کہ اس قدر بھاری بھرکم القاب و آداب کا بار "بطور نقل" بھی اٹھائیں سب سے عظیم ذات خود اللہ تعالیٰ کی ہے لیکن ہر مذہب و گروہ کا آدمی عموماً اس ہستی کا نام بغیر ایسے لوازمات کے لے لیتا ہے اور کوئی بے ادبی محسوس نہیں کرتا اس لئے کہ وہ یہاں اس حقیقت کا پورا شعور رکھتا ہے کہ جو فی الواقع عظیم ہو وہ وجود بجود عظیم ہے اور اس کی عظمت کا تخت آداب و القاب کے پائے چوبیں کے سہاروں سے بے نیاز ہے ——— تاہم ہم نے یہ القاب وغیرہ اس لئے نقل کر دیئے کہ اندیشہ تھا یہ حضرات ان کی کمی سے آزردہ ہوں گے اور بدگمان ہو سکتے ہیں کہ چونکہ یہ شخصیات شیعہ اسکول سے متعلق ہیں اسلئے ایک سنی تبصرہ نگار نے بربنائے عصبیت ان القاب و آداب اور دعائیہ کلمات کو دبا گیا۔

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں "اسلامی بینک" کے ایک غیر سودی نظام کا خاکہ پیش کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے اور اس کے مصنف کی شخصیت کی عبقری صفات پر سطریں کی سطریں سیاہ کرنے کے بعد اس ادعائی انداز سے کہ:-

"غیر منقسم ہندوستان میں جس تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے روشنی ڈالی ہے کسی دوسرے صاحب قلم نے ایسا بنیادی کام انجام نہیں دیا"۔ لیکن یہ کہ "مولانا نے موضوعات کی تنقیح میں پورے فن سے کام نہیں لیا اور اکثر مقامات پر موضوع آپس میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے ہیں — پوری کتاب پڑھنے کے بعد یہ اندازہ مشکل ہوتا ہے کہ اسلام میں سود کی حرمت اخلاقی ہے یا معاشی ......؟"

نیز یہ کہ "مولانا نے اسلامی بینک کے مسئلہ پر آکر قلم روک دیا اور کچھ نہیں لکھا" اور اس کا سبب یہ سمجھ لیا گیا کہ "مولانا مودودی کی ایک مجبوری یہ بھی

ہے کہ وہ بہرحال ایک مجتہد کے قول کے زیر سایہ اپنی تحقیق کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور خود صاحب صلاحیت ہونے کے باوجود اپنے بیانات میں کسی نہ کسی طرح سابق مجتہدین کے افکار کا پرتو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اگر انھوں نے مذہب شیعہ کی طرح باب اجتہاد کے مفتوح ہونے کا اعلان کر دیا ہوتا تو امت اسلامیہ ان افکار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتی "۔

ان سطور کو پڑھتے ہوئے بیساختہ جی چاہتا ہے کہ ذرا مودودی صاحب کے ان دیوبندی اور بریلوی حلقوں کی اس شتر کرائے کو دعوت فکر و نظر دیں کہ جن کے خیال میں مولانا مودودی خود مجتہد بن جانے کے لئے پر تول رہے ہیں اور ان کی عقل و درایت، روایت و نقل کی سمت میں بے لگام ہے ——— وہ حضرات ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں (بشرطیکہ مولانا کے لئے ان کے مقدس سینوں میں دل نام کی کوئی شے باقی رہ گئی ہو!) کہ وہ ایک شیعہ کی نظر میں وہ کسقدر مقلد ہیں اسلاف کے! اگر چہ خود اسی ہستی کی نظر میں وہ مجتہدانہ صلاحیتوں کے مالک بھی ہیں! باہر کے ایک آدمی کی ان کے متعلق یہ رائے اس قسم کی کتنی غلط فہمیوں کا کھمر صاف کر دینے کے لئے کافی ہے۔

بہرحال ——— زیر نظر کتاب جو ایک طرف اپنے "گیٹ اپ" کے لحاظ سے شاندار ہے اس قدر شاندار ادعائی انداز سے سامنے آئی اور اجتہاد کے دروازے کھولتی اور دوسروں کو کھول دینے کا مشورہ دیتی ہوئی ابھری تو فطری طور پر ہم نے اس کو غور و فکر کے ہاتھوں میں لیا اور اس حسن ظن کی فضا میں اس کا مطالعہ شروع کیا کہ دیکھیں تو سہی کیا واقعی سود اور بینکنگ کے ژولیدہ ترین مسائل کو اجتہاد کے ان مدعی حضرات نے حل کر کے دکھایا ہے یا نہیں؟ جب تک ہم اس کتاب کے اس حصے سے گذرتے رہے جہاں کتاب و سنت اور عقل و استدلال کی زبان میں "سود" کی ہولناک تباہ کاریوں اور سیاہ کاریوں کا ذکر تھا یہ حسن ظن بڑھتا گیا کہ اب یقیناً نہیں کہ یہ کتاب کوئی ایسا بینکنگ کے نظام کا خاکہ تجویز کرے کہ جسمیں "سود" کے خوں آشام عفریت کی پرچھائیں بھی نظر آ سکے ———

لیکن ——— اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! ۔ اسی دوسری منزل میں فکر و نظر اور استدلال و تعقل کیشی اور تضادات کے ایسے نمونے سامنے آنے شروع ہوئے کہ نہ صرف حسن ظن قائم رکھنا محال ہو گیا بلکہ یہ دیکھ کر عقل چکرا گئی کہ خدایا! ایسے انشمند لوگ بھی جو دوسروں کی معدوم غلطیوں تک کے وجود کو دیکھ لیتے ہیں اپنے قلم کی ایسی ہمالیائی ٹھوکروں کا کوئی جھٹکا محسوس تک نہیں کر سکے!

اس عقل کے خلاف نقل کیشی کا پہلا جھٹکا صفحہ ۵۱ پر "جواز ربا" کے عنوان اور اس کے تحت مندرجات نے لگایا جن میں موجودہ بینکنگ اور مجوزہ غیر سودی اسلامی بنکنگ کے خاکے کے "سودوں" کو دو مختلف چیزیں ثابت کرنے کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور جس کا حاصل یہ ہے کہ "سود مالک کی طرف سے وصول کئے جانے والے فائدہ کا نام ہے" اور چونکہ موجودہ بنکنگ لوگوں سے ان کی رقوم بطور قرض لے کر خود مالک ہو جاتے ہیں اس لئے ان کا سود "سود" ہے، اور ہمارا اسلامی بینک لوگوں سے ان کی رقوم "بطور امانت" لے گا اور انکی اجازت سے کاروبار میں لگائے گا اس لئے اس کا سود، سودی کاروبار نہیں بلکہ اسلام کی ایک اصطلاحی شکل "مضاربۃ" ہوگا۔ آگے چل کر اس مضاربۃ کی تفصیل یہ ملتی ہے کہ "اصحاب مال فائدہ میں فیصدی کے حساب سے طے کر لیں اور معاملہ ختم ہونے پر اسی حساب سے بینک سے وصول کر لیں (۷۷) اس لئے کہ بینک کا کاروبار شرعی اصطلاح میں "مضاربۃ" ہے (ص ۷۷) ——— اور ——— مضاربۃ کا قانون یہ ہے کہ اگر فائدہ ہو گیا تو خیر ورنہ کسی کو کچھ نہیں مل سکتا۔ صرف صاحب مال کا سرمایہ محفوظ رہے گا عامل کی محنت بالکل ضائع سمجھی جائے گی۔ (۷۸) ——— ——— لیکن صفحہ ۸۳ پر اس کے برعکس یہ ہے کہ "بینک صاحب مال ہے نہ عامل۔ اس کا کام صرف دونوں کے درمیان وساطت کا ہے۔ ۔ ۔ ۔ حق المحنت فائدے ہونے یا نہ ہونے کا پابند نہیں ہے۔ حق المحنت تو بہرحال دیا جائے گا چاہے سارا کاروبار

معطل ہو کر رہ جائے"۔ (ص ۸۳)

ص ۷۲ سے ص ۸۰ تک اس نزدلیدگی کو یوں سلجھایا ہے کہ مصنف کے سامنے دو طرح کی مضاربت ہے۔ ان میں سے ایک کو وہ قدیم اسلامی مضاربت کہتا ہے اور دوسری کو جدید اسلامی مضاربت۔ اور جہاں تک ہم سمجھ سکے دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ قدیم تصور میں مالک کا اصل سرمایہ اصل مالی نقصان کی شکل میں متاثر ہوتا ہے اور محض نفع نہ ہونے کی شکل میں محنت کار فریق کی محنت متاثر ہوتی ہے لیکن جدید "اجتہادی" فارمولے میں مالک کا اصل سرمایہ، بہرحال محفوظ رہتا ہے اور بینک کا حق المحنت بھی! ۔ اور جب سرمایہ کار کا اصل سرمایہ کسی نقصان سے متاثر نہ ہو تو پھر اس مضاربت کو "سود" کی جگہ مضاربت کہنا قدیم اسلامی مضاربت کے اصولوں کی خلاف ورزی ہونی چاہئے مگر مصنف اس کا یہ جواز نکال لیتے ہیں کہ "سود مالک کی طرف سے وصول کیا جانے والا نفع ہے اور ہمارا بینک مالک نہیں محض امانتوں کا امین ہے"۔ اب فوراً یہ سوال اٹھتا ہے کہ پھر امانتوں سے کاروبار کیسا اور وہ بھی سودی انداز کا ایسا کاروبار جس میں اصل سرمایہ بہرحال محفوظ رہیگا تو اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ "یہ مالکوں" کی اجازت سے ہوگا اور بینک امانت دار کی حیثیت سے اس کا مجاز ہے کہ امانت کو اپنے پاس رکھے یا کسی دوسرے کے حوالے کر دے"۔

ہمیں معلوم نہیں کہ شیعہ فقہ کی رو سے امانت کو کسی تیسرے آدمی کے حوالے کر دینا کہاں تک جائز ہے۔ سنی فقہ تو کسی بھی امانت کے سلسلہ میں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اسے مالک کی اجازت کے بغیر تیسرے ہاتھ دے۔ اسلئے کہ بالکل ممکن ہے کہ زید کی نظر میں عمر امین ہے اس نے امانت اس کے حوالے کر دی اور عمر کے خیال میں کوئی تیسرا آدمی امین ہے جو زید کی نظر میں امین نہیں اب اگر وہ اس تیسرے شخص کی طرف یہ امانت منتقل کرتا ہے تو ایک طرف زید کے منشا کے خلاف ہوگا دوسرے یوں تو امانت ایک ہاتھ سے ہزاروں ہاتھوں تک منتقل ہوتی چلی جا سکتی ہے اور آخر کار گم اور ضائع ہو جائے گی۔

بہرحال مالک کی اجازت اس حد تک چل جائے گی کہ وہ اس کا مجاز کر دے کہ وہ جہاں چاہے اس کے سرمایہ کو لگا دے مگر اس کاروبار کی شکل اگر قدیم اور اصل اسلامی مضاربت نہیں بلکہ تمام تر "جدید مضاربت" ہے جو ہماری نظری اور قدیم نظریہ کے لحاظ سے مضاربت نہیں کھلا سود ہے تو محض کسی فرد کی طرف سے اس کی اجازت دیدے تو جس طرح شراب کا کاروبار اور زنا حلال نہیں ہو سکتا حرام ہی رہے گا۔ اسی طرح اگر مصنف کے بینکنگ کے خاکے کو مضاربت "سود" ہے تو وہ محض سرمایہ کار کی اجازت سے حرمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔ مگر نہ جانے کیسے مصنف اور مترجم اور مرتب نے یہاں سرمایہ کاری کی "اجازت" کی طاقت کو تحلیل و تحریم کی خالص خدائی طاقت کے دوش بدوش کیسے لا کھڑا کیا ہے ——— ظاہر بات ہے اس چیستاں کو یا تو ہم اس لئے سمجھ نہ سکے کہ ہمارے یہاں اجتہاد کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لئے کھلا نہیں ہے، یا مصنف و مترجم اس لئے سمجھا نہ سکے کہ "اجتہاد" ان کی نظر میں فقہ کا نہیں محض ڈکشنری کا ایک عام لفظ ہے! اس "اجتہادی" بصیرت کا ایک اور نمونہ ایسا سامنے آیا کہ جو ہماری سمجھ کے پلے نہیں پڑا اور اجتہاد کی جائے اجتہاد کے تضاد نظر آیا اور وہ ہے" کافر حربی" کی اصطلاح کا اجتہادی پوسٹ مارٹم ——— کہا گیا ہے کہ:-

> "باب اجتہاد کو مفتوح تسلیم کرنے کے بعد کشادہ ذہن سے سوچا جائے تو واضح ہو جائیگا کہ اسلام میں کافر حربی کی اصطلاح ذمی کے مقابلہ میں استعمال ہوئی ہے اور جو کافر ذمی ہیں انھیں حربی تسلیم کیا گیا ہے (ص ۳۵)

قطع نظر اس کے کہ یہ جدید "اجتہاد" کیا چیز ہے اور اس کا کیا مقام ہے صفحہ ۵۲ پر کافر حربی کا تذکرہ یوں ملتا ہے کہ وہی کافر ذمی معلوم ہوتا ہے!

" بینک سے ملنے والا سود بعنوان سود نہیں لیا جاتا

ورنہ شریعت کی نظر میں حرام ہوتا .... بینک مالک نہیں ہے تو سود بھی نہیں ہے اور حرام بھی نہیں ہے ۔

بعینہ یہی کیفیت کافر حربی کے مال کی ہے کہ اسلام نے اسے عارضی طور پر معاملات کو باقی رکھنے کے لئے مالک تسلیم کر لیا ہے ورنہ کسی بھی قانون میں باغی کو مالکانہ حقوق نہیں دیئے جاتے .... وہ مالک کا باغی ہے اور باغی کو واقعی ملکیت کا کوئی حق نہیں ہے ـــ (ص ۵۲) ..... مطلب یہ ہے کہ کافر کا مال بھی بطور " سود " حلال نہیں ہوتا بلکہ ملکیت سے خارج ہو جانے کی بنا پر حلال ہو جاتا ہے اور سود وہ مال ہے جو مالک کی طرف سے دیا جاتا ہے " (ص ۵۳)

عبارت بالا میں اسلام کو اس شکل میں پیش کیا ہے جو کافر کو حقوق دیتے نہ دیتے کے مقام پر متمکن ہے تو یہ صورت اسلامی ریاست ہی میں ممکن ہو سکتی ہے اور جہاں اسلامی ریاست ہے وہاں کا کافر ذمی ہوگا اور اس عبارت میں اس کے لئے " حربی " کا لفظ استعمال کیا جائے تو ذمی اور حربی دونوں ہم معنی لفظ ہو جائیں گے ! ـــــ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ " عملی " نہیں محض " نظری " گفتگو ہو رہی ہو اور منشا یہ ہو کہ کسی بھی ... پر رہنے والا کوئی کافر اسلامی تعلیمات و عقائد کے لحاظ سے اپنی کسی چیز کا مالک اس لئے نہیں کہ وہ اصل ... خدا کا باغی ہے ـــــ اگر مصنف کا منشا یہ ہے ... پھر کافر اپنی کسی بھی شے کا مالک نہیں ہوگا خواہ وہ ذمی ... یا غیر ذمی ... اور اگر آپ کی اس نظری بنیاد کو ... مان کر چلا جائے تو گویا نہ اس کی جان کی خیریت ہے ... مال کی ، نہ اس کی آبرو اور عصمت کی ۔ آپ اسے محض ... ت سود کے زاویے سے محض مال تک کیسے محدود کرتے ... ں اور مالیات میں بھی صرف سود لینے تک ـــــ چوری ... ں کے مال کی بھی شاید آپ کی نظر میں چوری ہوگی اور قتل ... ں کا بھی قتل ہی شمار ہوگا ـــــ کیا شیعہ علم حدیث میں حضورؐ کی وہ حدیث شامل ہے کہ نہیں کہ جس میں آپؐ نے امت کو یہ دھمکی دیکر قرار دیا ہے کہ اسلامی حکومت میں بسنے والے کسی ذمی کافر کو ستانے والوں پر قیامت کے دن خود آنحضرتؐ اس مسلمان کے خلاف اللہ کی عدالت میں دعویٰ دائر کریں گے ۔

ہمیں افسوس ہے کہ جس کتاب کو ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک " عظیم معاشیاتی دریافت " کی شان سے بطور " شاہکار اولیں " پیش کیا گیا ہے مندرجہ بالا الجھنوں نے اس کی قدر و قیمت محسوس کرنے کی خوشی تک ہمیں پہنچنے ہی نہیں دیا ـــــ لیکن ہمیں اس کا کوئی دکھ نہیں کہ ہمارے حصہ میں یہ " محرومی " اس لئے کیوں آئی کہ ہمارے نزدیک اجتہاد کا مقام کم از کم ایورسٹ کے برابر تو تسلیم ہونا ہی چاہیئے کہ جس تک ہزاروں پہنچنے میں ناکام ہوتے ہیں تو کہیں دو ایک کو بمشکل رسائی حاصل ہوتی ہے ۔ اگر ایورسٹ کو سر کرنا اور چاند کی سطح پر پاؤں رکھ دینا ہر کوہ پیما اور خلا باز کا کام نہیں بلکہ اس کارنامہ کو سالہا سال کسی مرد میدان کا انتظار کرنا پڑتا ہے تو پھر ان سے بلند تر مقام بلند ترین مقام یعنی فرش زمیں کے دینی مسائل کی تعبیر صحیح کے لئے عرش عظیم کے مالک کے مافی الضمیر تک پرواز کرنے والا نہ ہر عقل و علم والا ہو سکتا ہے اور ہر وقت یہ ممکن ہے اس کار عظیم کو بھی اگر سالہا سال اپنے کارکن کا انتظار کرنا پڑے تو کیا تعجب ہے ۔ چمن میں ایک دیدہ ور کی پیدائش کے لئے نرگس کو ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ رونا پڑتا ہے تو کیا تعجب ۔ ؟

مسعود عالم ندوی (سوانح و مکتوبات)

از :- اختر راہی ایم ۔ اے ۔

شائع کردہ مکتبہ ظفر ناشر قرآنی قطعات گجرات محلہ فیض آباد ۔ سرگودھا روڈ (پاکستان)

ضخامت ۱۰۴ صفحات ۔ قیمت چھ روپے ۔

تحریک اسلامی کے ان سرگرم کارکنوں میں سے ایک تھے کہ جن کی موت پر تحریک کے میر کارواں نے یہ کہا تھا کہ "اسکے بعد سے اپنا ایک بازو ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ شاید جسم کے بازو کے ٹوٹنے کی بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی روح کے اس بازو کے ٹوٹ جانے سے محسوس ہو رہی ہے"

اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کی اس قیمت کا عملی ثبوت ان کی وہ آٹھ تصنیفات ہیں جو ان کی علمی تحقیقات کا خزانہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن اختر راہی صاحب ایم۔اے نے اس کتاب میں مولانا مرحوم کے جو خطوط اکٹھے کئے ہیں وہ شاید ان کی عملی زندگی کا تعارف کرانے میں مشعل راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ علمی تحقیقات ایک چیز ہیں اور عملی ریاضت بالکل دوسری۔ انسان کی قیمت خدا کی آخری ترازو میں بھی اور انسان کی میزانِ فکر و نظر میں بھی اس کے کردار و عمل سے بنتی اور بگڑتی ہے۔ اگرچہ مرتب نے سوانح کے صفحات میں مولانا کی عملی زندگی کے واقعات بہت مختصر اور کم دیئے ہیں تاہم ان سے بھی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس مشت استخواں میں کیسی عظیم روحِ مسلمانی چھپی ہوئی تھی۔

یہ بھی ایک عجیب معاملہ ہے نظامِ فطرت کا کہ خدا کے دین کے کام آنے والے لوگ ایسے بھی تھے جو گو شہرت کے اعتبار سے ہلکے پھلکے اور ظاہری چمک دمک سے مالا مال نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خاک نشینوں سے دین کے بلند کارناموں کے ہفت افلاک اکثر و بیشتر طے کرائے ہیں۔ خطوط اگرچہ روزمرہ کی عام زندگی سے زیادہ متعلق ہیں لیکن پھر بھی دین و دانش کے سرسری اشارے سے بھی بلا کے معنی خیز اور حیات انگیز ہیں۔

صفحہ ۳۲ پر:۔ "عرصہ میں تقریباً ماہ رہے" والے جملے میں عبارت قیام کا ہندسہ چھوٹ گیا ہے۔ صفحہ ۳۳ پر: خدا کی راہ میں مولانا کی اسیری کے چار ماہ کا تذکرہ بڑا ایمان افروز ہے:-

"۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کی صبح دروازہ پر دستک ہوئی اور معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ مولانا کو سرکار بلانا چاہتی ہے۔ مولانا جو بستر پر نڈھال پڑے تھے۔ یہ سنتے ہی ان کی ایمانی حرارت جوش میں آئی۔ فوراً اٹھے اور پولیس والوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ سوا چار ماہ قید و بند میں گذارے جس شخص نے امام احمد بن حنبلؒ کی استقامت اور اہلِ صادق پور کی عزیمت کی داستان مزے لے لے کر بیان کی تھی اسے بھی اس وقت کے چند جرعے مل گئے۔ ان چار مہینوں میں انھوں نے قید و بند کی تکالیف جس خندہ پیشانی اور صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیں وہ اپنی مثال آپ ہیں"۔

صفحہ ۳۴ پر:- "پرہیز" کو مؤنث استعمال کر دیا گیا شاید اہلِ زباں اور زبان داں میں یہی فرق باقی رہتا ہے جو ان دو شخصوں میں کہ جس میں سے ایک نے محض کتابی علم سے دین سیکھا اور دوسرا وہ جس نے بزرگانِ خدا کی صحبت سے جیتا جاگتا دین حاصل کیا ہو! غالباً اختر راہی صاحب کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔

عرس کی حقیقت

از:- جناب محمد اشفاق حسین صاحب۔
ناول سائز۔ صفحات ۱۴۸۔ قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ مرکزی کمتبہ جماعت اہلحدیث دکن۔ اے۔ پی۔

یہ کتاب بڑے شرح و بسط سے عقل اور نقل کی روشنی میں یہ ثابت کرتی ہے کہ عرس کی کوئی بنیاد کتاب و سنت میں نہیں ملتی اور نہ فقہاء اور سلف صالحین کے یہاں اس کا کوئی بنیادی سرا ملتا ہے۔ اس کے برعکس اس کے سارے قد و خال غیر اسلامی اور مشرکانہ طبقات میں ضرور ملتے ہیں اور اس درجہ کہ یہ سراسر غیروں کے گھر سے "مانگا ہوا اندھیارا" معلوم ہوتا ہے۔ مجموعی طور سے کتاب کا اسلوب اور طرزِ استدلال علمی بھی ہے اور تذکیری و تبلیغی بھی۔ اے کاش عرس کے ہمنوا

مسلمان بھائی ٹھنڈے دل سے اس پہلو پر غور کریں کہ جس مقدس ہستی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عشق کا دعویٰ ان کا بنیادی محورِ عقیدت ہے۔ یہ عرس انھیں اس ہستی کے فکر و نظر سے کاٹ کر اس کے دشمنوں کے نقوشِ قدم پر کتنی وضاحت کے ساتھ چلائے ہوئے ہے۔ اس کے صفحہ ۱۱۱ و ۱۱۲ پر پنڈت موتی لال نہرو کا بیان نہایت معنی خیز اشارہ ہے جنھوں نے عرس کو دیکھ کر کہا تھا کہ کفر و اسلام میں مصالحت بالکل ممکن ہے!

اس کتاب کے مصنف کی خدمت میں ہماری ہمدردانہ گذارش یہ ہے کہ اس ارادہ میں ماضی کی تلخیوں کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں کہیں زبان و بیان کی ایسی تندی کو دور کرنے کی سعی کریں جس سے مخالفین کی اس معاملہ میں ذکاوت حس کو بات کا بتنگڑ بنانے کا بہانہ نہ مل سکے۔ مثلاً صفحہ ۴ پر "خدا کی خدائی، اس کی رحمانیت اور رحیمیت و افدار ملیامیٹ ہوجاتی ہے!"۔ ایک ایسا جملہ ہے کہ جس کو مخالفین آپ کے اصل منشا سے ہٹا کر طنز و ملامت کی رسوا کن راہ پر ڈال سکتے ہیں۔

آپ جو کہنا چاہتے ہیں اس کا تقاضا تھا کہ یہ بات اس طرح کہتے کہ "خدا کی خدائی اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کا عقیدہ و اقدار ملیامیٹ ہوجاتا ہے"۔

مخالفین کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بھی ضروری تھا کہ احادیث کے ترجمہ پر اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ عربی متن بھی دیتے اور کسی جگہ بھی محض یہ کہہ کر نہ گذر جاتے کہ حضور نے ایسا اور ویسا ارشاد فرمایا ہے۔ ضروری تھا کہ وہاں حدیث دیتے یا کم از کم حدیث کا حوالہ ضرور دیا جاتا۔ جب کہ آپ خوب جانتے ہیں کہ جو لوگ ان مسائل میں غالی عصبیت کے مارگزیدہ ہیں وہ عوام کو یہی کہہ کر بھڑکاتے ہیں اور بہکاتے ہیں کہ ان لوگوں کا تو قرآن و حدیث ہی دوسرا ہے۔

صفحہ ۶۰ پر یہ جملہ "صرف وہی سنت قابل اتباع ہو سکتی ہے جس پر حضور نے مداومت کی ہو ....." محل نظر ہے۔ اگرچہ آگے چل کر اس جملہ نے مفہوم درست کر دیا "اور اس پر صحابہ کرام نے عمل بھی کیا ہو" ———— اس لئے کہ سنت غیر مؤکدہ بھی سنت ہے اگرچہ اس پر حضور نے مداومت نہیں فرمائی۔

کئی جگہ کتابت و طباعت کی غلطیاں قابل اصلاح نظر آئیں۔ مثلاً صفحہ ۸ پر "تراشہ جلئے گا۔" "تراشا جائے گا" ہونا چاہئے۔

صفحہ ۴۳ پر "بحوالۂ ارکان" - "بحوالہ ارکان اربعہ" ہوتا۔

صفحہ ۵۲ پر "خلط ملط اور التجاس" کی جگہ "خلط ملط اور التباس" ہونا چاہئے۔

(بقیہ مراسلہ از صفحہ ۸۰)

کہ عوام سے ان کتابوں کی قیمت کیوں وصول کی جاتی ہے جن کے پورے پورے ایڈیشن کی قیمت یکمشت کوئی صاحب خیر ادا کر چکا ہو۔

حقیقتاً یہ ایسی تجارت ہے جس کے نفع پر اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیب چاروں طرف سے بھرتی ہے نقصان کا کوئی پہلو نہیں۔

پھر بھی دعویٰ یہ ہے کہ ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں اور اسلام کے محسن ہیں:

(بقیہ تجلّی کی ڈاک از ص ۵۸)

اور ممکن ہے کہ رحم دل بھی ہوں۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اگر میرے شہر کا کوئی ڈاکٹر کسی معصوم لڑکی کی آبرو لوٹ لے اور اس کے آنسوؤں پر رحم نہ کھائے۔ میں یہ دردناک واقعہ سنکر چراغ پا ہو جاؤں اور کسی چوراہے پر کھڑا ہو کر یہ شور مچانے لگوں کہ دنیا بھر کے تمام ڈاکٹر ظالم اور عیاش ہوتے ہیں اور دنیا بھر کے تمام ہسپتالوں میں آوارگیاں، بے حیائیاں پھیلی ہوئی ہیں تو کیا میرا یہ شور مچانا مبنی بر انصاف ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ دنیا کا کوئی سمجھدار آدمی میری اس واویلا کو دیوانے کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں دے سکتا تو بھلا بتائیے آپ کا کسی ایک مولوی کی نازیبا حرکات سے بدظن ہو کر دنیا کے تمام علماء اور تمام مدارس پر الفاظ کے بم برسا دینا سمجھداری پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے اور اس چیخ و پکار کو عدل و دیانت کے نعروں سے تعبیر کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

اس کا احساس ہمیں بھی ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے ہزاروں مدارس قائم ہو گئے ہیں یہ دینی اداروں کو زبردست نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ ان چندوں کو بلا تأمل قبول کر لیتے ہیں جن میں مال حرام برابر کا شامل ہو بلکہ ان چندوں کو بھی بلا کراہت قبول کر لیا جاتا ہے جن میں مال حرام غالب اور مالِ حلال مغلوب بلکہ برائے نام ہو۔

چھوٹے مدارس کی ان کوتاہیوں پر آپ کا غصہ بجا بلکہ پیار کے قابل لیکن چند مدارس کی لاپرواہیوں اور چند غیر محتاط مولویوں کی غیر ذمہ داریوں کی وجہ سے تمام دینی مدارس اور تمام علمائے کرام پر تیشہ زنی کر دینا کہاں کی سنجیدگی ہے۔

آپ کے خط کا آخری حصہ غیر سنجیدہ باتوں سے مملو تھا۔ اس لئے میں نے اسے حذف کر دیا ہے ممکن ہے کہ یہ حذف اور کانٹ چھانٹ ناراضگی کا باع
بن جائے۔ اگر ایسا ہو تو مجھے اس کی پرواہ نہیں ہزا
قارئین کی ناراضگی مول لینے سے کہیں بہتر اور آسا
بات یہ ہے کہ میں کسی ایک شخص کی ناراضگی و خفگ
بخوشی قبول کر لوں۔

—— اپنے دوسرے سوال کا جواب اگلے شمارہ میں ملا
فرمائیے۔

قابلِ توجہ

سوالات ارسال کرتے وقت ان چند شرائط کو ملحوظ ر

(۱) ایک مرتبہ میں تین سے زائد سوال ارسال مت کیج

(۲) سوالات خوشخط اور مختصر ہوں۔ اگر آپ صا
صاف لکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو دو سطروں کے د
فاصلہ چھوڑ دیجئے تاکہ ہمیں پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔ بعـ
سوالات بڑے اہم اور قابل اشاعت ہوتے ہ
لیکن بدخط ہونے کی وجہ سے انھیں نظر انداز کر دیا
ہے۔

(۳) سوال کو آپ تجلی میں شائع کرنے کے خواہشم
ہوں تو ان کے ہمراہ بھی جوابی لفافہ ضرور بھیجئے۔ ضرو
نہیں کہ آپ کے سوال کو تجلی کے صفحات میں جگہ نصیب
ہو سکے جگہ نصیب نہ ہو سکی تو آپ کے سوالات کا جواب
بذریعہ ڈاک دیدیا جائے گا۔ اگر آپ نے سوال کے ہم
جوابی خط روانہ نہیں کیا ہے اور تجلی کی تین اشاعتوں م
آپ کا سوال شائع نہیں ہو سکا ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے سوا
کو غیر ضروری کاغذات کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا ہے (۴) سوال
آخیر میں یا خط کی پیشانی پر اپنا نام اور مکمل پتہ صاف صاف تحر
کیجئے اور اگر آپ تجلی کے خریدار ہوں تو خریداری نمبر ضرور ڈالئ

(۵) ان شرائط کا اگر آپ نے لحاظ نہیں رکھا اور آپ
سوالات نظر انداز کر دیئے گئے تو آپ کو شکایت کا
کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

مختلف موضوع پر چند اہم کتابیں

احادیث

بخاری شریف صرف عربی عکسی مکمل غیر مجلد ۔۔۔ ۱۲۸/-
〃 〃 صرف اردو مکمل 〃 ۔۔۔ ۶۹/-
〃 〃 عربی مع اردو مکمل 〃 ۔۔۔ ۱۲۹/-
تجرید بخاری اردو مجلد ۔۔۔ ۱۳/-
مشکوٰۃ شریف صرف عربی غیر مجلد ۔۔۔ ۵۴/-
〃 〃 عربی مع اردو 〃 ۔۔۔ ۶۶/-
〃 〃 صرف اردو مکمل مجلد ۔۔۔ ۱۵/-
مسلم صرف عربی ۔ غیر مجلد ۔۔۔ ۹۰/-
مسلم شریف عربی مع اردو ترجمہ اور شرح نووی غیر مجلد ۔۔۔ ۱۲۹/-
〃 〃 صرف اردو مجلد ۔۔۔ ۱۴/-
ترمذی شریف صرف اردو مجلد ۔۔۔ ۲۲/-
مسند امام اعظم ابو حنیفہؒ ۔ اردو مع عربی مجلد ۔۔۔ ۱۲/-
مشارق الانوار اردو مع عربی مجلد ۔۔۔ ۴۰/-
انتخاب صحاح ستہ اردو مع عربی مجلد ۔۔۔ ۹/-
بلوغ المرام صرف عربی ۔۔۔ ۵/۲۵
〃 اردو مع عربی بلا مجلد ۔۔۔ ۱۸/-
شمائل ترمذی مع شرح اردو ۔۔۔ ۱۵/-
تقریر بخاری اردو ۔ مولانا محمد زکریا حصہ اول مجلد ۔۔۔ ۱۲/-
〃 〃 〃 〃 حصہ دوم 〃 ۔۔۔ ۱۲/۵۰
معارف الحدیث ۔ حدیث کی اردو شرح مع عربی حصہ اول تا چہارم مجلد ۔۔۔ ۲۹/۵۰

مسند امام احمد بن حنبلؒ کی جلد اول مسند ابو بکر صدیقؓ کی اردو شرح مع عربی متن ۔۔۔ مجلد ۔۔۔ ۳۰/-
معارف السنہ ۔ انتخاب حدیث اردو مولانا احتشام الحسن ۔۔۔ مجلد ۔۔۔ ۵/-
مشعل راہ ۔ انتخاب حدیث اردو مولانا عبد الرؤف ۔ غیر مجلد ۔۔۔ ۶/-
ابو داؤد شریف ۔ صرف عربی غیر مجلد ۔۔۔ ۶۶/-
ابن ماجہ 〃 〃 〃 〃 ۔۔۔ ۴۲/-
آثار السنن مکمل 〃 〃 〃 ۔۔۔ ۱۰/-
جمع الفوائد (۱۴ کتب کا مجموعہ) ۔ عربی غیر مجلد ۔۔۔ ۴۲/-
طحاوی شریف 〃 〃 ۔۔۔ ۵۷/-
مؤطا امام مالکؒ عکسی 〃 〃 ۔۔۔ ۲۱/-
مؤطا امام محمدؒ 〃 〃 ۔۔۔ ۴۲/-
نسائی شریف 〃 〃 ۔۔۔ ۶۶/-

بدعت کے رد میں

بدعت کیا ہے؟ (چار قیمتی مقالے) مجلد ۔۔۔ ۶/۵۰
رد بدعت اردو ۔ مجدد الف ثانیؒ ۔۔۔ ۲/-
آنکھوں کی ٹھنڈک ۔ سرفراز خاں صفدر ۔۔۔ ۸/-
آداب زیارت قبور ۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ۔۔۔ -/۸۰
تنبیہ الغافلین ۔۔۔ -/۷۵
تحریک دعا بیت پر ایک نظر ۔ ابو الوفا ثناء اللہؒ ۔۔۔ -/۷۵

تعزیہ علماء اسلام کی نظر میں (افادات شاہ ولی اللہؒ) -/٥٠

فلاح ملت ۔ محمد شعبان کشمیری ٥/-

ہمارا دین حق ۔ مولانا ریحان الحق ٣/-

دیوبند سے بریلی تک ٣/٥٠

بلاغ المبین اردو مع سوانح ۔ شاہ ولی اللہؒ ٦/٥٠

بریلوی فتنہ کا نیا روپ (بجواب زلزلہ) ٦/-

زلزلہ در زلزلہ (" ") ٦/٥٠

زلزلہ پر زلزلہ (" ") -/٥٠

انکشاف (" ") ٦/-

اگر کوئی صاحب اصلی کتاب زلزلہ دیکھنا چاہیں تو وہ بھی ہم سے طلب کر سکتے ہیں ۔ قیمت مع مجلد ٦/-

چراغ السنۃ (رد بدعت میں ایک اچھی کتاب) ٤/-

اصلاح الرسوم (مولانا تھانویؒ) ٢/٥٠

تذکرہ محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ (مترجم صفی الرحمن اعظمی) ٤/٥٠

چالیس بدعتیں ۔ محمد مطیع الحق ١/٢٠

شب برات کی حقیقت ۔ صوفی اسمٰعیل ١/٥٠

براہین قاطعہ اردو ۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ١٢/-

سنت و بدعت ۔ مع مسئلہ علم غیب ، سایۂ رسولؐ وغیرہ ١/٥٠

تقویۃ الایمان مجلد ۔ حضرت اسمٰعیل شہیدؒ ١٢/-

شرک اور بدعت " " ١/٤٠

شریعت یا جہالت ۔ محمد یاسین حقانی ١٢/-

فاتحہ کا صحیح طریقہ ۔ قاضی سید اسمٰعیل ٢/٥٠

مرزائیوں کا بہتان و افتراء -/٥٠

آئینۂ بدعات ۔ مجدد الف ثانیؒ ١/٤٠

اغلاط العوام اضافہ شدہ ۔ مولانا تھانویؒ ٢/-

اعلیٰ حضرت کا دین ۔ مولانا مطیع الحق ٢/٥٠

تصوف کے موضوع پر

التکشف فی مہمات التصوف اردو ۔ مولانا تھانویؒ مجلد ٣٠/-

التشرف فی احادیث التصوف اردو " " " ٢٠/-

عبقات اردو ۔ مولانا اسمٰعیل شہید [illegible]

روح تصوف ۔ مولانا تھانویؒ ۔ مجلد ٥/-

تصوف کیا ہے؟ مولانا منظور نعمانی ٥/-

شریعت اور تصوف ۔ مولانا مسیح اللہ ٨/-

تصوف کی حقیقت اور اسکی تاریخ ۔ شاہ ولی اللہؒ ٦/-

مقامات تصوف ۔ مولانا اسمٰعیل سنبھلی بلا جلد ٨/-

قرآن اور تصوف ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ۔ بلا جلد ٨/٧٥

مکتوبات تصوف جلد اول ۔ مولانا زکریا صاحب ۔ مجلد ٨/-

مکتوبات شیخ (مکتوبات تصوف کا حصہ دوم) " ٤/-

تربیت السالک مکمل ۔ مولانا تھانویؒ مجلد ٤٠/-

صحائف معرفت ۔ شاہ عبد الرزاقؒ " ٨/-

صحیفۂ ابرار ۔ تصوف اور سلوک پر شاہ عبد الرزاق کی عمدہ کتاب بمعہ سوانح اور حالات مجلد ٢٥/-

تزکیۂ نفس ۔ مولانا امین احسن اصلاحی مجلد ٨/٥٠

اصلاح و تبلیغ

مواعظ مولانا مسیح اللہ ہر دو حصہ (چھ وعظ) ٨/-

مواعظ حسنہ ۔ مولانا تھانویؒ ۔ مجلد ١٢/-

وعظ بے نظیر ٣/٥٠

اکرم المواعظ ٤/-

گنجینۂ جواہرات (مجموعۂ مواعظ) مجلد ٢٠/-

ذکر الٰہی ۔ مولانا مسیح اللہ ٢/-

ذکر النبیؐ " " ٢/-

اصول تبلیغ " " ٢/-

مجموعۂ تالیفات مصلح الامت ۔ مولانا وصی اللہؒ مجلد ١٨/-

افادات الوصیہ اردو " " " ١٤/-

اسوۃ الصالحین " " " ١٢/-

ہفت اختر ۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ ١٠/-

تربیت اولاد " بلا جلد ١/-

تبلیغی نصاب ۔ مولانا زکریا صاحب مجلد ١٥/-

فضائل صدقات " " ١٣/-

فضائل حج " " [illegible]

فضائل ذکر۔ مولانا زکریا صاحب ۳/۲۵
فضائل نماز 〃 〃 〃 ۱/۵۰
تبلیغ کی حکمت۔ ایم سلیم عبدالحی ۱/-
حضرت مسیح کے مواعظ۔ سید حامد علی ۱/۲۰
فضائل قرآن مجید۔ مولانا زکریا صاحب ۱/۵۰
فضائل درود شریف 〃 〃 ۲/۲۵
〃 رمضان 〃 〃 ۱/-
〃 تبلیغ 〃 〃 -/۶۰
ارکان اسلام۔ مولانا احتشام الحسن ۲/۵۰
خدا کی جنت۔ مولانا عاشق الٰہی ۱/۵۰
جنت کی کنجی۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ ۶/-
دوزخ کا کھٹکا 〃 〃 ۳/-
مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ مولانا عاشق الٰہی ۶/-
نجات المسلمین۔ مفتی شفیع صاحب -/۹۰
گناہ بے لذت 〃 〃 〃 ۱/۵۰
شیطان کا فریب 〃 〃 〃 -/۷۵
نماز کی برکتیں۔ مولوی حکیم انیس الحق -/۳۰
پردہ کی باتیں۔ مولانا محمد سعید دہلوی ۲/۵۰
درس تبلیغ۔ مولانا مقبول احمد سیوہاروی ۳/-
مصباح التبلیغ۔ محمد علاء الدین مقتاحی ۱/۲۵
نماز کے فضائل۔ مولانا امام الدین ۱/۵۰
اختلاف الائمہ۔ مولانا محمد زکریا صاحب ۲/۵۰

ادبیات (نظم و نثر)

مقامات اقبال۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۰/-
پیام اقبال۔ عبدالرحمن طارق ۱۰/-
ولی سے اقبال تک۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ۹/-
شکوہ جواب شکوہ۔ ڈاکٹر اقبال -/۶۰
شرح بال جبریل۔ پروفیسر سلیم چشتی ۱۴/-
شرح ضرب کلیم 〃 〃 ۱۲/-
〃 رموز بے خودی 〃 〃 ۱۵/-

شرح ارمغان حجاز۔ پروفیسر سلیم چشتی مجلد ۸/-
شرح جاوید نامہ مع اصل 〃 〃 مکمل در ۲ جلد ۱۰/-
مطالب بانگ درا۔ غلام رسول مہر 〃 ۱۰/-
دور حاضر اور غزل گوئی۔ عندلیب شادانی 〃 ۱۲/۵۰
صحیفۂ ادب۔ مرتبہ مجلس تعلیمی علی گڑھ ۶/-
تاریخ ادب اردو۔ ڈاکٹر عبادت اللہ اور ڈاکٹر نذیر ۶/-
مقدمۂ شعر و شاعری۔ حالی مجلد ۴/-
تلخیاں (مجموعۂ کلام۔ ساحر لدھیانوی) 〃 ۳/۷۵
زاد راہ۔ منشی پریم چند (مجموعۂ مضامین) 〃 ۶/۵۰
شعلۂ طور۔ مجموعۂ کلام۔ جگر مرادآبادی 〃 ۷/-
آتش گل 〃 〃 〃 〃 ۵/-
دیوان حضرت علیؓ۔ صرف عربی ۴/۵۰
〃 〃 〃 اردو مع عربی ۹/-
آدھی کتاب۔ م نسیم (مجموعۂ مضامین) ۱/-
کلیات اکبر (مجموعۂ کلام اکبر الہ آبادی) مکمل در ۲ جلد ۱۶/-
کلیات فیض 〃 فیض احمد فیض ۸/-
کلیات شکیل 〃 شکیل بدایونی ۸/-
کلیات اختر شیرانی (مجموعۂ کلام) اختر شیرانی ۶/-
نقش و نگار 〃 جوش ملیح آبادی ۷/-
صہبائے خیال 〃 تسلیم عاصم بریلوی ۶/-
نیم باز 〃 پروفیسر عنوان چشتی ۴/-
لفظوں کا سفر 〃 جمیل احمد آبادی ۶/-
متاع کلیم 〃 کلیم احمد آبادی ۴/-
عرفان عارف 〃 مولانا قاری محمد طیب صاحب ۶/۵۰
معمور یزداں کا شہر 〃 سہیل عظیم آبادی
دامن باغباں۔ مختلف شعراء کا انتخاب کلام ۵/-
آزادی کا ادب (مقالے، نظمیں، افسانے اور ڈرامے) ۴/-
کینسر وارڈ۔ مکمل ہر دو جلد (ایک بہترین ناول) ۷/-
گلدستۂ مضامین و انشاء پردازی۔ ڈاکٹر محمد عارف ۵/۹۵
غزلیں۔ مجموعۂ کلام۔ اثر احسن لکھنوی ۵/-
زبان۔ مختلف مضامین۔ اظہر علی فاروقی ۴/-

تاریخ

تاریخ اسلام مکمل در ۳ جلد مجلد - مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی — ۶۰/-

تاریخ اسلام مکمل در ۴ جلد غیر مجلد مولانا شاہ معین الدین احمد — ۵۳/۵۰

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل در ۳ جلد مولانا ابو الحسن علی ندوی — ۳۴/-

ہماری بادشاہی - مولانا عبد السلام ندوی — ۶/۲۵

اسلام اور عربی تمدن - شاہ معین الدین احمد — ۱۳/۷۵

مختصر تاریخ ہند - سید ابو ظفر ندوی — ۶/۲۵

ہندوستان کی کہانی - عبد اللہ فرید آبادی ندوی — ۳/۲۵

ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں اول — ۷/۵۰

〃 〃 〃 دوم — ۶/۲۵

کشمیر سلاطین کے عہد میں - پروفیسر محب الحسن — ۱۵/-

اسلام میں غلامی کی حقیقت - مولانا سعید احمد اکبر آبادی
مجلد ۱۰/- بلا جلد — ۷/-

اسلامی ہند کی عظمت رفتہ - قاضی اطہر مبارکپوری - مجلد ریگزین — ۱۲/۷۵

ایشیا میں آخری نو آبادیات مجلد - امداد احمد آزاد — ۶/۲۵

تاریخ ہند پر نئی روشنی - خورشید احمد فارق — ۳/۷۵

تاریخ ردہ (حضرت ابو بکرؓ کا زکوٰۃ نہ دینے والوں سے اعلان جہاد - خورشید فارق — ۵/-

تاریخ اسلام پر ایک نظر - مولوی عبد الرحمن خاں مجلد — ۱۳/۵۰

اشاعت اسلام (اسلام کیونکر پھیلا؟) مولانا حبیب الرحمن صاحب رح — ۷/۵۰

تاریخ مشائخ چشت - مجلد - مولانا زکریا — ۱۲/-

لا مذہبی دور کا تاریخی پس منظر - مولانا تقی امینی — ۵/-

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات - خلیق احمد — ۱۶/۵۰

ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں قاضی اطہر مبارکپوری — ۸/۷۵

عرب و ہند عہد رسالت ﷺ میں - قاضی اطہر مبارکپوری — ۵/-

خلافت اسلام - مولانا سعید احمد ایم - اے — ۱۲/۵۰

عہد مغلیہ - مسلمان اور ہندو مورخین کی نظر میں - سید صباح الدین — ۱۴/۲۰

باندوں کی دنیا - یوسف حسین خاں — ۱۲/۲۵

ہندوستان عربوں کی نظر میں - در ۲ حصہ مکمل - مولانا مسعود علی ندوی — ۲۵/-

ہندوستان کے سلاطین - علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر سید صباح الدین — ۷/۸۰

اسلامی معیاری حکومت - مولانا امام الدین — ۳/۲۵

تاریخ دار العلوم دیوبند مولانا قاری محمد طیب — ۴/۵۰

تاریخ اسلام کے ناقابل فراموش واقعات مولانا عبد الرؤف — ۱۵/-

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات — ۹/۵۰

ارض القرآن مکمل در ۲ حصہ - سید سلیمان ندویؒ — ۱۶/۹۰

حدیث دفاع - جنرل اکبر خاں - مجلد — ۱۲/-

سفر نامہ ابن بطوطہ مجلد - مولوی عبد الرحمن خاں — ۷/۲۵

سکھ اور جنگ آزادی - علامہ انور صابری مجلد — ۳/-

عہد نبوی کے میدان جنگ - ڈاکٹر حمید اللہ — ۲/۵۰

اورنگ زیب عالمگیرؒ ہندوؤں کی نظر میں - ایوب خاں — ۵/-

خلافت معاویہ و یزید (تاریخ کربلا) محمود عباسی — ۸/-

دین الٰہی کا تاریخی پس منظر - (اکبر کے نئے دین الٰہی کی تفصیلی تاریخ - مجلد — ۱۰/۵۰

سفر مصر و حجاز - مولانا منت اللہ — ۲/۵۰

مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر انسانی دنیا پر - مولانا ابو الحسن علی ندوی — ۱۲/-

جائزہ تراجم قرآنی (پچاس زبانوں کے قرآنی تراجم کا تحقیقی جائزہ — مجلد — ۶/-

اسرائیل کے متعلق قرآنی پیشین گوئیاں — ۱/۵۰

اسرائیل کتاب و سنت کی روشنی میں — ۱/۵۰

تاریخ گجرات - مولانا سید ابو ظفر — ۱۲/۵۰

سرکشی ضلع بجنور - سر سید احمد خاں (۱۸۵۷ء کی تاریخ کے چند ورق - مجلد — ۸/۵۰

شہنشاہیت (جدید سرمایہ داری کی تاریخ) مجلد — ۲/۵۰
مسلمانوں کی ذرہ بندیوں کا افسانہ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ مجلد — ۳/-
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔ مجلد — ۵/-
ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں۔ مولانا ابوالحسن علی مجلد — ۵/-
ہندوستان اسلامی عہد میں۔ مجلد — ۱۲/-
تاریخ دیوبند (اضافہ شدہ) سید محبوب رضوی۔ مجلد — ۱۰/-
طوفان سے ساحل تک (ایک نومسلم کی سرگزشت) ” — ۴/-
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ مولانا ابوالحسن — ۱۴/-

سیر، سوانح، اور تذکرے

سیرت طیبہ۔ مولانا قاضی زین العابدین۔ مجلد — ۶/۵۰
حیات طیبہ۔ ” ابو سلیم عبدالحی — ۴/۸۰
سیرۃ النبی۔ مکمل در ۶ جلد۔ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی۔ مجلد رنگین — ۱۵۷/-
پیغمبر عالم۔ مولانا عبدالصمد رحمانی۔ مجلد — ۱۱/-
رسول اللہ۔ مولانا احمد سعید دہلوی ” — ۳/-
تاجدار مدینہ۔ نسیم احمد علوی — ۱/۲۵
رحمۃ للعالمین ایک نظر میں۔ ” ” — ۱/-
رحمت عالم۔ سید سلیمان ندوی — ۳/-
سیدہ کا لال۔ راشد الخیری — ۳/۲۵
فاطمہ کا چاند۔ مولانا عبدالصمد رحمانی — ۴/۵۰
پیارے حضور۔ امۃ اللہ تسنیم (مبتدیوں کے لئے) — ۳/۵۰
رسول عربی۔ مولوی فرید الوحیدی (”) — ۳/۵۰
نبی عربی۔ مولانا قاضی زین العابدین — ۳/۱۲
وفات النبی۔ مولانا احمد سعید دہلوی۔ — ۳/-
رحمۃ للعالمین۔ مختصر (حاجی محمد عمر) کا غذ رف — -/۶۰
سیرت خاتم الانبیاء۔ مولانا مفتی محمد شفیع — ۳/۵۰
نشر الطیب۔ مولانا اشرف علی تھانوی — ۴/-
سیرت ختم المرسل۔ مولانا مودودی۔ — ۲/۵۰

رسول اکرم کی سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ۔ مجلد — ۱۴/-
شمائل ترمذی مع خصائل نبوی اردو مع عربی (صحابہ کی لکھی ہوئی سیرت) — ۱۵/-
سچے رسول کی سچی تعلیم۔ مولانا امام الدین۔ مجلد — ۲/۵۰
سیرت نبوی دعاؤں کے آئینہ میں۔ مولانا ابوالحسن علی — ۱/۲۵
رسول اللہ کے (۳۰) معجزات۔ مولانا احمد سعید دہلوی — ۲/۵۰
رسول اللہ کی باتیں۔ مولانا احمد سعید دہلوی۔ مجلد — ۳/۵۰
سیرت پاک۔ بشیر طارق۔ ” ” ” — ۳/-
حیات امام بخاری۔ مولوی کفیل احمد — ۲/-
حضرت ابوبکر صدیق۔ مولانا امام الدین — ۳/-
حضرت ابوبکر۔ نسیم احمد علوی — -/۶۰
حضرت فاروق اعظم۔ مولانا عبدالشکور — ۱/۸۰
الفاروق عکسی۔ مولانا شبلی نعمانی۔ مجلد — ۹/-
الفاروق کلاں سائز غیر عکسی ” ” غیر مجلد — ۱۵/۲۵
حضرت علی مرتضیٰ۔ مولانا عبدالشکور — -/۶۵
حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ نسیم احمد علوی — -/۶۰
حضرت عثمان ” ” — -/۶۰
حضرت عثمان ذوالنورین۔ مولانا امام الدین — ۱/۵۰
حضرت ابوہریرہ۔ حالات و سوانح — ۱/-
حضرت معاذ بن جبل ” ” — ۱/-
حضرت خالد سیف اللہ ” ” — ۳/۵۰
حضرت فاطمہ زہرہ ” ” — ۱/۲۵
خدیجہ بی بی۔ مولانا مقبول سیوہاروی — ۱/-
عائشہ بی بی ” ” — ۱/۵۰
فاطمہ بی بی ” ” — ۱/-
حضرت بلال (مفصل حالات و سوانح) نسیم احمد علوی مجلد — ۲/-
حضرت بلال۔ مولانا امام الدین — ۱/۵۰
انصار۔ مختصر حالات و سوانح۔ — ۱/۵۰
حضرت انس ” ” — -/۴۰
حضرت ابو عبیدہ ” ” — -/۴۵
حضرت ابو ایوب انصاری (میزبان رسول) — ۱/۲۰

- امت مسلمہ کی مائیںؓ (حالات وسوانح) مجلد ۲/۲۵
- حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ - مولانا امام الدین ۱/۲۵
- حضرت امام حسینؓ - حالات وسوانح ۱/۲۵
- حضرت ابوذر غفاریؓ " " ۱/-
- حضرت سلمان فارسیؓ " " ۱/-
- سیرت حضرت معاویہؓ - مکمل ومفصل حالات - مجلد ۸/-
- رسول اللہؐ کی صاحبزادیاںؓ (حالات وسوانح) " ۱/۷۵
- حضرت موسیٰؑ " " ۱/۲۵
- حضرت عیسیٰؑ " " ۱/۲۵
- تذکرہ ائمہ اربعہ (چاروں امام کے مکمل حالات وسوانح) مجلد ۱۰/-
- سیرۃ النعمان - یعنی امام ابوحنیفہ کی سوانح، علامہ شبلی نعمانی ۵/-
- امام اعظم ابوحنیفہؒ - مکمل حالات وسوانح (مفتی عزیز الرحمن) مجلد ۹/-
- تذکرہ مجدد الف ثانیؒ مولانا منظور نعمانی ۴/-
- تذکرہ شاہ علم اللہؒ ۶/-
- تذکرۃ المصنفین - مولانا حبیب الرحمن ۴/-
- تذکرۃ المحدثین ۱۳/۷۵
- احوال المصنفین - مولانا محمد حنیف ۲۰/-
- طارق ابن زیادؒ (اسلام کا پہلا جنرل فاتح اسپین) ۱/۲۵
- فاتح سندھ محمد بن قاسمؒ (ہند پر حملہ کرنے والا پہلا مسلم جرنیل) ۱/۲۵
- نور جہاں (ایک ذہین ملکہ کی داستان) ۱/۲۰
- جہانگیر (انصاف پسند بادشاہ کے حالات) ۱/۲۰
- حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ ۱/۲۵
- مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ان کے ناقد (مولانا سعید احمد - ایم - اے) ۶/-
- ٹیپو سلطان (جسکا نام ہی بہادری کی سند ہے) ۱/۲۵
- شیر شاہ سوری (انصاف و خدمت خلق کے عاشق کی داستان) ۱/۲۵
- زرتشت (ایک مصلح کی داستان وسوانح) ۱/۲۵
- تذکرہ علاء الدین صابر کلیریؒ (مفتی عزیز الرحمن) ۳/-
- مخدوم صابر کلیری - شبیر حسن چشتی - مجلد ۳/۵۰
- تذکرہ مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی - " ۴/۵۰
- تذکرہ مولانا محمد علی مونگھیریؒ - ۱۰/۵۰
- مولانا محمد احسن نانوتویؒ (مطبوعہ پاکستان) مجلد ۸/-
- ولی کامل (سوانح مولانا زکریا) مفتی عزیز الرحمن " ۶/۵۰
- صدر یار جنگ - مولانا حبیب الرحمن جہانگیر آبادی کے حالات وسوانح مجلد ۱۲/-
- اسیر مالٹا - مولانا حسین احمد مدنیؒ کے حالات تذکرہ ۶/۵۰

لغت

- فیروز اللغات - اردو لغت - پاکٹ سائز مجلد ۴/۵۰
- " " کارڈ سائز " ۱۲/-
- نفائس اللغات " کتابی سائز " ۸/۵۰
- جامع اردو لغات " پاکٹ سائز " ۴/-
- لغات کشوری " کلاں سائز عمدہ مجلد ۲۲/۵۰
- کریم اللغات - فارسی اردو لغت ۲۶×۲۰ عمدہ مجلد ۶/-
- ہندی اردو لغت - مرتبہ امام الدین - مجلد ۶/-
- اردو ہندی لغت " " ۶/۵۰
- القاموس الجدید - اردو سے عربی " ۱۸/-
- " عربی سے اردو " ۱۵/-
- لغات القرآن جلد اول (مختصر قرآن کی لغت) ۳/۵۰
- قاموس القرآن - عربی سے اردو مجلد ۱۵/-
- اردو عربی ڈکشنری - مولانا عبدالحفیظ بلیاوی - مجلد ۹/-
- اسٹینڈرڈ ڈکشنری - اردو سے انگریزی - عبدالحق ۴/-
- ٹونٹیتھ سنچری - انگلش سے انگلش ۲۰/-

عملیات وتعویذات

- پریشانیوں کا شرعی علاج (مشاہیر امت کے مجربات) ۲/۵۰
- نافع الخلائق - مقبول و مستند کتاب (تعویذات عملیات) ۱۲/-
- کنز الحسین " ۴/-
- نقش سلیمانی مکمل مجلد " ۱۰/-

گنجینۂ اسرار ۔ مولانا انورشاہ کشمیریؒ مجلد ۴/-
اسمائے حسنیٰ کی برکات ۔ مولانا انظر شاہ ″ ۴/-
مفتاح عملیات (یعنی عملیات کی کنجی) ″ ۸/۵۰

طب اردو

دیہاتی معالج ۔ مرتبہ ہمدرد دواخانہ دہلی عکسی مکمل ہر حصہ ۱/-
ہمدرد مطب ″ ″ ″ ″ ۴/۵۰
قرابادین ہمدرد ″ ″ ″ ۱۲/-
ہمدرد فارماکوپیا ″ ″ ۴/۵۰
اکسیری کشتہ جات اردو ۔ ہمہ اقسام کے کشتے بنانے کی ترکیبیں ۳/-
علاج الغربا ۶/-
قرابادین احسانی ۳/۲۵
قرابادین اعظم اردو ۔ کلاں سائز ۔ بلا جلد ۳۰/-
مفید الاجسام ۲/۵۰
تجربات بشیر ۲/۵۰
مجربات اکبری ۳/۲۵
میزان الطب ۴/-
طب نبویؐ ۳/۵۰
میٹریا میڈیکا اردو ۲۵/-

تفاسیر قرآن پاک

تفسیر حقانی اردو مع عربی مکمل مجلد ۔ مولانا عبدالحق حقانیؒ ۱۱۰/-
تفسیر بیان القرآن ″ ″ ″ تجلی سائز مولانا تھانویؒ ۱۳۰/-
″ ″ ″ ″ ″ ″ کلاں سائز غیر عکسی ۱۳۵/-
″ ″ ″ ″ (″) عکسی باجری ۱۶۰/-
تفسیر بیان السبحان ″ ″ ″ (″) ۲۵۰/-
تفسیر قادری ۔ ترجمہ تفسیر حسینی اردو مع عربی مکمل مجلد ۶۰/-
تفسیر مظہری خالص عربی ۔ مکمل در دس جلد غیر مجلد ۱۰۲/۵۰
تفسیر رشیدی ۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ۲/۵۰
تفسیر سورۂ فاتحہ ۔ مولوی ابوالکلام قاسمی ۱/-

فتاویٰ

فتاویٰ دارالعلوم مکمل قدیم (مختلف مفتی) ۶۰/-
″ عبدالحی اردو مکمل مجلد ۔ مولانا عبدالحی لکھنوی ۲۰/-
″ رشیدیہ ۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ۱۸/-
″ سعیدیہ ۔ مولانا احمد علی سعید (مدلل فتاویٰ) ۶/-
″ دارالعلوم جدید ۔ مفتی عزیز الرحمن عثمانی جلد اول ۱۰/-
″ ″ ″ ″ جلد سوم ۱۰/-
″ ″ ″ ″ ″ چہارم ۱۲/۵۰
″ ″ ″ ″ ″ پنجم ۱۵/-
″ ″ ″ ″ ″ ششم ۱۷/-
″ ″ ″ ″ ″ ہشتم ۱۵/-
″ ″ ″ ″ ″ نہم ۲۰/-

۲ اور ساتویں کا ایڈیشن ختم ہے

درسیات

منہاج العربیہ حصہ ۱ عربی ۱/-
″ ″ ″ ۲ ″ ۱/۲۵
″ ″ ″ ۳ ″ ۱/۵۰
″ ″ ″ ۴ ″ ۱/۷۵
″ ″ ″ ۵ ″ ۲/۲۵
عربی کا معلم اردو و عربی ۔ حصہ ۱ ۲/-
″ ″ ″ ۲ ۲/-
منثورات عربی ″ ۳ ۶/-
تمرین الصرف ۴ ۲/۲۵
تمرین النحو عربی ۵ ۲/۵۰
مختارات عربی ″ ۱ ۶/۵۰
″ ″ ۲ ۷/۵۰
القراءۃ الواضحہ حصہ ۱ عربی ۔ مولانا وحید الزماں ۲/۷۵
″ ″ ″ ۲ ″ ۳/۵۰
″ ″ ″ ۳ ″ ۳/۵۰
کتاب الصرف عربی ۳/۵۰

کتاب	قیمت
کتاب النحو۔ عربی	۲/۵۰
عربی بول چال اردو مع عربی مکمل در ۲ حصہ	
معلم الانشاء حصہ ۱	۲/۷۵
" " ۲	۴/۵۰
" " ۳	۳/۵۰
قصص النبیین عربی حصہ ۱	۱/۰
" " " ۲	۱/-
" " " ۳	۲/۵۰
القراءۃ الراشدہ ۱	۱/۸۰
" ۲	۲/۲۵
الادب العربی۔ محمد رابع الحسنی	۶/-
رحمانی قاعدہ اردو۔ مولوی محفوظ الرحمن نامی	-/۶۰
" " عربی " " " "	-/۶۰
مفتاح القرآن " " " حصہ ۱	-/۷۵
" " " " ۲	۱/۵۰
" " " " ۳	
" " " " ۴	۲/۲۵
" " " " ۵	۲/۵۰
معلم القرآن	۱/۲۵
تعلیم الاسلام۔ مفتی کفایت اللہ حصہ ۱	-/۴۰
" " " ۲	-/۵۵
" " " ۳	۱/۱۵
" " " ۴	۱/۴۰
رسالہ دینیات اردو ۱	-/۴۰
" " ۲	-/۹۰
" " ۳	-/۹۰
" " ۴	۱/۱۰
" " ۵	۱/۲۵

کتاب	قیمت
اسلامی خطوط نویسی عکسی (بچوں اور بچیوں کے لئے مفید، ہر مدرسہ کے لئے قابل نصاب)	۱/۲۰
گلستان فارسی عکسی	۵/۵۰
گلستان مترجم عکسی فارسی مع اردو ترجمہ	۶/-
بوستاں فارسی عکسی	۵/۵۰
بوستاں مترجم عکسی فارسی مع اردو ترجمہ	۶/-
احسن المسائل۔ ترجمہ کنز الدقائق اردو	۱۳/۵۰
انوار العلوم شرح اردو سلم العلوم	۷/۵۰
ایضاح المطالب شرح اردو کافیہ ابن حاجب	۹/-
افاضات شرح اردو مقامات مکمل در ۲ جلد	۲۸/-
بہارستان شرح اردو گلستاں	۱۳/-
مہر تاباں۔ شرح اردو بوستاں	۱۵/-
نور الفتاح شرح اردو مع عربی نور الایضاح	۱۵/-
توضیحات شرح اردو سبعہ معلقات	۷/۵۰
شرح تہذیب عربی	۴/۵۰
مصباح التہذیب عکسی شرح اردو شرح تہذیب	۱۲/-
انوار العلوم شرح اردو سلم العلوم	۷/۵۰
ضیاء النجوم شرح عربی سلم العلوم	۹/-
فیوض عثمانی۔ شرح اردو فصول اکبری	۱۲/-
مصباح المنیر شرح اردو نحو میر	۷/۵۰
اسعاد النحو شرح اردو نحو میر	۴/-

پورے ملک میں مکتبہ تجلی کو اپنی خوش معاملگی اور معیاری کتابوں کا بہت بڑا میل رکھنے کے سلسلہ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے —
آپ بھی کتابیں منگواتے وقت مکتبہ تجلی کو یاد رکھیں — منیجر — عمر فاروق عثمانی

مکتبہ تجلی دیوبند۔ ضلع سہارنپور۔ یو۔ پی (انڈیا)